



spotweom.f
ch Forum



عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں

سلمیٰ اعوان

ترتیب

- 1- فتوح ربانی شام اور دنیا کے عرب کی طاقتور،
توانا، انقلابی، سیاسی اور روحانی آواز
- 2- مومن امید شام کی حساس، منفرد اور نئی سوچ کی حامل
شاعرہ، کہانی کار، ترجمہ نگار
- 3- بورس پاسترک روس کا مایہ ناز نوبل ایوارڈ یافتہ ناول نگار،
شاعر، موسیقار اور ترجمہ نگار
- 4- الیگزینڈر سرگیوویچ پشکن روس کا قومی شاعر
- 5- لیونا لسانی اور صوفیہ لسانی روسی ادب کا دیو
- 6- دوستوویسکی اور اینا دوستوویسکی روس کا عظیم ناول نگار
- 7- مولانا جلال الدین رومی ترکی کا ہیرا
- 8- پینس ایمرے ترکوں کا محبوب شاعر
- 9- رابندر ناتھ ٹیگور برصغیر کا نوبل انعام یافتہ عظیم شاعر،
موسیقار، ڈرامہ رائٹر
- 10- کرونیترن، ابی سکارا سری لنکا کا خوبصورت شاعر،
موسیقار، پراڈکٹر
- 11- سعدی یوسف عراق کا مایہ ناز انقلابی شاعر
- 12- ابونواس عراق کا عظیم کلاسیکل شاعر
- 13- جرژو ڈنیل ایک عظیم کھاری، دلیر سیاح اور بانی عراق

پانیوں پر لکھے ہوئے نام والا شاعر روم میں

اٹلی کا پہلا نوبل انعام یافتہ شاعر، مایہ ناز

نثر اور تنقید نگار

فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر

14- جان کیٹس

15- کوزیو کاروسی

16- محمود درویش

آپ کی توجہ کی طالب

بات ماضی بعید کی ہو، ماضی کی ہو یا حال کی۔ یہ تو طے ہے کہ زمانوں سے کہیں سینکڑوں، کہیں ہزاروں اور اب لاکھوں کو چھوٹی دنیا بھر میں بولی اور پڑھی لکھی جانے والی زبانوں میں کتنے چھوٹے بڑے تخلیق کار پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے ماحول، اپنی ذات کے اندر اور باہر کے احساسات و جذبات اور تجربات کی کسی نہ کسی رنگ میں عکاسی کی۔

فطرت تخلیقی جوہر کی بانٹ میں ہمیشہ سے بڑی فیاض رہی ہے۔ انسان کی پیدائش کے وقت سے وہ انسان کو اپنی اس دین، اس عنایت سے نوازتی رہی ہے۔ اس میں زمانوں اور ان میں جینے والے معاشروں کے متمدن، ترقی یافتہ یا پھر غیر متمدن، غیر ترقی یافتہ، جاہل اور وحشی ہونے کی کوئی تخصیص نہیں۔ صدیوں سے ہیرے کانوں سے نکلتے رہے ہیں اور صدیوں سے ہی ان کی تراش خراش اور کانٹ چھانٹ کا عمل اُس اوپر والے کی مرضی و منشا اور مخلوق کے کچھ اپنے رنگ ڈھنگ سے جاری و ساری ہے۔ تاریخ ایسے کرداروں سے بھری پڑی ہے۔

اب ایسے میں مجھ جیسی پرتو وہی مثال صادق آتی ہے ماکہ کیلپڈی اور کیلپڈی کا شور بہ۔ کیا میں اور کیا میری لکھنے کی اوقات اور کاوش۔ پر کرتی کیا۔ چھوٹا سا قلم تو اُس نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور ساتھ تھوڑے سے سفر بھی مقدر کر دیئے۔ جب اُن اجنبی زمینوں پر گئی تو جانی کہ کیسے کیسے لعل و کوہراں دھرتیوں نے ماضی قریب کے زمانوں میں پیدا کئے۔ انہیں پروان چڑھایا۔ دنیا کو اُن کی خوشبو سے مہکایا اور پھر کہیں اپنے اندر جذب کیا یا پھر کسی دوسری مٹی کو یہ اعزاز بخش دیا کہ وہ انہیں سنبھالیں۔

ہاں یہ بھی آپ سے کہنا ہے کہ میں ماضی کے چکروں میں نہیں پڑی سوائے دو تین

کے۔ بھئی اتنا سا بندہ اور وہ اس بحرِ بیکراں میں کیسے کو پڑے؟ جان سے ہی جائے گا۔ بس اپنے وقت کے قریب قریب ہی رہی۔

اب یہ جن اور دیو سامنے ہیں۔ سچی بات ہے پنجابی زبان کی وہ کہات یا آ رہی ہے۔ پلے نہ سیر آتے گاوندی دا سنگھ پاٹا تا ہم اتنا سا کہتا ہے کہ میں نے ان قد آور شخصیات کی بس ایک ہلکی سی جھلک ہی آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ اُن کے فن کے دریاؤں میں سے بس کنارے پر کھڑے کھڑے چلو بھر پانی نکال کر ہی اپنے اوپر ڈالا ہے۔ اللہ کرے میری یہ کاوش آپ کو پسند آ جائے۔ تب سمجھوں گی کہ محنت وصول ہو گئی۔

سلمیٰ اعوان

www.salmaawan.com

salma.awan@hotmail.com

اُن اجنبی سرزمینوں کے نام جنہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنے
لعل و گوہر سے میرا تعارف کروایا۔

نزار قبانی

شام، دنیاے عرب کی طاقتور، توانا، انقلابی اور رومانوی آواز

- شام، دنیائے عرب، بیسویں صدی اور عربی ادب کی ایک بے حد توانا، انقلابی، سیاسی اور رومانوی آواز زار قبائی۔
- اس کی شاعری کے پہلے مجموعے قاتلِ بی اسراء نے شام میں زلزلے جیسی کیفیت پیدا کر دی تھی۔
- اسے میرے غم زدہ وطن بس ایک پس میں تو نے محبت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ میں خنجر تھما دیا ہے۔
- وہشت گردی پر اس کی شہرہ آفاق سیاسی نظم دراصل اُن ملکوں کے منہ پر طمانچہ ہے جو وہشت گردی کی آڑ میں ملکوں پر تسلط جماتے اور محصوم لوگوں کو خون میں نہلاتے ہیں۔
- شاعری میں اس کی چونتیس کتابوں کے علاوہ نثر میں بھی اس کا بڑا اثوس کام ہے۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں مطلق العنانی ہے
 جہاں دانشوروں کو تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے
 جہاں لکھاری بے دین، منکر اور مرتد سمجھے جاتے ہیں
 جہاں کتابیں جلائی جاتی ہیں
 جہاں سوال کرنا گناہ ہے
 جہاں معاشروں میں رواداری اور برداشت نہیں
 جہاں طاقت زبان اور سوچ پر پہرے لگاتی ہے
 مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے بچوں کو یہ سکھاؤں
 خدا نے انسانی روح اور جسم کو قتل سے منع کیا ہے
 کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمان کو ڈرائے دھمکائے اور قتل کرے
 کیا آپ مجھے اجازت دیں گے
 کہ میں اپنے بچوں کو بتاؤں
 خدا عظیم ہے اور اس کے معیار مختلف ہیں
 ان سے
 جو مذہب کے تاجر ہیں
 اور خدا کی جواب طلبی میں مہربانی ہے
 اور وہ بہت رحیم اور کریم ہے

نزار قبانی

نزار قبانی سے میری پہلی شناسائی قاہرہ کی رمیس سٹریٹ کی ایک بک شاپ پر ہوئی۔ باہر ہواؤں میں بہت تیزی اور خنکی تھی۔ قاہرہ کا آسمان بادلوں سے ڈھکا پڑا تھا اور اندر میں کتابوں کو دیکھنے اور ان کی پھولا پھرولی میں مگن تھی۔ جب میں نے باہر سے کتابوں کے بنڈل اندر آتے دیکھے۔

یہ نجیب محفوظ کی ”ثرثہ فوق انیل“ اور ”قالت بی السراء“ نزار قبانی کی تھیں۔ اول الذکر نوبل انعام یافتہ نثر کی کتاب اور موثر الذکر شاعری کا مجموعہ تھی۔ کتاب ہاتھوں میں لی تو مالک جس نے مجھے پاکستانی جان کر خصوصی شفقت کا برتاؤ کیا تھا نے اس پر نظر پڑتے ہی لطف و محبت و سرشاری سے کہا۔

”ارے نزار قبانی کا مجموعہ کلام۔ کیا شاعر تھا۔ عرب دنیا کا عظیم انقلابی شاعر“ میں نے انگریزی ترجمے کا پوچھا۔ مالک نے ملازموں سے کہا۔ مگر ان کی جانچ

پڑتال کے بعد پتہ چلا کہ ختم ہو گیا ہے۔

بہر حال میری لگن اور کوشش کچھ کام نہ آئی۔ کتاب مجھے اسکندریہ سے بھی نہ ملی۔

تاہم نیٹ سے "The Brunette told me" شام کے اس شاعر سے میرا پہلا

تعارف روایات سے باغی اور رد مانوی شاعر کے طور پر ہوا۔

اب کوئی تین سال بعد جب شام کی سیاحت کیلئے آئی ہوں۔ پہلے ہی دن ٹیکسی

ڈرائیور نے اس کا گیت لگا کر اور مجھے بتا کر میری بھولی بھری یادوں کو تازہ کرنے کا سامان

کر دیا۔ واہ کیا حسین اتفاق ہے۔ گیت سے میں نے لطف اٹھایا تھا۔

میری خاتون میں دوسرے چاہنے والوں کے ساتھ

اپنا مقابلہ نہیں کرتا مگر

اگر دوسرا تمہیں بادل دیتا ہے

تو میں تمہیں بارش دوں گا

اگر وہ تمہیں لالین دیتا ہے

میں تمہیں چاند دوں گا

وہ تمہیں اگر شاخیں دیتا ہے

تو میں تمہیں درخت دوں گا

اگر وہ تمہیں بحری جہاز دیتا ہے

تو میں تمہیں سفروں پر لے جاؤں گا

شام کو زندہ نہیہ واپس جاتے اور آج صبح پرانے دمشق آتے ہوئے شاعر سے مزید

متعارف ہوئی۔

اس عظیم شاعر سے تفصیلی تعارف دمشق میں اس لڑکے کے توسط سے ہوا جو احمد

فاضل تھا اور مجھے دمشق سٹیڈیل Damascus Citadial کے میرے شہر لاہور کے
دلی دروازے جیسی مشابہت رکھنے والے گیارے میں ملا تھا۔ محبت اور خلوص سے بھرا ہوا
لڑکا۔ میں اس دیوہیکل سے گیارے کے ساتھ فٹ پاتھ پر کتابیں بکھیرے کھڑے بوڑھے
شامی کے پاس رک کر کتابوں کو دیکھنے لگی کہ ناگہاں بھاگ دوڑ، بیٹیوں کی آوازیں، شور و غل
نے حیرت زدہ کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور کیا۔

سامنے قدیم مگر شکستہ عمارتوں کی چھتوں پر لکھن میٹیا چورسپاہی کا کھیل جاری تھا۔
فائرنگ کا بڑا اکھلا ڈالا تباہ ہو رہا تھا۔ لوگ دائیں بائیں پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے۔ پہلے
میں نے وہیں بیٹھے رہنے سے چمٹنا چاہا۔ مگر وہاں پولیس کے کچھ لوگ آگئے تھے۔ ماحول
میں عجیب سی دہشت اور سنسنی پھیل گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ جہاں بیٹھی ہوں وہ جگہ تو
سیدھی نشانے پر ہے۔

”چلو اگر دیس میں بچت ہوگئی تو اب یہاں مرنے کے لیے آگئی ہوں۔“
اُنھ کر بھاگی۔ مگر فوراً ہی پلٹ آئی کہ لوگ گیارے کے اندر پناہ گزین ہو رہے
تھے۔ میں بھی ڈری سہی سی ان کے ساتھ وہیں گھس گئی۔ اور یہیں اُس بے حد پیارے سے
لڑکے سے ملاقات ہوئی جس کا نام احمد فاضل تھا۔ جو انگریزی بہت اچھی بول سکتا تھا۔ بینک
میں ملازمت کا ابھی آغاز ہی کیا تھا۔ اس واقعے بارے بتایا کہ چوری ڈکیتی کا کوئی کیس
ہوگا۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔

آج لکھتے ہوئے سوچ رہی ہوں۔ تب یہ کہیں معلوم تھا کہ یہاں چند ہی سالوں
بعد قیامتیں ٹوٹنے والی ہیں۔ یہ خوبصورت تہذیب و تمدن کا گہوارہ پر امن سالک بیرونی
طاقتوں کی ریشہ دوانیوں، اُن کے پروردہ غنڈوں پہلے القاعدہ بعد ازاں داعش کے ہاتھوں
پورپور زخمی ہونے والا ہے۔

اس وقت اس چھوٹے سے واقعے نے ماحول کو ہراساں اور خوف زدہ کر دیا تھا۔
 تھوڑی دیر بعد ہی جیسے فلم کے کسی سین کی طرح سب کچھ غائب ہو گیا۔ لوگ
 باگ اپنے اپنے راستوں پر ہولے۔ تاہم میرا احمد فاضل سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جس
 سے باتوں کا سلسلہ پھلتے پھلتے نزار قبانی تک چلا گیا۔ میری اُس سے محبت اور لگن دیکھ کر
 اس نے پیش کش کی وہ مجھے اپنے دوست جس نے نزار قبانی پر پی ایچ ڈی کی ہے ملانے لے
 جاسکتا ہے اگر میرے پاس وقت ہو تو۔ اس کا گھر یہیں پرانے دمشق میں ہی ہے۔
 جی چاہتا تھا لڑکے کی بلائیں لوں۔ لوبھی بیٹو موجیں ہو گئیں۔

”میرے بچے میں تو تمہاری حد درجہ شکر گزار ہوں گی۔“

اُس نے اسی وقت فون ملایا۔ میری خوش قسمتی کہ فوراً رابطہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر
 دونوں میں بات ہوتی رہی۔ پھر موبائل بند کرتے ہوئے وہ میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔
 ”ذکر یا محمد کبریت Kibrit اس وقت دمشق یونیورسٹی میں ہے۔ وہاں وہ
 پڑھتا ہے۔ تھوڑی دیر تک گھر پہنچے گا۔ اگر آپ پسند کریں تو یہ وقت ان کے اہل خانہ کے
 ساتھ گزار سکتی ہیں۔“

”ہائے کیسا بھاکوان دن ہے۔ کیسی خوبصورت پیشکش سے ابتدا ہوئی ہے۔ خدا
 بہت مہربان ہے اور یہ عنایت اس کا خاص الخصاص تحفہ ہے کہ کسی مقامی گھر جانا اور وہاں کی
 تہذیبی زندگی کی جھلکیاں دیکھنا بھی تو لکھنے لکھانے کے لئے اہم ہے۔“
 قدموں میں تیزی، دل میں خوشی و مسرت کا جل ترنگ اور نگاہوں میں دائیں
 بائیں اور ماحول کو دیکھنے اور جذب کرنے کی آتش شوق کا آلاؤ۔ چمکتی دھوپ بھرے آسمان کو
 دیکھتے ہوئے میں نے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا۔

تاہم جب میں راستے کے پر سحر منظروں پر اچھٹی سی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھتی

تھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرے دل کا حال بند بچرے میں قید کسی نئے نویلے پرندے کے پھڑپھڑانے جیسا ہی تھا کہ رومن کالموں اور امیہ مسجد کے پاس سے گزرتے بس ایک طائرانہ سی نظر ان پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جانا کیسا روح فرسا سا تھا۔ دل پاگل تو وہیں بیٹھنے اور ڈیرے ڈالنے کا خواہش مند تھا۔ پیاسی آنکھیں بھی ان کمال کے منظروں سے سیر ہونے کے لئے بیتاب تھیں۔ میں نے دونوں کی دلداری کی۔

احمد فاضل دو بار غلط گلیوں میں گھس گیا۔ اس کے سرعت سے پلٹنے اور میرے سستی سے قدم اٹھانے میں میری نظر بندی ہی کے چکر تھے۔ طارق بن زیا دسٹریٹ پر کہیں آگے جا کر گھر تھا۔

گھر کچھ اُس محاورے کا عکاس تھا کہ صورت کے نہیں سیرت کے ہم غلام ہیں۔ مرکزی دروازے کا گیٹ چوٹی تھا۔ ڈیزائن سے گھٹا ہوا۔ دو منزلہ گھر کی بالکونیاں چوٹی تھیں۔ عام سی جسامت والے ستون بھی غالباً چوٹی ہی تھے۔ ہمارے ہاں کی طرح بالکونیوں کے چھجے بڑے خوبصورت اور ڈیزائن دار تھے۔ بیل کی آواز پر دروازے کی چھوٹی کھڑکی کھلی جس میں سے جھک کر اندر داخل ہونا پڑا۔ یقیناً گھر میں اطلاع تھی کہ ایک نوعمر لڑکے نے احمد فاضل کو نشست گاہ کا راستہ دکھایا تھا۔

نشست گاہ کا گھر کا ڈرائنگ روم عربی کلچر میں دیوان مستطیل سی صورت کا تھا۔ گھر کے اندر ڈیوڈھی اور بار کھلنے والے دروازوں اور کھڑکیوں کی پینٹائیوں پر محرابی صورت بنی پٹی آرٹ کی مینا کاری سے سجی کمرے کو انفرادیت دیتی تھی۔ چھت اونچی اور دو دیواروں میں بلندی کی سطح پر لمبوتری سی چار کھڑکیاں روشن دانوں کی طرز پر شیشوں سے روشنی آنے کا باعث تھیں۔ صوفے کا ایک سیٹ جدید وضع اور دوسرا قدیمی صورت لئے ہوئے تھا۔ کمرے میں دو الماریاں تھیں اور دونوں کے پٹ تھے چوٹی کندہ کاری سے مزین تھے۔

ابھی میں کمرے کے جائزے میں مصروف ہی تھی کہ جب کبرت اندر داخل ہوا۔
 زکریا محمد کبرت اونچا لمبا خوبصورت نوجوان تھا۔ محبت سے ملا۔ میں نے اُس کی چھاتی پر
 بوسہ دیا۔

میرے عین سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اُس نے میرا حال احوال پوچھا۔
 پاکستان کے بارے میں مختصر بات ہوئی۔ پھر گفتگو کا رخ اپنے موضوع پر آ گیا۔ اُس کے ایک
 سوال پر میں نے بے اختیار ہی کہا۔

”کبرت سچی بات ہے میں بڑی جذباتی سی کیفیت میں خود کو ڈوبا ہوا محسوس کرتی
 ہوں۔ ڈیڑھ دن نے ہی مجھے بتا دیا ہے کہ شاعر و شوق کی ہر ٹکسی، گاڑی میں گھسا بیٹھا ہے۔
 ہر دل میں دھڑک رہا ہے۔ ہر لب پر پھل رہا ہے۔ ہم جیسے سیاح جنہیں عربی کی پوری سمجھ
 نہیں پوچھنے پر جانتے ہیں اور جب جذبات میں مانوسیت کے رنگ گھلتے ہیں تو مزہ آتا
 ہے۔“

زکریا محمد کبرت کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔

”آپ تو داستان کوئی میں بڑی ماہر لگتی ہیں۔“

میں ہنسی اور بولی۔

”لکھنوالی ہوں ماکبرت۔“

بیسویں صدی کی عرب دنیا میں ایک بھی ایسا مایاب ہیرا نہیں جس نے عربی
 شاعری کو اتنی جدت اور توانائی دی۔ عورت کی محبت، اُس کے حسن، اس کے جسم کو موضوع
 سخن بنانے کی شاعرانہ روایت تو خیر صدیوں پرانی ہے۔ مگر اسے اس کی ذات کے ادراک
 سے آگاہی دینا شاعر کا عزم تھا۔ جوشیلی آگ کی مانند پھڑکتی اُس کی شاعری نے مسلسل ملکی،
 عرب دنیا اور اقوام عالم کے طاقتور لیڈروں کو تختہ مشق بنایا۔

پیدائش پرانے دمشق میں ہوئی۔ سال 1923ء اور پورا نام نزار توفیق قبانی تھا۔
خاندان کا تعلق ترکی کے مشہور شہر قونیہ سے اور خاندانی نام اک بیک (Ak Biyik)
تھا۔ ترکی زبان میں اس کا مطلب ”کس کی مونچھ“ ہے۔

دو بہنوں اور تین بھائیوں پر مشتمل یہ گھرانہ روایات کا اسیر ہونے کے ساتھ ساتھ
انقلابی بھی تھا۔ قبانی شامی تھا جبکہ ماں ترکی نژاد۔ چاکلیٹ فیکٹری کا مالک باپ توفیق قبانی
شام پر فرانسیسی تسلط کے خلاف لڑنے والوں کو نہ صرف اخلاقی بلکہ مالی مدد بھی کرتا تھا۔
یوں حکام کی نظروں میں رہتا تھا۔ اکثر جیل بھی بھیجا جاتا۔

آبائی گھر میٹھنہ ال شام Milthnah Alshahm میں تھا۔ پرانے دمشق
کے ہسائے میں۔ تعلیم بھی دمشق میں ہی ہوئی۔ قانون کی تعلیم بھی دمشق یونیورسٹی سے
حاصل کی جو کہ پہلے سیریا یونیورسٹی کے نام سے مشہور تھی۔

روایت سے بغاوت کا عنصر اس کے خیر میں بچپن سے ہی تھا۔ اس کا واضح عملی
اظہار پندرہ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ دس سالہ بڑی بہن ”وصال“ نے خودکشی کر لی تھی کہ وہ
جس سے محبت کرتی تھی اُس سے شادی کی اجازت نہیں ملی۔ چھوٹی بہن حیفہ کے گالوں پر
زار زار بیتے آنسوؤں کو اُس نے اپنی پوروں سے صاف کیا اور بولا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں حیفہ تمہارے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔“

اولڈ دمشق کی گلیوں میں جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس نے اپنے
دوستوں سے کہا تھا۔

”میں ان رسوم کے خلاف آواز اٹھاؤں گا۔ میں شاعر بنوں گا۔ عرب دنیا
میں محبت کرنا جرم ہے۔ عرب روح ایک بڑے سے قید خانے میں بند ہے میں اسے آزاد
کروں گا۔“

اور اُس نے واقعی جو کہا تھا سچ کر دکھایا تھا۔

جب وہ ابھی کالج سٹوڈنٹ تھا اُس نے شعر کہنے شروع کر دیئے تھے اور پہلا مجموعہ بھی مرتب کر لیا۔ قائلت نی السراء The Brunette told me (براون بالوں والی کوری عورت نے مجھ سے کہا) یہ رومان اور جنس سے بھری شاعری تھی۔ ایسی شاعری جس نے عورت کو اس تنگ نظر معاشرے کی گھٹن زدہ حالت کا احساس دلانے اور اسے اپنے لیے آواز اٹھانے کے حق سے متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ شام جیسے پرانے قدامت پسند ملک میں رُڑ لے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

یہ شاعری سوچ میں بنیادی تبدیلیوں کی عکاس تھی۔ یہاں عورت مرکزی تھیم کے طور پر نمایاں ہوئی تھی اس مجموعے نے بہت سارے مسائل پر قلم اٹھایا تھا۔ مرد عورت کے تعلقات پر ہر زاویہ اور ہر رخ سے روشنی پڑی۔ انسانی اور سماجی رویے، مذہب کی اندھی تقلید اور انسانی سوچ کی آزادی، بے باکی، معاشرے میں مرد اور عورت کا صحت مند تعلق اس کے بڑے موضوع تھے۔ اس مجموعے کی ملک میں شدید مخالفت ہوئی۔ یہ نظم پڑھیئے اور تب کے مرد غالب معاشرے کے غصے اور اشتعال کا اندازہ لگائیے۔

تمہیں بدلنے کی میرے پاس طاقت اور اختیار نہیں
نہی تمہارے طور طریقوں کے لئے وضاحت کی
کبھی مت سوچو کہ مرد عورت کو بدل سکتا ہے
جو ایسا کہتے ہیں وہ دغا باز ہیں

جو سوچتے ہیں
کہ انہوں نے عورت تخلیق کی
اپنی پسلیوں میں ایک سے

عورت مرد کی پسلی سے نہیں نکلی
کبھی نہیں

یہ وہ ہے جو اس کے رحم سے نکلا ہے
اُس مچھلی کی طرح جو پانیوں کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے
یہ وہ ہے جو اس کی آنکھوں کی روشنی کے دائروں میں
خود کو وہاں رکھنے کے خواب دیکھتا ہے
ایک اور جگہ دیکھیے۔ اس کی سوچ کی گہرائی اور تجربے کا کیسا دلا آویزاں اظہار،
عورت کو بیدار کرنے کی خوبصورت کاوش اور عام فہم زبان اور قاری کو اپنے ساتھ لپٹا لینے کا
فن۔

بہت گہری محبت مت کر
جب تک کہ تمہیں یقین نہ ہو جائے
کہ دوسرا بھی تمہیں اسی گہرائی سے
پیارا کرتا ہے
آج تمہاری محبت کی گہرائی
کل تمہارے زخم کا باعث بنے گی
اُس کی محبت کے جذبات سے لبریز نظموں نے اب سماں باندھ دیا تھا۔
میرا محبوب مجھ سے پوچھتا ہے
کہ میرے اور آسمان کے درمیان کیا فرق ہے
میرے محبوب فرق تو صرف یہی ہے
جب تم ہنستے ہو میں آسمان کو بھول جاتا ہوں

ذرا اے سنیے۔

چاند کو دیکھنا مجھے بہت پسند ہے

خاص طور پر تب

جب یہ ہلال کی صورت ہو

کیونکہ میں ہر اُس چیز سے پیار کرتا ہوں

جس کا کوئی مستقبل ہو

قبائی نے عورت کے متعلق جس انداز میں سوچا اور لکھا۔ ایسا پہلے بہت کم لکھا گیا۔

اس کی باغی سوچ نے عورت کو نئے راستوں اور نئی سوچوں سے آگاہ کیا۔ ریت روایت

اور رواج میں لپٹی عورت کو اس نے اہمیت دی اور اُسے اس کے ہونے کا بھرپور احساس

دلایا۔

اے میری محبت، اے میرے پیار

اگر تم میرے پاگل پن کے لیول پر آ جاؤ

تم اپنے زیورات پھینک دیتیں

اپنے بریدسلٹ بیچ دیتیں

اور میری آنکھوں میں سو جاؤ

ایک اور جگہ دیکھیے۔

کبھی ایک ایسی عورت سے ماطہ نثوڑو

جو تمہاری بہت سی خامیوں کو جانتی ہے

اور پھر بھی تم سے پیار کرتی ہے

یہاں دیکھیے اس کا ایک اور منفرد انداز

وہ سب کتابیں لے لو
جو میں نے اپنے بچپن میں پڑھیں
میری نوٹ بکس بھی لے لو
لے لو میرے سارے چاک
اور سارے قلم بھی لے لو
اور تختہ سیاہ بھی
بس مجھے ایک نیا لفظ سکھا دو
جو کان کی بالی کی مانند جھولے
میری محبوبہ کے کانوں میں

اُس وقت ملک چونکہ فرانس کے زیر تسلط تھا۔ تاہم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں نے اسے بہت سراہا۔ ان سراہنے والوں میں ایک بڑا نام اُس وقت کے وزیر تعلیم کا تھا جو ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ملک کا ایک بڑا قومی لیڈر بھی تھا۔ چونکہ تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ دمشق کا سوداگر گھرانہ۔ اس لئے نہ مخالفت کی پرواہ تھی اور نہ موافقت نے کوئی اثر ڈالا۔ قانون کی تعلیم مکمل ہونے پر وہ وزارت خارجہ سے منسلک ہو گیا۔

1946ء میں شام فرانس کی غلامی سے بھی آزاد ہو گیا۔ کلچرل اتاشی کے طور پر وہ بیروت، قاہرہ، لندن، استنبول اور میڈرڈ وغیرہ کے ممالک میں سفارت کاری کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ ڈپلومیٹک کیریئر نے اُس کے ذہنی افق کو بہت وسعت دی۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ نے شاعر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ شاعر جس نے 1956ء میں اپنی نظموں میں عام فوجیوں کو سراہا تھا۔ باوجودیکہ مصر جنگ ہارا تھا مگر اس نے

جنگ ہارنے کے باوجود جیت لی تھی۔ لوگ خوش تھے۔ ماصر کیلئے محبت کا طوفان تھا۔ مگر
 1967ء کی چھ روزہ جنگ شاعر کے اعصاب پر بجلی بن کر گری تھی۔
 ”دھوا مش علی دفتر القلبتہ“ کے عنوان سے اُس نے اپنا کلیجہ نکال کر گلیوں بازاروں
 میں پھینک دیا تھا۔

اے میرے غم زدہ وطن
 بس ایک لمبے میں
 تو نے محبت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ میں
 خنجر تھما دیا ہے
 ذرا ان اشعار کے اندر جھانکیے۔

ہم اپنے آباء کے دامن پر داغ ہیں
 ہمارے صحراؤں کا تیل
 آگ اور شعلوں کا خنجر بن سکتا تھا
 مگر

ہمارا تیل فاحشاؤں کے قدموں میں پڑا ہے
 ہمیں بندوں پر مشتمل اس طویل نظم جسے عرب قیادت کے لئے لے لے۔ جمال
 عبدالناصر کو رگیدا۔ سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے لعن طعن کیا۔ خفیہ پولیس، حکومتوں
 کے کارپردازوں کو صیغہ جمع متکلم ہم یعنی ذات کے دائرے میں گھسیٹتے ہوئے تنقید کی سان پر
 چڑھایا۔ ذرا دیکھیے تو

اب اگر آسمانوں نے تمہاری ضمانت نہیں دی
 تو اُسے کو موت

حالات کو بھی لعن طعن مت کرو
 خدا انہیں فتح دیتا ہے جنہیں وہ چاہتا ہے
 خدا کوئی ہتھیار گھڑنے والا لوہا تو نہیں
 یا درگھو
 جنگیں کبھی جیتی نہیں جاتی
 طاؤس و رباب کے ساتھ
 ہمارے دشمن ہماری سرحدوں میں ریگ کر نہیں آئے
 وہ تو چیونٹیوں کی طرح
 ہماری کمزوریوں کے ذریعے آئے ہیں
 ذرا اور دیکھیں شاعر نے کیسے کلچر چیر دیا ہے۔
 اگر اتفاق و اتحاد کو ہم دمن نہ کر چکے ہوتے
 اس کے نوخیز بدن میں سنگین نہ اُتار چکے ہوتے
 اور اگر اتحاد باقی ہوتا
 تو دشمن یوں ہمارے خون سے ہولی نہ کھیلتا
 ایک طوفانی نظم عرب دنیا میں ہواؤں کے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہر جگہ پہنچی
 اور ہر زبان پر تھری۔ حتیٰ کہ لوگ حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے کرتے اچانک ایک دوسرے
 سے کہتے۔

”ارے تم نے نظار قبانی کی نظم پڑھی۔“

طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مصری حکومت نے ان کی تمام کتابوں کو بین کر دیا تھا۔ وہ
 تمام نظمیں جنہیں ام کلثوم نے گائی تھی جلادی گئیں۔ جمال عبدالناصر سخت مشتعل تھا۔ شاعر

کے مصر میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ اردن کا اصرار تھا کہ قبائی پر مقدمہ چلایا جائے۔
 کہیں دایاں بازو نکلتی چینی کر رہا تھا کہیں بایاں بازو۔ مگر شاعر کو کچھ پروا نہیں تھی۔
 وہ اگر نشتر چلا رہا تھا تو ساتھ ہی مایوس لوگوں کے زخموں پر پھاہے رکھ رہا تھا۔ وہ ان کی دلی
 کیفیات کی عکاسی کرتے ہوئے انہیں آس اور امید کی روشنی کا پیغام دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا
 مایوسی بے عملی پیدا کرتی ہے یا بے ادراک تشدد۔ اُس کی نظمیں نئی نسل سے مخاطب تھیں۔

ہمیں ایک ایسی مراض نسل چاہیے
 جو جوش و جذبے سے معمور ہو
 جو آسمان میں تہلکہ مچانے پر قادر ہو
 جو تاریخ کی بنیادوں کو ہلا دے
 ہمیں ایک نئی نسل کی ضرورت ہے
 جو غلطیوں کو برداشت نہ کرے
 جو گھٹنوں کے بل نہ جھکے
 ہمیں جنوں جیسی نسل چاہیے
 جو ہماری شکست پر غالب آ سکے

عرب بچو

ساون کے قطر و

ہمارے ہارے مت پڑھو

ہمارے نقش قدم پر مت چلو

ہم دغا باز اور تماشا گروں کی قوم ہیں

عرب بچو

آنے والے کل کو بتا دو

تم ہماری زنجیریں توڑ ڈالو گے

لکھنے پڑھنے کی نصف صدی پر پھیلا اُسکا کام شاعری کی چونتیس کتابوں کے علاوہ
نثر میں بڑے اہم اور ٹھوس موضوعات پر ہوا، اخباروں میں مضامین کے ساتھ "الحیات"
اخبار میں کالم نگاری بھی کی۔ پہلے بیروت میں ذاتی پبلیشنگ ہاؤس قائم کیا۔ پھر اُس کی شاخ
لندن میں بھی قائم ہوئی۔ اُس کی زیادہ تر کتابیں یہیں سے چھپیں۔

شاعر نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی اس کی کزن تھی زہرہ اک بیک۔ ایک بیٹی
حد بد اور ایک بیٹا توفیق جو صرف بائیس سال کی عمر میں لندن میں ہارٹ ایک میں چل بسا
بیٹے کی موت پر اُس کی نظم ”دمشق کا چاند“ بھی ایک شاہکار تھی۔

دوسری شادی اُس نے ایک عراقی ٹیچر بلقیس الروی سے کی جو اُسے بغداد کے ایک
مشاعرے میں ملی تھی۔ بلقیس سے اُسے بہت محبت تھی۔ نظارت قبانی بیروت میں تھا۔ یہ
1881ء کا زمانہ تھا جب لبنان سول وار کی لپیٹ میں تھا۔ وہ تو اخبار لینے کیلئے گھر سے نکلا
جب عراقی سفارت خانے پر بم بلاسٹ ہوا۔ سفارت خانے سے قریب تر ہونے کی وجہ سے
اُسکا گھر متاثر ہوا اور بلقیس تو عین موقع پر ہی دم توڑ گئی۔ یہ اُس کیلئے بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ
بکھر گیا تھا۔ بلقیس سے اُسے بہت پیار تھا۔ اُس کی موت پر اُس نے جو شاعری کی وہ مرثیہ کوئی
کی تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

کہیں اس نے بلقیس کو بابل کی ملکہ سے مخاطب کرتے ہوئے اپنے جذبات کا
اظہار کیا۔ کہیں نینوا کی چٹیلی شاخ کہا۔ کہیں عراقی بلند ترین پام کے بوٹے سے تشبیہ دی۔
کہیں وہ کوئین اف شیبہ تھی، کہیں میری بلوئڈ جیسی۔ کہیں دجلہ کی کوئی فضلی اہر، بہار کا پھول،

حسین میکلس، کہیں باوقار چال کے سلسلے مورنی اور افریقہ کی مادہ بارہ سنگا سے جڑتے۔
عرب کی ساری جغرافیائی اور ثقافتی تاریخ سے تشبیہوں اور استعاروں کے ڈھیر
لگاتے ہوئے اُس نے لکھا۔

شکریہ۔ شکریہ میری بلقیس کو مارنے کا شکریہ

اب جاؤ اور جام نوش کرو

شہید کی قبر کنارے

میری نظم بھی قتل ہوگئی

اپنی محبت اور غم و درد کے سمندر میں اتر کر اُس نے اپنے قاری کو کس کس انداز میں
اپنے احساسات میں شریک کیا۔

صرف چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

بلقیس

تم کیسے میرے شب و روز

اور میرے خوابوں کو اپنے ساتھ لے گئیں

تم نے سب خوبصورتیوں

اور سب موسموں سے کنارہ کشی کر لی

اوہ میری زندگی میری جان، میرا پیار

میری نظمیں اور میری آنکھوں کی بصارت

تم نے کیسے مجھے چھوڑ دیا

ایک لفظ کہے بغیر

اس کے جذبات کے بہاؤ کو مثالوں کے حاطے میں لانا کتنا دشوار ہے۔ ایک اور

جگہ اس اظہارِ کارنگ دیکھیے۔

بلقیس تم میرا درد ہو
وہ درد جو نظم لکھتے ہوئے
مجھے اپنے دل اور انگوٹھے
میں محسوس ہوتا ہے

طوفان اٹھانے والی اُس کی ایک نظم ”کیا آپ مجھے اجازت دیں گے“ ہے۔ جس
میں شاعر نے سُلجھے ہوئے خوبصورت انداز میں مذہب، مولا، خدا، معاشرے پر تنقید کی۔ نیم
خواندہ مذہبی لوگوں نے کیسے ایک خوبصورت مذہب کو بے روح پریکٹس اور تنگ نظری کا مرقع
بنادیا ہے۔ ذرا دیکھیے شاعر کا انداز۔

اگر ہم
اپنی دھرتی
اور حرمتِ خاک کی حفاظت کریں
اگر ہم
اپنے لوگوں سے ہونیوالی زیادتی
اپنے آپ سے ہونے والی زیادتی کے خلاف
بغاوت کریں
اگر ہم

اپنے صحراؤں میں کھڑے کھجور کے آخری درختوں کی حفاظت کریں
اپنے آسمان میں بچے آخری ستاروں کی حفاظت کریں
اپنی ناموں کے آخری حروفِ تہجی کی حفاظت کریں

اپنے ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کے آخری
 قطروں کی حفاظت کریں
 اگر یہی ہمارا گناہ ہے تو
 واللہ کتنی خوب صورت ہے دہشت گردی؟
 کیا آپ مجھے اجازت دیں گے
 کہ میں اپنے بچوں کو بتاؤں
 خدا عظیم ہے اور اس کے معیار مختلف ہیں

ان سے

جو مذہب کے تاجر ہیں
 اور خدا کی جواب طلبی میں مہربانی ہے
 اور وہ بہت رحیم و کریم ہے
 ”اویروشلم“ اُس کی ایک ایسی نظم ہے جو اُس کے اندر کے دکھ کی عکاس ہے۔ جو
 مذاہب کے ٹھیکے داروں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ جو ایک پکار ہے۔ ظلم کے خلاف ایک احتجاج
 ہے۔ دکھ بھرا سوال ہے۔

اویروشلم

افسر دیگوں کے شہر تم ایسے ہو
 جیسے آنکھ میں تیرتا پھرتا ایک بڑا آنسو
 غصے اور اشتعال پر کون قابو پائے گا
 تم جو مذاہب کے قیمتی موتی ہو
 تمہاری خون آلود دیواریں کون دھوئے گا

انجیل کی حفاظت کون کرے گا

قرآن کا کون رکھوا لائے گا

عیسیٰ کی کون حفاظت کرے گا

وچنہوں نے عیسیٰ کو مارا

اور

انسان کو کون بچائے گا

ایک اور نظم دیکھیے۔

ہماری آہ و بکا ہمارا چیخنا چلا نا

ہمارے کاموں سے زیادہ بڑا ہے

ہماری تلواریں ہماری قامت سے

کہیں زیادہ لمبی ہیں

ہمارا المیہ یہی ہے

ہم جدید تہذیب کی قبا تو ضرور پہن لیتے ہیں

لیکن ہماری روحیں

پتھر کے زمانوں میں رہتی ہیں

When they will announce the death of Arabs

اُس کی ایک اور ہنگامہ خیز نظم ہے۔ شاعر کیسے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے

کہتا ہے۔

پچاس سالوں سے میں عرب ریاستوں کو دیکھ رہا ہوں

وہ بادلوں کی طرح گرجتے ہیں مگر برستے نہیں

وہ جنگیں لڑتے ہیں اور ہارتے ہیں
 وہ فہم فراست کی بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں
 مگر انہیں ہضم نہیں کرتے
 میں تاریخ کی کتابوں میں تلاش کرتا ہوں
 کوئی اسامہ ابن المنطق، کوئی عمرؓ اور حمزہؓ
 کوئی خالد جوشام کو فتح کرنے جاتا ہو
 کوئی معتمد باللہ جو عورتوں کو زیادتی اور آگ سے بچاتا ہو
 1990 کی خلیجی جنگ پر اُس نے اپنی مشہور نظم میں کہا
 شکست ہوئی
 اس کے بعد ایک اور شکست
 ہم کوئی جنگ کیسے جیت سکتے ہیں
 اگر وہ سب
 جنہوں نے فوٹو گرافر کے طور پر کام کیا
 اور

پروپیگنڈا منسٹری میں جنگ لڑنی سیکھی
 بلیٹس کی موت کے بعد اُس نے بیروت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ وہ جینیوا اور پیرس کے
 درمیان متحرک رہا۔ پھر لندن میں سیٹ ہو گیا۔

کو اُس نے خاصا وقت لندن میں گزارا۔ مگر اس کے باوجود اسکی طاقتور شاعری
 اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ عرب دنیا میں سفر کرتی رہی۔ دمشق ہمیشہ اس کی کمزوری
 رہا۔ ایک طاقتور عنصر کے طور پر اُس کی شاعری میں جھانکتا رہا۔ اپنی محبت اور پیار کا اظہار اُس

نے بہت بار کیا۔

”دمشق تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو؟“ کیا نظم تھی۔ شاعر کی اپنے آبائی شہر سے محبتوں کا اظہار کس کس انداز میں سامنے آتا ہے۔

میں یادوں کی گھٹڑی کھولتا ہوں

ایک پھر دوسری

مجھے اپنا باپ یاد آتا ہے

جو معاویہ ایلی کی ورکشاپ سے آتا ہے

مجھے دمشق کے گھریا آتے ہیں

انکی Copper کی ڈورنوبز Knobs،

ان کی لشکارے مارتی ٹانگوں والی چھتیں

اور اُن کے اندرونی صحن

یہ سب تمہیں جنت کی یاد دلاتی ہیں

میں Al-Muhyi ابن العربی کا جبہ پہنتا ہوں

میں جبل قاسیون کی چوٹی سے اُترتا ہوں

شہر کے بچوں کے لئے آڑو، اماں اور محبت کی نظمیں

اُڑتی چڑیوں کی لمبی قطاریں

اے شام کے لوگو میں تمہاری سبز چڑیا ہوں

میں تمہارا پاگل شاعر ہوں

میں تمہارا نایاب چاند ہوں

اُسے مجھے ایک بستر دینے دو

اور ایک اونی کمبل بھی
 کہ میں صدیوں سے نہیں سویا ہوں
 "دمشق کی چینیلی" اس محبت کی ایک اور واضح مثال ہے۔
 ذرا دیکھیے:

میں دمشق واپس آتا ہوں
 بادلوں کی پشت پر سوار ہو کر
 دو خوبصورت گھوڑے بھی میرے نیچے ہیں
 ایک میرے جذبوں کا
 ایک میری شاعری کا
 میں ساٹھ سال بعد واپس آیا ہوں

اپنی وفات سے صرف ایک سال قبل اُسے ”میں دہشت گردی کے ساتھ
 ہوں“ جیسی شہرہ آفاق طویل سیاسی نظم لکھ کر خود کو امر کر لیا۔ نظم میں وہ دہشت گردانہیں کہتا
 ہے جو دہشت گردی کی آڑ میں ملکوں پر تسلط جماتے اور معصوم لوگوں کو خون میں نہلاتے
 ہیں۔ قبائی جسے دہشت گردی مانتا ہے وہ گیارہ ستمبر والی نہیں نہ اس سے مراد فضول قسم کے
 دھماکے اور قتل ہیں۔ اس لازوال نظم کا ہر مصرع موتی ہے، ہیرا ہے۔

”میں دہشت گردی کا حامی ہوں“

امریکہ کہ لوگوں کی ثقافت کا دشمن
 مگر خود ثقافت سے عاری
 مہذب لوگوں کی تہذیب کا پیری
 مگر خود تہذیب سے محروم

امریکہ

ایک فلک بوس عمارت کا نام

مگر دیواروں سے خالی

میں دہشت گردی کا حامی ہوں

ہمیں دہشت گرد کہا جاتا ہے

اگر ہم اسرائیلی بلڈوزروں تلے آکر

مرنے سے انکار کر دیں

اپنے لوگوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھائیں

وہ ہماری دھرتی ملیا میٹ کر رہے ہیں

ہماری تاریخ مٹا رہے ہیں

ہمارے قرآن، ہماری انجیل کی تذلیل کر رہے ہیں

اگر ہمارا گناہ یہ ہے تو

واللہ کتنی خوبصورت ہے دہشت گردی

میں دہشت گردی کا حامی ہوں

اگر یہ مجھے

روس، رومانیہ، ہنگری اور پولینڈ سے آئے

مہاجرروں سے بچا سکے

یہ مہاجر فلسطین میں آجے ہیں

وہ ہمارے کندھوں پر سوار ہیں

انہوں نے القدس کے مینار

اقصیٰ کے دروازے
 اور محرائیں چھالی ہیں
 میں دہشت گردی کی حمایت جاری رکھوں گا
 جب تک نیو ورلڈ آرڈر
 امریکہ اور اسرائیل کے درمیان
 منقسم رہتا ہے
 یہ میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا
 ان کے کلڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا
 میں اپنی شاعری سمیت
 اپنے لفظوں سمیت
 اپنی ساری طاقت کے ساتھ آواز بلند کرتا رہوں گا
 جب تک یہ نئی دنیا قصاب کی گرفت میں ہے
 میں دہشت گردی کا حامی ہوں اور رہوں گا
 اس نظم نے پوری عرب دنیا کے طول و عرض میں طوفان برپا کر دیا۔ بڑی طاقتوں
 نے بھی شدید غصے کا اظہار کیا۔ مگر شاعر نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔
 اسکی موت پر جہاں دنیا بھر کے اخبارات نے اُسے خراج تحسین پیش کیا۔ وہ ہیں
 دمشق کے گلی کوچوں میں اٹک بھاتی آنکھوں نے ایک دوسرے سے ملنے پر کہا تھا۔
 ”جاننے ہو آج دنیا سے کون رخصت ہوا ہے؟“
 وہ شخص جس سے بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھنے والے چھوٹے اور بزدل لوگ
 ڈرتے اور نفرت کرتے تھے۔ اُس کی آخری خواہش جبکا اظہار اُسے اسپتال میں کیا دمشق

میں دفن ہونے کی تھی۔

”دُشِق میرے لئے رحم مادر کی طرح ہے جس نے مجھے شاعری سکھائی جس نے
مجھے تخلیق کار بنایا۔“

میں ملول تھی۔ شکر گزار تھی۔ عرب مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوئی تھی۔ شام کی
ایک صاحب علم ہستی سے ملی تھی اور اب باب صغیر جانے کی متمنی تھی جہاں وہ عظیم شاعر دفن
تھا۔ جب میں گھر سے نکلی تھی اس کی ایک خوبصورت نظم میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

گر میوں میں ساحل پر نیم دراز

تمہارے بارے سوچتا ہوں

اے سمندر اگر تمہیں یہ پتہ چل جائے

کہ تمہارے بارے میں نے کیا سوچا

تو تم اپنے ساحلوں، اپنی سیپیوں، اپنی مچھلیوں کو

چھوڑ کر میرے پیچھے چلے آتے



موناعمیدی

شام کی حساس، منفرد اور نئی سوچ کی حامل شاعرہ

- مونا عمیدی نے امریکن ماں کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی دمشق نہیں چھوڑا۔
- شام جیسے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے لبالب بھرے ملک کو اب کھنڈ رہنے
- دیکھنا بڑا کٹھن کام ہے مگر مونا عمیدی لفظوں کے سہارے یہ کام کر رہی ہے۔
- جنگوں کے لیے انسانی جذبات و احساسات کی پوشیدہ پرتوں کو بھی بیدار کر دیتے ہیں۔
- حافظہ الاسد نے بنیادی مسائل کے حل کی طرف توجہ نہیں کی۔

ہم ہیں
 ہم بکھرے شکستہ خوابوں والی نسل
 جوشیلوں پر سوتی، جاگتی اور قہقہے لگاتی ہے
 اس نسل کا غم اور دکھ بس صرف اتنا
 کیا بچلی اور انٹرنیٹ جلد بحال ہوگا
 ہم وہ نسل جس کی خوشیاں چوری ہو گئی ہیں
 تاہم ہمارے نوجوان دل زندگی کیلئے ابھی بھی کشادہ ہیں
 ہم وہ نسل جو کبھی کسی دن کہیں گے
 ہم نے تاریکیوں سے جنگ کی اور اُسے کہیں دور دھکیل دیا

مونا عمیدی

دُشَق میں چم cham پیس ہوئیں کے بالمقابل نوئل بک شاپ پر دھری مونا
عمیدی کی نظموں کے مجموعے کی پھولا پھرولی میں اس نظم نے پل بھر میں ہی گرفت میں لے
لیا تھا۔

آہ بغداد کے ستور بند ہیں
تریپولی کی گلیاں ویران ہیں
غزہ پر بمباری ہے
فلوجہ شعلوں میں نہا رہا ہے
دنیا سو رہی ہے
اور عرب دنیا
بحث میں اُلجھی ہوئی ہے کہ
ورلڈ کپ میچوں میں کون جیتا ہے؟

رہنما اللہ کا

یہ چونکا دینے والی نظم تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے پانچ چھ مزید نظموں کے مطالعہ نے بتایا کہ شاعرہ نے بشار الاسد کے آغاز اقتدار سے جس سیاسی تبدیلی کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے بہت سی امیدیں وابستہ کیں۔ فکری انقلاب مشرق وسطیٰ کے درودیوار پر دستک دیتا محسوس کیا۔ 2000 سے 2001 کے مختصر وقت کو "دمشق بہار" کے نام سے موسوم کیا تھا۔ آنے والے وقتوں میں اس نے مایوس کیا۔

نثر اور کورس کی کتابیں لکھتے لکھتے دلی جذبات شعروں میں ڈھلنے لگے تھے۔ کھلتی رنگت والے سبزمین نے صاحب کتاب سے مزید تعارف کی غرض سے ایک اور خوبصورت کتاب سیرین فوک ٹیلو Syrian Folk tales ہاتھ میں پکڑا دی اور ساتھ ہی بڑے بیٹھے سے لہجے میں بیٹھ کر کتاب کو تفصیلی دیکھنے کی دعوت بھی دے دی۔ دیدہ زیب طباعت و کتابت اور ٹائٹل نے توجہ فوراً کھینچی۔ صفحات الٹنے پلٹنے اور کہیں کہیں پڑھنے سے احساس ہوا کہ بلا دالاشام کے مختلف علاقوں کی یہ کہانیاں ایک انتہائی شاندار پیش کش تھی۔ گرفت میں لینے والی عام فہم زبان جو حقیقت اور طلسم، معلوم اور نامعلوم کے درمیان سفر کرتی تھیں۔ مصنفہ شاعرہ بھی کمال درجے کی تھی۔ دونوں کتابیں خرید لیں۔ میری درخواست پر بک شاپ کے مالک نے مصنفہ کافون نمبر اور پتہ بھی کاغذ پر لکھ دیا تھا۔ یہ 2008 تھا۔ شام پر امن تھا اور عام آدمی کب جانتا تھا کہ فضاؤں میں کہیں اس کی مبادیوں کے چہرے گردش میں ہیں۔

کہانیوں نے مجھے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ یہ تعارف تھا اس خوبصورت ملک کے ماضی کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں عمیدی کی دادی سے بیٹھی کہانیاں سن رہی ہوں۔ شام کے شہروں کے گھروں کے پرسکون ماحول میں، شام کے مختلف

دیہی علاقوں میں روایتی زندگی کے سارے رنگ ان کہانیوں میں اڑتے پھرتے تھے۔ رات گئے نظمیں پڑھتی رہی۔ اگلے دن ال فر دوس سٹریٹ پر واقع گھر پر ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔ گھر ڈھونڈنے میں پتہ پانی ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور بڑا اناڑی سا تھا۔ خوب خوب گھمایا۔ اس پتھر کی طرح رولا جوفٹ پاتھ پر پڑے کسی شرارتی سے چلنے والے راگبیر کی ٹھوکروں پر آجائے جو پاؤں کے ٹھنڈوں سے اُسے لڑھکا لڑھکا کر اس کا حشر نشر کر دے۔

مونا عمیدی قدرے فربہ بدن کی مخرج و سفید خاتون نے مجھے اپنے گھر کے دروازے پر خوش آمدید کہا تھا۔ دروازہ ایک معمر عورت نے کھولا۔ ایک اجنبی صورت سامنے تھی۔ زبان یا رمن ترکی والا معاملہ تھا۔ تاہم مونا آگئی۔ پاکستان کا جان کر اتنا خوش ہوئی کہ جتنی سفر سے کوفت ہوئی تھی سب اڑنچھو ہو گئی۔ چھوٹے سے بچے ہوئے ڈرائیونگ روم میں بیٹھتے ہی کولڈ ڈرنک آیا، پھر قہوہ، کچھو ریں اور مٹھائی آگئی۔ باتیں شروع ہوئیں اور پھیلتی چلی گئیں۔ اپنی دونوں کتابیں میرے پاس دیکھ کر خوش ہوئی۔ میں نے کہا کہ وہ اُن پر کچھ لکھ دے۔

”سکون سے بیٹھو۔ لکھ دوں گی۔“ محبت بھرا اظہار تھا۔ لہجے میں۔

یہ شاعری اُسے کتاب کی طرف اشارہ کیا شاید اس معیار کی نہ ہو جو شاعری کا ہونا ہے۔ اصل میں تو فوک ٹیلر کی یہ کتاب ہے جسے میں نے اہتمام اور محبت سے لکھا ہے۔ یہ تو بس ایسے ہی جذبات کا اظہار ہے۔

باتیں شروع ہوئیں وہ بھی دو عورتوں کی جو دو مختلف ملکوں، دو مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ عورتوں کے حوالے سے جو تصویر مونا نے مجھے دکھائی وہ ہماری تصویر سے کچھ ہی مختلف تھی۔ شہری اور دیہی عورت کا جائزہ بھی تھا۔ تاہم سیریا میں زیادہ آبادی شہری ہے۔ ملکی قانون میں بھی مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔

تا ہم سیاسی طور پر جو کچھ سُننے کو ملا وہ صحت مند نہ تھا۔ مونا بہت سلجھی ہوئی اور ملکی حالات پر گہری نظر رکھنے والی خاتون تھی۔ اس نے مختصر اُشام کی سیاسی تاریخ میرے سامنے کھول دی تھی۔ میری درخواست تھی کہ وہ کچھ حالات پر روشنی ڈالے کہ جانوں تو سہی۔ خادمہ ٹرائی گھیسٹھی ہوئی لائی۔ جس پر دُش میں سُرخ کٹا تر بوز سجا تھا۔ مونا نے پلیٹ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اُسے بھرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی کاٹا بھی ہاتھوں میں تھما دیا۔

شہد جیسا ٹھٹھا ٹھنڈا تر بوز حلق سے نیچے کیا اُترا کہ روح تک سرشار کر گیا۔ عرب دنیا میں دراصل بعث پارٹی نے بہت سرعت اور جانفشانی سے نوجوان طبقے کو متاثر کیا تھا۔ اس کی واحد مثال اسلامی بھائی چارے سے ہی دی جاسکتی ہے۔ حافظ الاسد ایسا ہی ایک مضطرب نوجوان تھا جو قومی کردار میں اپنا حصہ ڈالنے کیلئے بے قرار تھا۔ وہ فائٹر پائلٹ تھا۔ اپنی فوجی وابستگی کو اُس نے پارٹی میں اپنے کردار کیلئے بہت سمجھداری سے استعمال کیا۔ سیاسی سوجھ بوجھ، مہارت، ذہانت، فراست اُسے 1971 تک ملک کی صدارت کے عہدے تک لے گئے۔

اُس کی فتح یا بی یقیناً کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ وہ اگر چاہتا تو اپنے اس اقتدار میں سیریا کو آسمان پر لے جاتا۔ مگر اُس نے بنیادی مسائل جن میں سرفہرست نسلی امتیازات اور "معاشرے میں اسلام کا کردار" کی طرف توجہ نہیں دی۔

یہ سلسلہ جو آج سیریا میں اپنی تلخیوں اور المیوں کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ شاید نہ آتا اگر اس کا تذکرہ کر لیا جاتا۔

1973 کے نئے آئین میں درج تھا۔ فرانسیسی غلبے کے دوران بھی جو آئین وضع تھا اس میں بھی یہ درج تھا کہ صدارت پر متمکن صرف مسلمان ہوگا۔ سیکولر سیاست کے ساتھ

مخلص ہونے کے باوجود حافظ الاسد نے اس مسلم آرا کو دو طریقوں سے سبوتاژ کیا۔ پہلے کے مروجہ آئین ایک شق داخل کرتے ہوئے اسلام کو نئے معنی پہناتے ہوئے اُسے نئی تعریف دی۔

اسلام امن، عدل، سلامتی، محبت اور مساوات کا مذہب ہے۔ اُس میں علویوں Alawis کو شیعہ مسلک سے جوڑا گیا اور کافر یا بدعتوں کی فہرست سے نکال باہر کیا۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ جو 1982 Hama کے شہر میں پہلی بار فسادات کا باعث بنی۔ ان کی شدت اس درجہ تھی کہ شہر کھنڈر بن گیا۔

یہ اور بات تھی کہ اس کی بھرپور توجہ، دلچسپی اور فراخ دلانہ وسائل کے استعمال نے کیا گھروں، کیاسڑکوں، اسپتالوں، پارکوں کی تعمیر کروا کے دنیا کو دکھا دیا کہ وہ جلا بھنا کھنڈر شہر کیسے ایک زندہ شہر بن سکتا ہے اور حکمران اگر چاہیں تو چیزیں کیسے ممکن ہوتی ہیں؟

یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ مگر بنیادی جھگڑا تو جوں کا توں تھا۔ نسلی مسائل کو حل کیسے کرنا ہے اور اسلام کا معاشرے میں کیا کردار ہو جیسے اہم مسائل پر اُس کی عدم دلچسپی آنے والے خونین حادثات کا باعث بنی۔ اُس کے ہاں اسلام اور بحث پارٹی سنی اور علویوں، شہروں اور دیہی علاقوں میں سماجی تضادات کی گھتئیوں میں الجھتی رہیں اور اُس نے انہیں سلجھانے اور حل کرنے کی طرف قطعاً توجہ نہ کی۔

2000 میں بشار کے آنے سے احساس ہوا کہ شاید تبدیلی کی کوئی خوشگوار سی لہر چلے۔ اس کی برطانوی نژاد بیوی اسماعل عکراس Akhras بھی بہت تیز اور ڈرامائیٹک قسم کی اپروچ کی حامل نظر آئی تھی۔

دراصل اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد اس نے دمشق بہار کا نعرہ لگاتے ہوئے درجنوں سٹیڈی سرکلو اور بحث مباحثوں کے مراکز قائم کیے۔ سچی بات ہے 2001 میں

دانشوروں اور وکلاء کے گروپوں نے آئین میں اصلاحات کے لیے زوردار قسم کی مہمیں چلائیں۔ جن میں سرفہرست ایمر جنسی قوانین کا ہٹانا اور مکمل شخصی آزادیوں کا حصول تھا۔ مگر جامداندہ ٹیکنڈے اتنے زبردست تھے اور اندر خانے ایسی ایسی گھناؤنی سازشیں تھیں کہ بظاہر ہر سطح بہت پرسکون نظر آنے کے باوجود تہہ میں بہت طوفان مچلتے تھے۔

جب ہم شام کی چائے پیتے تھے۔ ملحقہ کمرے سے مدہم سروں میں کسی گیت کی آواز نے جیسے مجھے مضطرب سا کر دیا۔ آواز اتنی خوبصورت تھی کہ سمجھ نہ آنے کے باوجود بھی گیت دل میں اُتر جاتا تھا۔

مومنانے پوچھا تھا۔ عربی کی شدید ہے۔
”بس پڑھنے کی حد تک سمجھنے کی نہیں۔“

یہ نزار قبانی کی شاعری تھی۔ ترجمہ بھی اُس نے کر دیا تھا۔ اور گانے والے کا نام بھی نزار قبانی پر بات ہوئی تو کہنے لگی۔ وہ زمانوں کا شاعر ہے۔ مخصوص وقت کا نہیں۔

عورت مرد کی امارت سے
نہ ہی اس کی خوبصورتی سے
اور نہ ہی اس کی شاعری سے
کچھ نہیں چاہتی
اس کی تمنا ایک ایسا مرد ہے
جو اس کی آنکھوں کی زبان سمجھ سکے
جب وہ اداس ہو
وہ اپنی چھاتی کی طرف اشارہ کرے
اور کہے

یہ ہے تمہاری جائے پناہ

پھر مونا کی ذاتی زندگی کے بارے جاننا۔ امریکن ماں اور شامی باپ کے گھریلا ہونے والی یہ بچی 1962 میں دمشق میں پیدا ہوئی۔ انگریزی ادب میں گریجویشن اُس نے دمشق یونیورسٹی سے کیا۔ اس کے ساتھ اس نے انگلش عربی ٹرانسلیشن کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ آغاز میں اس نے بچوں کے لیے انگریزی کورسز مرتب کیں۔ اور انگریزی زبان کیسے پڑھائی جائے پر نصابی کتب لکھیں۔ بعد ازاں عربی کہانیوں کا ترجمہ شروع کر دیا۔

دو بچے بیٹا اور بیٹی باپ کے ساتھ دیمس Dimas کسی عزیز کے ہاں گئے

تھے۔

”دراصل اُن کی بیٹی میری بیٹی کی ہم عمر ہے۔ بہت پیار ہے دونوں میں۔ آج

اس کی سالگرہ تھی۔“

”آپ نہیں گئیں؟“ پوچھا۔

”کچھ طبیعت ٹھیک نہ تھی۔“ پھر ہنستے ہوئے بولیں۔

”ہاں چلی جاتی تو تم سے کیسے ملتی؟“

اور واقعی میں نے سوچا یہ جو دانے دانے پر مہر ہے ایسے تو نہیں کہا گیا۔

ہمارے درمیان اب اس کی فوک کہانیوں کے حوالے سے باتیں ہونے لگیں۔

فوک کہانیوں کی ان سلسلہ وار کتابوں نے ایک دھوم مچا دی۔ عام شامی کیا پڑھے

لکھے لوگ بھی اپنے ملک کی ثقافت کے ان خوبصورت رنگوں سے ناواقف تھے۔ بہت

پذیرائی ہوئی۔ انگریزی میں شاعری بھی چونکا دینے والی تھیں۔ یہ جذبات و احساسات کا

ایک جہاں کھولتی تھیں۔ عراق سے متعلق نظمیں، لیبیا، مصر عرب دنیا کس بے حسی کا شکار

ہے۔ بڑی طاقتوں کی سیاسی ریشہ دوانیاں، غلبے کی خواہشیں اور طاقت کے اندھے اظہار

کیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے عام لوگوں کے خوابوں، خواہشوں، امیدوں اور ان کے بستے رستے خوش و ہرزم گھروں کو کھنڈر بنا دیتے ہیں۔ وہ جو کہانیاں اور محبت کے گیت لکھتے اور گاتے لوگ کیسے بیٹھے جذبات سے ماطہ توڑ کر خنجر ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔ بے حد عام فہم لفظوں میں حقیقت کا چہرہ اور اپنے جذبات و احساسات کس خوبی سے اپنے اندر سے نکال کر وہ باہر صفحے پر بچھا دیتی ہے۔

جب عراق خاک و خون میں نہا رہا تھا کہیں کسی وژن رکھنے والے نے کہا تھا۔ عراق سے فراغت کے بعد شام کی باری ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں۔
اس بات پر اُس نے دکھ سے بھرتی ہوئی لمبی گہری سانس باہر نکالی تھی۔ اور مجھے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

حافظ الاسد غیر معمولی ذہانت والی شخصیت تھی۔ سوال ہے کہ 1982 کی تباہ کن بغاوت سے اُسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کس طرح بیرونی طاقتیں اس کے لوگوں میں گھسی کام کر رہی ہیں؟ جب 1500 سے سے زائد مشین گنیں پکڑی گئیں۔ لوگ گرفتار ہوئے اور معلوم ہوا کہ ان کی سی آئی اے نے تربیت کی ہے تو پھر عزائم کو پڑھ لینا کوئی مشکل کام تھا۔ مگر بات تو اتنی سی ہے کہ آمرانہ اقتدار کا مزہ اس نشہ آور مشروب کی طرح ہے جسے حالات کی تیز ترین ترشی چھینوڑتی ضرور ہے مگر ہوشیار نہیں کرتی۔

رات کے کھانے کے بعد مونا کا ڈرائیور مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ ہم نے فون، ای میل کے تبادلے کیے تھے۔

پاکستان آ کر کبھی کبھی میرا اُس سے رابطہ ضرور ہوتا تاہم 2011 میں اخبارات نے بتانا شروع کیا کہ خانہ جنگی شام کے خوبصورت شہروں پر اپنی نحوست کے سائے پھیلانے شروع ہو گئی ہے۔

آنسوؤں نے آنکھیں دھندلا دی تھیں کہ اندھی عرب دنیا اور دیگر اسلامی ملکوں کی قیادتیں سب آلہ کار بنی ذاتی اعتراض کیلئے ضمیر کے سودے کرتی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیئے اپنی اپنی دنیاؤں میں گم تھیں۔ کوئی بینون منصوبہ بھی ہے۔ کہیں پر عظیم تر اسرائیل کے لینے کام ہو رہا ہے۔ امریکی تھنک ٹینک اب عرب اور تیسری دنیا کے مفلوک الحال ملکوں کو کس اندھے کنوئیں میں دھکیلنے کیلئے سرگرم ہیں۔ انہیں کوئی غرض نہیں۔

اور یہ جنگ پھیلتی جا رہی تھی۔ اپنی ایک میل میں اس نے کھاتھا۔

اس عقل کے اندھے بٹا رکھوں سمجھائے کہ سیاسی مخالفت کا مطلب ہتھیاروں کو اٹھانا نہیں ہوتا۔ سیریا کا جھگڑہ پر امن احتجاج کے طور پر شروع ہوا تھا۔ اسے لڑائی میں کیوں بدلنے دیا گیا؟ احمق مغرب کی چالوں کو نہیں سمجھتا۔ جانتی ہو کتنے لوگ مارے گئے۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے اور در بدری کا المیہ تم دیکھتی ہی ہوں گی۔

اور یہ اس کی نیٹ پر باتیں تھیں۔ جنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ امید کی کہیں نہیں بھاگی۔ دمشق میں رہی۔ کیونکہ دمشق سے اُسے عشق ہے۔ لینن گراڈ کے اُسے بوڑھے موسیقار کی طرح جو سمجھتا تھا کہ وہ اگر شہر سے چلا گیا تو فصیل شہر گر جائے گی۔ اپنے خوبصورت ملک کے خوبصورت شہروں کو عراق کے شہروں کی طرح کھنڈر بننے دیکھتی اور اپنے دکھوں کو لفظوں کے باروں میں پرو پو کر اس کا اظہار کرتی رہی۔

دمشق خوبصورتیوں، پرانی اور نئی تہذیبوں کا شہر

آہ روشنیوں کا شہر مگر اب بجلی نہیں

چنبیلی جیسی کلیوں کا شہر مگر اب پانی نہیں

محبوبوں کا شہر مگر دوستوں سے خالی

تاریخ سے بھرا شہر مگر مستقبل سے خالی

وہ ہمسائیوں کو آواز دیتی ہے اور سنتی ہے سارے شہر میں پانی نہیں۔ بجلی نہیں، گیس نہیں۔ تب دکھنس نس اور رگ رگ سے پھوٹتا ہے۔ پھر وہ معصومیت سے خود سے سوال کرتی ہے۔ ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ دمشق میں فوجیہ Fijeh چشمہ سلامت رہے اس نے تو شہریوں کا ہمیشہ خیال رکھا تھا۔

پھر جیسے وہ ماضی کی یادوں سے حال میں آتی ہے۔ میں اسلامی کیلنڈر کے صفحات الٹتی ہوں۔ جو میری بچن کی دیوار پر آویزاں ہے۔ دو ماہ بعد رمضان ہے۔ میرے بچپن کے رمضان کی خوبصورت یادیں اپنی پوری توانائی سے میری آنکھوں سے باہر چھانکی ہیں۔ کیسے دل موہ لیتے منظر تھے۔ افطاری کے کھانوں کی خوشبوئیں۔ اذان کی پرسوز آواز، تراویح کی رونقیں۔ ٹپ ٹپ آنسو آنکھوں سے گرتے ہیں۔ یہ رمضان کیسا ہوگا؟

صبح کے منظر را دینے والے ہیں
دمشق کے لوگوں کو کس جرم کی پاداش میں
سزا دی گئی ہے
میں کیسے بتاؤں کہ

دمشق کے رمضان کی مقدس راتیں
مگر رنگین لائینوں اور قمقموں کے بغیر

اب

خاموشیوں کو توڑتی ذکر کی آوازیں نہیں

دمشق میرے خوبصورت شہر

زندگی تو یہاں غروب ہوتے سورج جیسی ہو گئی ہے

جو لوگوں کے دلوں میں ڈوبتی ہے
 بڑی ہی آتشیں دھمکیوں کے سنگل ویتی
 اداسی اور مایوسی کی لہروں کو پھیلاتی
 گھپ اندھیروں میں گم ہوتی
 یہ جولائی 2014 ہے اور وہ لکھتی ہیں۔

میں شہر کا چکر لگانے کا ارادہ کرتی ہوں۔ اپنی گلی کے ہمسائیوں کے دروازوں کے
 پاس سے گزرتے ہوئے مجھے ہوا کی چال میں لڑکھڑاہٹ اور بین کی سی کیفیت کا احساس ہوتا
 ہے۔ بند دروازوں پر دستک میں درو کی ایسی چیخ ہے کہ جیسے وہ اچانک کسی بیٹھے محور کن
 خواب سے جاگی ہے اور اسے یہ کرہناک احساس ہوا ہے کہ اس کے مکین ہمیشہ کے لیے کہیں
 چلے گئے ہیں۔ میرا یہ شہر کبھی لوگوں سے بھر پورا ہوتا تھا۔ زندگی کی گہما گہمی سے ہنستا مسکراتا
 جانے کہاں گم ہو گیا ہے؟ امیدوں سے بھرا میرا یہ بلا دا شام مایوسیوں اور ناامیدیوں کے
 پاتال میں گر پڑا ہے۔ دیکھیے تو یہ در دھونا کے شعروں میں کیسے در آیا ہے۔

ہش ہش

قدموں کی چاپ دروازے کی طرف بڑھتی ہے
 تالے کے سوراخ میں چابی گھومنے کی آواز
 کہیں خوشی و مسرت کا در کھلنے کی امید
 ہمیشہ رہنے والی تاریکی کو روشن کرنے کی آرزو
 نہیں نہیں

ارد گرد و صرف تاریک سائے منڈلاتے ہیں
 دروازے کے سوراخوں سے ہوا سیٹیاں بجاتی ہے

خاموش دروازہ بند رہتا ہے
اپنی افسردگی کو گلے سے لگائے
کھلنے کا خواب دیکھتے ہوئے

دُشَق کے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے میرا دل دُکھ اور یاس سے بھر جاتا
ہے۔ ہر کوئی ملک سے بھاگ رہا ہے۔ آپ باہر نکلتے ہیں خوبصورت گھروں کے دروازے
بند ہیں، کھڑکیاں بند ہیں۔

میں رک جاتی ہوں۔ دروازے جیسے مجھے کہتے ہیں ہم اپنے مکینوں کا انتظار
کر رہے ہیں۔ وہ کب واپس آئیں گے؟

ضروریات زندگی کی چیزیں بمشکل خرید کر ایک پارک میں تھوڑا سا سستانے کیلئے
آ بیٹھی ہوں۔ یہاں کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ بحث و مباحثے میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ اب
کس کی شیل بننے کی باری ہے۔

ان کا یہ کھیل مجھے میرے ان دنوں میں لے گیا ہے جب ہم بھی یہی کھیل کھیلتے
اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ اب کی کس کی باری ہے۔ چڑیل، جادوگر یا سپاہی بننے
کی۔ لیکن یہ شیل shell۔ میں بیک وقت اُداس اور پریشان ہو گئی ہوں۔ پھر جیسے شیل
میرے تصور میں ابھرا ہے اور وہ اپنے موت کے سفر کا احوال بیان کرتا ہے۔

شیل کا سفر

جیسے شہابِ ناقب کے ٹوٹنے کا سفر
انہوں نے مجھے دور اور نزدیک مارنے کے لیے چنا
میں دیکھتا کولہ سا دُشَق کا چکر لگاتا ہوں
کہیں میناروں کہیں گھاٹیوں پر سے

اوپر اور نیچے
 مصروف لوگوں کو ادھر ادھر پھرتے دیکھتے
 خوش و غم بچے یہاں وہاں پھرتے
 جو نبی اچانک میں نیچے اترتا ہوں
 ایک زبردست جھٹکے کے تعاقب میں چینیں اور کراہیں
 اس کے بعد کیا ہوا
 میں نہیں جانتا

زار زار بہتے میرے آنسوؤں نے اُن ماموں کو دھندلا دیا ہے۔ جو میں گلیوں کی
 دیواروں پر لکھ دیکھتی ہوں۔ ان نوجوانوں کے نام جن کی ابھی شادیاں ہوئی تھیں۔ اُن کی
 دہنیں کہاں چلی گئی ہیں؟ کتنے بیٹے اور بیٹیاں اپنے والدین کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ جب وہ
 لکھتی ہے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک برسات ہے۔

شیلز shells چھتوں اور فرشوں پر بارش کی صورت برس رہے ہیں
 دیواروں پر مرنے والوں کے نام لکھے ہوئے ہیں
 دہنیں تو رات بھر میں ہی بیوہ ہو گئی ہیں
 بچے محاذ جنگ سے باپ کی واپسی کے منتظر ہیں
 جہاز طوفان کی مانند بمباری کر رہے ہیں
 کہیں بچے سکول بیگوں کے ساتھ
 کہیں لوگ شاپنگ بیگز کے ساتھ
 خون میں لٹھروے پڑے ہیں۔

29 دسمبر 2014 کو اس نے لکھا۔

لگتا ہے جیسے میں اپنے ہی شہر میں اجنبی ہوں۔

اجنبی

جس نے اپنے خوابوں کو

چوما اور شب بھر کہا

پھر انہیں ڈھانپ دیا

اور خاموشی سے رخصت کر دیا

اپنی زندگی سے چلتے ہوئے نکل گئی ہوں

اب اور اسی وقت سے

میں تو خود سے اجنبی بن گئی ہوں۔

میری بیٹی ابھی ایک ٹرپ سے واپس آئی ہے۔ غم زدہ ماحول کے باوجود وہ خوش

ہے اور مسکراتی ہے۔ وہ پرانے سٹیم انجن کے ساتھ اپنی دوستوں کے ہمراہ

برادہ Barada دریا کے کنارے کنارے منائے جانے والے اپنے ٹرپ کا احوال سناتی

ہے۔

میں اپنی بیٹی کی آنکھوں سے چھلکتی امید کی روشنی دیکھتی ہوں۔

میرے اس اداس شہر کے باسیوں میں سے وہ لوگ جو موت نہیں زندگی کے

دوسرے راستے کیلئے جدوجہد کرتے ہیں۔ اُس روشنی کو ان آنکھوں سے چھلکتے محسوس کرتی

ہوں۔

ہم ہیں

ہم بکھرے شکستہ خوابوں والی نسل

جوشیلیوں پر سوتی، جاگتی اور قہقہے لگاتی ہے

اِس نسل کا غم اور دکھ بس صرف اتنا
 کیا بجلی اور انٹرنیٹ جلد بحال ہوگا
 ہم وہ نسل جس کی خوشیاں چوری ہو گئی ہیں
 تاہم ہمارے نوجوان دل زندگی کیلئے ابھی بھی کشادہ ہیں
 ہم وہ نسل جو کبھی کسی دن کہیں گے
 ہم نے تاریکیوں سے جنگ کی اور اُسے کہیں دور دھکیل دیا
 عمیدی کی نظمیں اور یادداشتیں حکومت شام کی سرکاری سطح پر اُن بڑھکوں یا
 نظم و نسق کی ابتری کی یاد وہ کوئیوں کی قلعی کھولتی ہیں جو حکومت نے اپنا طرز عمل بنالیا ہے۔ تاہم
 اس کی نظمیں اگر ایک طرف اس کے دکھوں کا اظہار ہیں تو وہ ہیں وہ ہمارے لئے اس صبح کا
 بھی پیغام ہیں جو طویل اور تاریک رات کے بعد طلوع ہوگی۔ اور جو ہم جیسے مایوس اور ناامید
 لوگوں کے لئے ایک نوید ہے۔



بورس پاسترنک

رُوس کامایہ نازنوبل ایوارڈ یافتہ ناول نگار، شاعر،

موسیقار اور ترجمہ نگار

- "ڈاکٹر ڈاکو" جیسے شہرہ آفاق ناول کا خالق، عظیم شاعر، بڑا موسیقار اور بہترین ترجمہ نگار۔
- ذاتی اور سماجی رویوں سے حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات نے اُس کی شاعری کو بے حد توانا اور مقبول بنایا۔
- فطرت اس کی نظموں میں بارش اور برف کے راستوں سے اندر داخل ہوتی ہے۔
- وہ روی ہے۔ روں اُسے دنیا کے ہر تہیغے سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی عزت،
- ذلت، اس کا جینا، مرنا سب روں کے ساتھ ہے۔

میں دروازے پر کھڑا اس کوشش میں ہوں
 کہ جس میچ پر مجھے اب نمودار ہونا ہے
 میری شکایات زیر لب ہی رہیں
 میرے شکوے میرے ہونٹوں میں ہی رہیں
 کہ میرے دماغی خانے میں محفوظ
 میرے آنے والے سالوں کی
 دریافت کی کونج اپنا دم توڑ رہی ہیں
 رات کی تاریکی اپنے سینکڑوں خوفناک منظروں کے ساتھ
 میرے اوپر نظریں گاڑے بیٹھی ہے
 میں تمہارے ان منصوبوں کے مقابل بہت ثابت قدم ہوں
 اور اپنا کردار ادا کرنے کیلئے بہت مطمئن بھی ہوں
 لیکن اور ڈرامہ تشکیل دیا جا رہا ہے
 اس بات تو مجھے اس سے نکال ہی دو
 لیکن جو کیا جانا ہے وہ تو طے ہے
 مگر انجا متوہاتھ سے نکلے ہوئے تیر کی مانند ہے
 میں تنہا ہوں اور میرے گرد جھوٹ کے ڈرون ہیں

بورس پاسٹرک

گیارہ جون کی شب دو بجے میری دوست اور میں پیئرز برگ میں نیوا کے ساحلوں پر کھڑی گل رنگ شفق کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کے اُن ٹولوں کو بھی دیکھ رہی تھیں جو پیئرز برگ کی "سفید راتوں" کو منانے کیلئے یہاں آئے ہوئے موجِ مستی کی سی کیفیت میں گٹار پر گیت گارہے تھے۔ روسی زبان میں یہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا مگر زندہ دلوں کی شوخیاں تو "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" جیسے جذبوں کی غماز تھیں۔ ہم اُن کے قریب جا بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک نیا منظر سامنے نمودار ہوا۔ لندن سے آنے والا ایک ٹولہ انگریزی میں گیت گاتا، جھومتا، بل کھاتا گتار سے کھیلتا آیا۔ بڑا خوبصورت سا گیت تھا جس کے بار بار دہرائے جانے والے بول میری سمجھ میں آتے تھے کہ وزارتِ سیاحت کی جانب سے ملنے والے کتابچوں میں بورس پاسٹرک کی یہی نظم بر فباری کے حوالے سے درج تھی۔

دیوانوں کی طرح بدستی اس بر فباری میں

ہم گلا بوشنا ہو کا کھیل کھیلتے ہیں

اور اپنے ہی شور سے خود کو بہرہ کر لیتے ہیں

اپنی کم علمی کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ میں ہشکن کو اس طرح نہیں جانتی تھی جس طرح بورس پاسترنک میری آوائل بلوغت کی یادوں میں بحث کی صورت موجود تھا۔ میرے گھر میں میرے بہت پڑھے لکھے، صاحب علم ماموں نظریاتی طور پر دائیں بازو سے متاثر تھے۔ کارل مارکس، فریڈرک اینگلز Friedrich Engels اور لینن کا پرستار میرا خالو جس کا قبلہ و کعبہ ماسکو تھا۔ جب کبھی سب اکٹھے بیٹھتے تو دنیا میں رونما ہونے والے واقعات پر اُن کے تبصرے اور مباحثے کچھ انہی تناظر میں ہوتے۔ بحث مباحثے کبھی کبھی لڑائی جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر لیتے۔ کو ایسا کم کم ہی ہوتا۔

موسم کے اعتبار سے یہ بڑے بیٹھے سے دن تھے۔ سال غالباً 1958 کا ہی تھا۔ بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں سالانہ چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے تھے۔ کشادہ آنگن میدان کارزار کا سا روپ پیش کر رہا تھا۔ ہم آٹھویں، نویں اور ایف ایس سی میں پڑھنے والے کزنز کھڑے بیٹھے یہ تماشا دیکھتے اور سنتے تھے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھنے والی اوسط ذہانت کی لڑکی کے پلے خاک کچھ پڑنا تھا۔ اگر کچھ پڑا تو بس اتنا کہ کوہ قافوں والے ایک ملک نام جس کا غالباً روس۔ جس کے ایک لکھنے والے کو اس کے ناول پر اس کے ملک نے معتوب ٹھہرایا۔ امریکہ اور برطانیہ اُسے انعام دلانے کے آرزو مند اور اس کا ملک اُسے نکالنے کے درپے۔

قارئین میرے ذکر کردہ کرداروں کے حوالوں سے بخوبی جان چکے ہوں گے کہ کس کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں۔ میں اپنے ماموؤں کی گیمرس شخصیتوں سے متاثر

ہونے اور انہیں دل میں بٹھانے کے باوجود اُن سے کہیں نفرت بھی کرتی تھی کہ وہ خاندان اور ہمارے ماحول میں طبقاتی بُعد کا باعث تھے۔ کھڑے پہننے والے درویش سے خالو کو شخصی حوالے سے ناپسند کرتے ہوئے بھی اُن کی باتوں سے متاثر تھی۔ سودی ہمدردیاں کوہ قاف والے ملک کے ساتھ تھیں۔

کالج لائبریری میں جب "ڈاکٹر ڈاکو" کا ناول دیکھا تو اُسے گھرائی۔ اُر دو میڈیم والوں کی انگریزی کچھ اتنی اچھی تو ہوتی نہیں۔ مگر یہ کتاب تو بورس پاسترک کی تھی۔ اس کے ساتھ میری یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ سو پڑھا۔ ریگل سینما میں فلم لگی تو پہلا شو اور پہلا دن۔ میں نکٹ کھڑکی میں کھڑی دھکے کھاتی تھی۔

تو آج میں پاسترک کی اُسی سرزمین پر بیٹھی اُسے سُنتی تھی۔ رُوس آنے سے قبل میں نے پھسکن کے ساتھ ساتھ بورس پاسترک کی شاعری بھی پڑھی تھی اور یہ اُس کی بڑی خوبصورت نظم تھی۔

بورس پاسترک منفرد قلم کار، شہرہ آفاق ناول ڈاکٹر ڈاکو کا لکھاری، نوبل ایوارڈ یافتہ، ایک عظیم شاعر، جنونی ساموسیقار، بہترین ترجمہ نگار، انقلاب رُوس کا حامی مگر جو اپنے ہی نظریاتی لوگوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوا۔

پیدائش ایک صاحب ثروت یہودی گھرانے میں دس فروری 1890 میں ماسکو میں ہوئی۔ باپ لیونڈوچ Leonidovich کی پورپور میں فن رچا ہوا تھا۔ مستند مینٹر، بہترین مجسمہ ساز، مصور اور ماہر تعمیرات تھا۔ ماں روزا کف Roza Kaufman ماہر پیانو نواز تھی۔ اس کے والدین کا ادیبوں، دانشوروں، موسیقاروں اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے گہرا رشتہ تھا۔

خاندان لیونڈا لسانی کا بھی بہترین دوست تھا۔ اس کی کتابوں کے سرورق اور اندر

کی تصویر کشی باپ کرتا تھا۔ نومبر 1910 میں جب ٹالسٹائی گھر سے بھاگا اور Astapovo میں اسٹیشن ماسٹر کے گھر فوت ہو گیا۔ بورس کا والد اس کی بستر مرگ پر کی ڈرائنگ کرنے کیلئے گیا تو بورس اس کے ساتھ تھا۔ وہ سب لمبے اور واقعات اُس کی یادوں میں محفوظ ہوئے۔

1956 میں اپنے باپ کے کام بارے لکھے گئے مضامین میں وہ اپنے بچپن کی یادداشتوں کو آواز دیتا ہے۔ میرے قصورات کی بچکانہ ڈور کا سرا ہمیشہ ٹرین کنڈیکٹر کے ساتھ جانکرانا تھا۔ ریلوائی یونیفارم میں ملبوس وہ کبھی ریلوے پلیٹ فارم پر کسی کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا، مجھے ہانٹ کرتا۔ کبھی کچن دروازے پر جہاں سٹوڈ پرگلو اُبلتا، پارسلوں کے بنڈلوں کی پیکنگ ہوتی اور مہریں لگتیں۔ وہ ان مرحلوں کو دیکھتا اور ہدایات دیتا۔ بہت سالوں میں نے خود کو اسی روپ میں دیکھا تھا۔

وہ آرمی میں نہ جاسکا کہ کہیں گھوڑے سے گر گیا تھا اور ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ سرجری کے بعد ایک ٹانگ بڑی اور دوسری چھوٹی ہو گئی۔

کہا جاتا ہے اس کا پہلا پیار باپنی سے تھا۔ دوسرا موسیقی سے۔ موسیقی کی اُس نے پورے چھ سال تک تعلیم حاصل کی۔

یہاں 1959 میں اُس کی "I Remember" کی ایک تحریر بہت اہم ہے۔ میں چار سال کا تھا۔ جب ٹالسٹائی سے پہلی بار ملا۔ میری والدہ نے اُس کے اعزاز میں ایک کنسرٹ کا اہتمام کیا تھا۔ پاسٹر تک لکھتا ہے کہ جب ٹالسٹائی کے اعزاز میں خصوصی طور پر آلات موسیقی کی صرف ایک تانت کو بجایا گیا میں چونک اٹھا۔ ایک میٹھا سا تیز چھن والا درد مجھے اپنے سینے میں محسوس ہوا۔ یہ یقیناً میری موسیقی سے عشق کی ابتدا تھی۔

اگرچہ بورس موسیقی کو شاعری کے ہم پلہ ماننے سے انکار کرتا ہے تاہم حقیقت ہے

کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ بقول پلنک جس نے پاسترک کی موسیقی کا گہرا مطالعہ کیا ہے کا کہنا ہے کہ اس کی آوازوں کی رمزیت، الفاظ کی بندش، نر تال کا ملاپ اور دل کو چھو لینے والے پُر اثر لفظ ان سب کو بہت خوبصورت بناتے ہیں۔

اپنی ماسکوسیاحت کے دوران جب میں لیلینکا (Alinica) سٹریٹ کی سیر کرتی تھی۔ مجھے بورس پاسترک کی پہلی محبت یاد آئی تھی۔ ماسکو کے چائے کے امیر ترین تاجران جن کی تیل بھری ٹوپیاں انیسویں صدی تک بیٹوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اسی شاہراہ پر اُن کے کاروباری مراکز اور ملکی وغیر ملکی تاجروں کے زمین دو زخفیہ تجوری خانوں کی تفصیلات انیتا کور مجھے بتاتی تھی۔ ida wissotzkaya ایسے ہی ٹی مرچنٹ گھر گھرانے کی بیٹی تھی۔ جس کے آبا و اجداد کی جیبوں کو بھاری کرنے میں روس کا محنت کش طبقہ کسی نہ کسی انداز میں دن رات ہلکان ہو رہا تھا۔ نشلی آنکھوں والی ida wissotzkaya جسے بورس نے ہائی اسکول کی تیاری میں مدد دی تھی اور جس سے وہ محبت میں گرفتار ہوا تھا۔

مربرگ Marburg جرمنی میں دوبارہ ملاقات ہوئی کہ اُس کے والد کو ida کا پوٹریٹ بنانے کیلئے بلا یا گیا تھا۔ وہ بھی اُن دنوں مربرگ یونیورسٹی کا ہی طالب علم تھا۔ باپ کے ساتھ وہ بھی جاتا۔ مربرگ یونیورسٹی سے ہی اُس نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔

دونوں کے درمیان وعدے و وعید تو کچھ اتنے نہ ہوئے تاہم پسندیدگی کا واضح اشارہ ایذا کی جانب سے ضرور ملا۔ پہلی جنگ عظیم میں بورس واپس روس آ گیا۔ ida کیلئے پروپوزل بھیجا۔ بے حد دولت مند خاندان نے بہت بُرا منایا اور بیٹی کو مجبور کرتے ہوئے لعن طعن کی۔

”کچھ شرم کرو۔ ایسے کنگھے خاندان سے ماطہ جوڑنا چاہتی ہو۔“

انکار بڑا دلبرداشتہ سا تھا۔

1920 - 1918 سول وار کے دوران اُس نے باہر جانے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی جیسا کہ اُس وقت کے بے شمار لکھنے والے ملک چھوڑ گئے تھے۔ انقلاب سے محبت رکھنے کے باوجود اُس نے اُس طرز حکومت کو سخت ناپسند کیا جس میں سرخ فوجوں کا پیدا کردہ ڈر، خوف، دہشت اور بربریت کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی اشیاء کی کمیابی نے زندگی کو بہت مشکل اور تکلیف دہ بنا دیا تھا۔

شاعری اُس کی حسین چاہت تھی۔ کم عمری سے ہی وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ 1905 کے انقلاب پر اُس کی دو طویل نظموں نے بڑی دھوم مچائی۔ یہی وہ دور تھا جب وہ نثر کی طرف بھی متوجہ ہوا۔ کہانیاں بھی لکھیں۔ "آٹوباؤیو گرافی" اور "Luvers" کا بچپن بہت مقبول ہوئی۔

"Themes and Twin in the clouds" اور "variations" اُس کی جوانی کی شاعری ہے۔ یعنی یہی کوئی 1914 اور 1917 کے درمیانی وقتوں کی۔ جب وہ صرف چوبیس برس کا تھا۔ my sister, life بہت مشکل حالات میں چھپی۔ یہ 1922 کا زمانہ تھا۔ یہ روسی سوسائٹی میں بہت انقلابی ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کی شاعری پر بہترین کتابوں میں سے ایک سمجھی گئی۔ اس نے پاسترک کو نو جوانوں میں بہت مقبول بنا دیا۔ ہمیں ان میں انقلاب سے پہلے کے روس کی جھلک بھی ملتی ہے۔

اسی مجموعے کی ایک دلکش نظم The racing star ہے یہ نظم اُس لہجے کو بہت خوبصورتی سے قید کرتے ہوئے اُس کیفیت کو بیان کرتی ہے جب انیسویں صدی کے روسی شاعر الیگزینڈر پشکن نے "پیغمبر" لکھی تھی۔

اس نظم میں اُس نے اُن خوبصورتیوں کو دریافت کیا جسے اس سے پہلے نقادوں نے

قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔ یہ انداز اوپ مینڈل کی شاعری پر بھی اثر انداز ہوا۔ اُس کی ماسٹر ٹیس نظم "Rupture" بھی اسی مجموعے میں ہے۔ اس دور کی شاعری میں اُس پر Immanuel Kant کی فلاسفی، اس کے محبوب شعرا جن میں پشکن اور جرمن شعرا سرفہرست تھے کے اثر کے ساتھ ساتھ ہم 1917 کے انقلاب کی رُوح کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

1922 میں اس نے ایوگینیا Evgenia Lurye سے شادی کی جو آرٹ کے ایک بڑے دارے کی طالبہ تھی۔ اسی سال ایک بیٹا پیدا ہوا۔
 ”ریسنر Reissner کی یاد میں“ اُس کی ایکے مثل طویل نظم تیس سالہ کیمونسٹ لیڈر ریسنر کیلئے تھی جو چھوٹی سی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔ اس نے اُسے مقبولیت دینے کے ساتھ ساتھ اُس کے بارے میں اُس تاثر کو بھی زائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ انقلاب اور انقلابی لیڈروں سے ناامید ہو گیا ہے۔

تاہم ایک ٹھوس یہ حقیقت تھی کہ وہ نظام کے تہہ دبالا ہونے اور مار دھاڑ سے مایوس ہوا تھا۔ اُسے امید تھی کہ انقلاب عام آدمی کی زندگی میں تبدیلی لائے گا اُن خوابوں، اُن امیدوں کو کہیں تعبیر ملے گی جو زمانوں سے انہوں نے دیکھے تھے۔ آنے والے دنوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ غلط باتوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔

اپنی بہن جوزیفائن کو لکھتے ہوئے اُس نے اپنے دکھ کا اظہار کیا۔

”میں ولادی میر مایا کو دسکائے اور نکولائی سے تعلقات ختم کر رہا ہوں کہ انہوں نے ادب اور آرٹ کو کیمونسٹ پارٹی کی خواہشات اور ضروریات کے تابع کر دیا ہے۔ میرے لیے اُن کی دوستی کو خیر باد کہنا کستھردشوار اور تلکیف دہ ہے مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔“

یہ 1932 تھا جب اُس نے اپنی تحریر کو مزید آسان اور قابل فہم بنایا۔ نثر کی طرف توجہ کی۔ Safe conduct اور The Second Birth اُس دور کی بہترین نثری کتابیں شمار ہوئیں۔ اس کے کاکیشیائی حصوں میں اُس کے خیالات کا اظہار جس طرح ہوا وہ قابل فخر ہیں۔ ان کتابوں نے بیرون ملک اس کے اُن مداحوں کی تعداد میں اضافہ کیا جو کونست نہیں تھے۔

1932 میں ہی وہ ایک بار پھر محبت کا شکار ہوا۔ Zinaida Neigauz زیندا کپوزر کی بیوی تھی۔ یہ محبت اتنی شدید تھی اور دونوں اتنے جنونی ہو رہے تھے کہ ان کے لئے طلاقیں لینے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ پس دل کی مانی اور شادی کر لی۔ اِس دور میں وہ مسلسل اپنی نظموں کی نوک پلک سنوارنے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔ اُس نے اپنی شاعری کو ایک نہج پر نہیں چلایا۔ تبدیلیاں کرتا رہا۔ اپنے سائل کو سادہ اور دلکش بناتا رہا۔ ذاتی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، اپنی حساس طبیعت کے ہاتھوں ملنے والے دکھ اور مصائب، سماجی رویوں سے حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات بھی ان میں شامل ہوئے۔ وہ ان کوششوں اور پہلوؤں میں سانس کی طرح اُتر اور بہت نیچے تک اُترتا گیا۔

فطرت اُس کی نظموں کا بہت اہم موضوع ہے۔ وہ درختوں، بوٹوں، پتوں، شاخوں، گھاس، پھولوں، پھلوں نباتات اور جنگلی پودوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ فطرت اس کی نظموں میں کہیں بارش اور کہیں برفباری کے راستوں سے داخل ہوتی ہے۔ ایک ایک ٹرس کا کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی ہیروئن ہے۔ کہیں خوشبو بھیرتی ہے اور کہیں آکسیجن فراہم کرتی ہے۔

نقادوں کی رائے تھی کہ My sister life کی نظمیں ٹی بی کے مریضوں کیلئے

صحت کا پیغام ہیں۔ کہیں یہ آپ کو زندگی اور خوشی کے احساسات سے دوچار کرتی ہیں۔ کہیں یہ گنگنا نے پر مجبور کرتی ہیں۔

شاعرہ مارینا Marina کہتی ہے ہم نے فطرت کے متعلق لکھا ہے مگر پاسٹرک کو فطرت نے لکھا۔ اُس نے فطرت کی دنیا میں انسان کی جگہ کو بھی دریافت کیا ہے۔ اُس نے ہمیشہ کے روایتی کرداروں کو ریورس گنیر لگایا۔ یہاں ہم اُس کے انتہائی منفرد انداز دیکھتے ہیں وہ فطرت کو تحریک کرتے ہوئے اُسے اپنی گرفت میں لاتا ہے۔
اُس کی نظموں کے نمائندگی کس قدر انوکھے اور منفرد ہیں۔

"فروری سیاہی لوار آنسو بہاؤ"۔ "روتے ہوئے باغ"، "walts with a

"tear in it"، "حیرت سے نکتے پھول" " " کو نے جہاں سے چوراہے مڑتے ہیں۔"
اس کی شاہکار نظمیں جو موسم، جذبات اور دُکھوں کے امتزاج سے سج دھج کر صنفوں پر بکھرس۔ ذرا دیکھیں تو

"ایک خواب" "A dream"

کھر کی میں سے جھانکتی خزاں کو میں نے خواب میں دیکھا

اور تم

ہجوم میں گھرے، نشے میں چور متوالے

مجھے اُس شکرے کی طرح نظر آئے

جو سر اور کندھے جھکائے

قربان گاہ کی طرف جاتا ہو

اور

میرادل تمہاری کلائی پر بیٹھنے کیلئے بضد ہوا

winter night میں اس کے جذبات محسوس کریں

برف باری ہوتی رہی

ہوتی رہی

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک

برف نے سب کچھ چھپا دیا

بس میز پر ایک موم بتی جلتی رہی

جلتی رہی

دو ننھے منے سے جو تے فرش پر گرے

بہت بھدے سے انداز میں

مانٹ شیٹڈ پر جلتی موم بتی اپنے آنسو بہاتی رہی

ایک خوبصورت لباس پر

ایک اور خوبصورت نظم "فروری سیاہی لوار آنسو بہاؤ"

فروری سیاہی لوار آنسو بہاؤ

لکھو نا کہ تم سسکیاں بھر رہی ہو

بہار کا کیا پوچھتی ہو

وہ تو ابھی تک برف کے کچھڑ میں

دھنسی، جلتی اور آہیں بھرتی ہے

"A waltz with a tear in it" میں دیکھیے

ان پہلے چند دنوں میں

آہ میں اسے کتنا پیار کرتا ہوں

برف باری کے دن بیت گئے
 اس کی تازگی اور ہریالی جنگل جیسی ہونے والی ہے
 لیکن وہ بدنامی اُس کی ہر شاخ میں ابھی بھی موجود ہے
 مجھے انتظار ہے اُس وقت کا
 جب فکری شعاؤں کے دھاگے سے
 جیسے انہیں دھیرے دھیرے ہلائیں گے
 اور چیرے کے پھل دھیرے دھیرے چمکنے لگیں گے
 موسمِ بقی کی روشنی اور نیچے پتھی فکری چادر
 اس کے بدن اٹھنٹھوں کو ہماری نظروں سے چھپا لیں گے
 اسی نظم کا ایک اور بند دیکھیے۔

اُس کی قسمت تو صرف چند صنوبر کے درخت ہیں
 سنہری آگ کی سی رنگت اور تمازت لپیے ہوئے
 بلند یوں کی طرف اس کی اڑان ہوگی
 اُس عمر رسیدہ پیغمبر کی طرح
 جو آسمانوں کی طرف محورِ پرواز ہوتا ہے
 آہ میں اسے کتنا پیار کرتا ہوں
 ان کے پہلے چند دنوں میں
 میں اسے کتنا پیار کرتا ہوں
 جب ساری دنیا موجِ میلے میں مصروف ہوتی ہے۔

بنیادی طور پر وہ بہت مثبت اور رجائیت پسند تھا۔ امید اور نوید دیتا ہوا۔ ایک

خوبصورت شاعر اور لکھاری اُسکی Second Birth نثر کی کتاب میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ کہیں وہ بدلتے موسموں سے لطف اندوز ہوتا ہے، کہیں زندگی اور موت کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ اُس کی شاعری محبت کے آفاقی جذبوں کی تہوں میں اترتی، سوال و جواب کرتی، برائی اور برے رویوں اور کہیں خدا کے ساتھ تجدید تعلقات کے مرحلوں سے اپنے قاری کو بہت حسن و خوبی سے گزارتی ہے۔

On Early Trains میں بھی اُس کا یہ اثر برقرار رہا۔

سٹالن کی ہجو کا بھی قصہ بڑا دلچسپ ہے۔

یوں تو 1929 سے ہی سٹالن cpsu کا مستند لیڈر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ بورس پارٹی اور سٹالن سے مزید متنفر ہو گیا تھا۔ انہی دنوں اوسپ مینڈل نے سٹالن پر سخت طنزیہ نظم لکھی۔ قابل بھروسہ دوست اکٹھے ہوئے۔ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے سبھی بند کیے گئے حتیٰ کہ روشن دان بھی۔ مینڈل نے مدھم سی آواز میں پڑھنی شروع کی۔

ہم زندہ ضرور ہیں مگر

اُس دھرتی بارے سوچتے نہیں

جہاں ہم رہ رہے ہیں

کچھ دس قدم پرے یا نزدیک

تم سن ہی نہیں سکتے ہو

جو ہم کہتے ہیں

لیکن اگر لوگ موقع پر بات کریں

تو وہ کریملن کا کیشین کے بارے ہی ہوگی

اس کی موٹی انگلیاں بھڑکی ہیں

اور بھسنے والی مچھلی کی طرح پلے ہوئی
 موزوں لفظوں کی تلاش اتنی مشکل
 جتنے بھاری وزن دار پتھر
 اُس کا کروچ کی مونچھیں بہت ڈراؤنی ہیں
 بوٹوں کا اپر چمکتا اور چھب دار ہے
 لیکن گردا گرد چھوٹی اور موٹی گردنوں والے
 خوشامدی ٹٹو اور پٹھو ہیں
 یہی اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں
 کچھ تو سیٹیاں بجاتے
 کچھ میاؤں میاؤں کرتے
 اور کچھ سوس سوس کرتے ہیں
 وہ اکیلا
 گر جتا، غل در معقولات کرتا
 اور کش لگاتا
 اپنے ہی اصولوں کو توڑتا
 حکومتی فرمانوں کو سموں تلے روندتا
 اپنے چڑوں، اپنے ماتھے
 اپنی آنکھوں اور بھینوؤں میں
 ہر قتل پر خوش ہوتا
 نظم سننے کے بعد بورس نے بے اختیار کہا۔

”مینڈل تم نے کیا لکھ ڈالا؟ ہمارے جذبات کا اتنا حقیقی ترجمان۔“ پھر وہ خوف سے لبریز آواز میں بولا۔

”مینڈل تم سمجھو تم نے کچھ نہیں سنایا اور ہم نے کچھ نہیں سنا۔ تم جانتے ہو بہت ظالمانہ چیزیں ہو رہی ہیں۔ لوگوں کو ان کا جرم بتائے بغیر اٹھالیا جاتا ہے۔ دیکھو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اور کچھ پتہ نہیں کب کیا کیا کہانیاں بن جائیں؟ بس سمجھو تم نے کچھ نہیں سنایا۔“

بوس بھول گیا تھا کہ شاعری خوشبو کی طرح ہوتی ہے جسے دیواروں، بند دروازوں میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کوچہ کوچہ قریہ قریہ سفر کرتی کریملن پہنچ گئی تھی۔

مینڈل کو گرفتار کر لیا گیا۔ بوس سخت پریشان۔ ایک گرفتاری دوسرے یہ ڈر کہ کہیں اُس پر بے وفائی کا الزام نہ لگ جائے۔ سارے شہر میں وہ بھاگا بھاگا پھرا۔ اپنے بارے میں وضاحتیں دیتا ہوا کہ اُس نے تو کوئی بات نہیں کی تھی۔

ایسے ہی صبر آزما دنوں میں اُس کے اپارٹمنٹ میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے کہا۔

”کامریڈ سٹالن تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ پاسترک تو گنگ سا ہو گیا ایسی صورت کا سامنا تو اس کے کہیں گمان تک میں نہ تھا۔

ایک آواز ماؤ تھ پیس میں سے ابھری۔ سٹالن کی آواز، ایک جامد اور ظالم حکمران کی آواز۔ رعب اور کرختگی سے بھری ہوئی آواز۔

پاسترک کی آواز میں گھبراہٹ، جھجک اور احمقانہ پن تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اُس نے کہا کہ اس کے او مینڈل کے خیالات میں بہت اختلاف ہے۔

ایسا ثابت کرنے میں اُس نے فضول وقت ضائع کیا۔ سٹالن نے اُس سے ادبی

حلقوں میں مینڈل کی گرفتاری کا ردِ عمل جاننا چاہا۔ اور یہ کہ اُس کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

مینڈل حواس باختہ سا تھا اوسان تو اڑے ہوئے ہی تھے۔ فوراً ہی انکار کرتے ہوئے بولا ”کہ اب ماسکو میں ایسے سٹڈی سرکلز کہاں رہے ہیں؟“
 سٹالن نے ایک تمسخرانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے وہ ایک کامریڈ سے بات نہیں کر سکتا فون بند کر دیا۔

بہت سالوں بعد اپنے اُس وقت کے جذبات و احساسات پر اُس نے لکھا کہ وہ سخت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ جب اُس کے اوسان بحال ہوئے۔ اُس نے دوبارہ رابطے کی کوشش کی کہ وہ اُسے بتائے کہ وہ بہت غلطیاں اور زیادتیاں کر رہا ہے مگر کریملن سے ایک ہی جواب تھا۔

”کامریڈ سٹالن بہت مصروف ہیں۔“

حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا بچھڑتا وہ ختم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ بعد میں اُس نے لمبا چوڑا خط بھی سٹالن کو لکھا۔ اُسے ہمیشہ اس بات کا تا سَف رہا کہ وہ صورت حال کو مینڈل کرنے میں بہت بُری طرح ناکام رہا۔

دوسری جنگ عظیم میں جب مازی جرمنی اور سوویت یونین میں جنگ چھڑ گئی۔ ماسکو میں برِ فباری کی طرح کی بمباری شروع ہو گئی تھی۔ پاسٹرک فوراً رائز بلڈنگ جو Lavrushisk st میں تھی کی چھت پر فائر وارڈن کی خدمات سرانجام دینے لگا۔ اُس نے بہت بار ایسے بہت سے بموں کو تلف کیا جو وہاں گرے اور پھٹے نہیں۔ فتح کے بعد سٹالن کے مظالم پر اُس نے ایک بار پھر لکھا کہ جنگ کی تباہ کاریاں۔ یقیناً اُس سے بہت کم تھیں جو سٹالن نے رُوسیوں پر کیں۔

یہ 1946 کے دن تھے جب پاسترک Olga ivinskaya اولگا اونسکایا سے ملا۔ سنگل مدرجہ نوا میر Novy Mir کے ہاں ملازم تھی۔ عجیب سی بات تھی کہ اُس کی غیر معمولی مشابہت پاسترک کی پہلی محبوبہ ایڈا کے ساتھ تھی جس کی محبت ابھی بھی کہیں بورس کے دل میں تھی۔

اُس نے اپنی شاعری کے بہت سے والیوم اور نثر میں بہت سے تراجم اُسے پڑھنے کو دیئے۔ یہ عجیب سی محبت تھی۔ نہ اُس نے اپنی بیوی کو چھوڑا اور اولگا کے ساتھ بھی شادی جیسے تعلقات قائم کر لیے۔ جو اُس کی زندگی کی آخری سانسوں تک رہے۔ وہ روز اُسے فون کرتا۔ تھوڑا خوف زدہ بھی رہتا پر اُس کی رفاقت کیلئے مرا بھی جاتا۔ اولگا اونسکایا اپنی یادداشتوں میں جھانکتے ہوئے کہتی ہے۔ کبھی میں ہکلاتے ہکلاتے ہوئے کہتی۔

”سنو آج میں بہت مصروف ہوں۔ کام کا بہت بوجھ ہے۔ اُسے پنپانا ہے مجھے۔“

لیکن ہوتا کیا؟ ہر سہ پہر کام کے خاتمے پر وہ بذات خود میرے دفتر میں آ جاتا۔ ساتھ ساتھ پیدل چلتے مین بلیو وارڈ کی شاہراہوں پر نکل پڑتا۔ کبھی کبھی ہنستے ہوئے کہتا۔

”جی چاہتا ہے یہ سکواڑ تمہیں تحفے میں دے دوں۔“

میں ہنس پڑتی۔ اُس کی سادگی پر۔ محبت بھرے جذبے کی شدت احساس پر، معصومانہ سے انداز میں اظہار پر۔ یہ تعلق بڑا مسرور کن تھا۔ اولگا نے اپنی ہمسائی کا نمبر اُسے دے رکھا تھا۔ ہمسائی راز دار بھی تھی۔ جب رات کو فون آتا وہ پانی کا آہنی پائپ بجاتی جو دونوں گھروں کے درمیان تھا۔

اولگا مزید لکھتی ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ ملے تھے بورس اُس وقت ہنگری کے قومی شاعر سندور Sandor Petofi کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اولگا کو اس کی ٹرانسلیشن دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

”یہ میرے جذبات کے صبح عکاس ہیں جو میں تمہارے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ تم انہیں پڑھو گی تو میں اور میرے جذبات دونوں کی ترجمانی ہو جائے گی۔“
 اِس تعلق اور محبت کے بارے میں بورس کی بیوی کو پتہ چل جانے پر اُس کے ردِ عمل پر اولگا کا کہنا تھا کہ اُسے اپنے شوہر کی بے وفائی پر سخت غصہ اور رنج تھا۔ ایک بار جب اُن کا چھوٹا بیٹا سخت بیمار ہو گیا۔ بیمار بچے کے بیڈ کے قریب کھڑے اُس نے اپنے شوہر سے وعدہ لیا کہ وہ میرے ساتھ اپنے ہر تعلق کو ختم کر لے گا۔

اسی دوران میں سخت بیمار ہو گئی۔ اتنی شدید کہ وہ جو مجھے لعن طعن کرنے آئی تھی اُسے اور میری ہمسائی دونوں کو مجھے اسپتال لیجانا پڑا۔ میں اُس جیسی اُونچی، لمبی مضبوط جسم اور دماغ والی عورت کو دیکھتی رہی جس نے میرے بہتر ہونے پر مجھے بتایا کہ اُسے بورس سے محبت نہیں رہی تاہم وہ اپنے گھر کو ہرگز توڑنا نہیں چاہتی ہے۔

میرے صحت یاب ہونے پر بورس ہمارے گھر آیا۔ اس کے انداز میں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ میری والدہ سے پرسکون انداز میں باتیں کرتا اور اُسے یہ بتاتا رہا کہ وہ مجھے کتنا پیار کرتا ہے؟ اُس کے جانے کے بعد میں بھی اس کی ان باتوں پر دیر تک ہنستی رہی۔

1948 میں پاسترک نے اولگا اونسکایا کو نووا میر Novy Mir کی ملازمت چھوڑنے کا کہا۔ ملازمت ان کے تعلقات کیلئے عذاب منقہ جاری تھی۔ Potapov st پر انہوں نے ہماری "ڈکان" کے نام سے ایک اپارٹمنٹ لیا اور ترجمے کا کام ذرا وسیع بنانے پر شروع کر دیا۔

یہاں اولگا اونسکایا کی ایک تحریر اُس کے طرز کار پر روشنی ڈالتی ہے۔

ہم ہندوستانی بنگالی شاعر راہندر ناتھ ٹیگور کی نظموں کو روسی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا تھا وہ لفظوں کے پیچھے نہیں بھاگتا تھا۔ دہلی چاشنی میں انہیں ڈبوتا۔ کبھی ساری ٹرانسلیشن نہ کرتا۔ رس نکالتا اور پھوک پھینک دیتا۔

یہ 1949 کی ایک سرد شام تھی۔ جب اولگا اونسکایا کو کے جی بی نے گرفتار کیا۔ وہ اپنی یادداشتوں میں اس خوفناک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ جب ایکٹوٹوں کا ڈھیر اس کے اپارٹمنٹ پر حملہ آور ہوا۔ وہ اس وقت ٹائپ رائٹر پر بیٹھی کورین شاعر Won Tu. Son کا ترجمہ کر رہی تھی۔

پاسٹرنک سے متعلق سارا کام انہوں نے اکٹھا کر کے سمیٹا اور مجھے Lubyanka جیل میں لے گئے۔ مجھ سے ہارباہر بورس اور اس کی سرگرمیوں بات پوچھا جاتا۔ میں نے ہارباہر اٹکا کر کیا۔ اُس وقت میں بورس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور میرا وہ بچہ بھی جیلوں کی ان ہی اذیتوں میں ضائع ہو گیا۔

یہاں لیو ساپوپورا Liuisa Popora دونوں کی مشترکہ دوست کی تحریر ہمیں وہ تصویر دکھاتی ہے کہ بورس نے اس صورت کا سامنا کیسے کیا؟ اپنی محبوبہ کی گرفتاری کا سنتے ہی اُس نے لیو ساپوپورا کو فون کیا اور فوراً کوکول بلیوارڈ میں آ گیا۔ جب وہ وہاں پہنچی اس نے دیکھا تھا۔ وہ ایک بیٹج پر بیٹھا زار زار روتا تھا۔ پاسٹرنک کے لہجے میں کیسا یاس گھلا ہوا تھا جب اُس نے کہا۔

”میرا تو سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ وہ میری متاع حیات کو لے گئے ہیں۔ میں اُسے کبھی دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔ اف میرے لیے یہ سب برداشت کرنا موت سے بھی زیادہ بدتر ہے۔“

یہاں ہمیں اُس کا مغربی جرمنی میں اپنے دوست کو لکھا ہوا خط بھی اُس کے جذبات کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

دیکھو وہ میرے لیے اور صرف میرے لیے جیل بھیجی گئی۔ سیکرٹ پولیس کو علم تھا کہ وہ میرے بہت قریب ہے۔ انہوں نے میرے بارے جاننے کیلئے اُسے اذیتوں کی کس بھیٹی میں جلایا مگر اُس کے بند ہونٹ ایک لفظ بولنے کیلئے نہیں کھلے۔ میری زندگی اُسی کی مرہون منت ہے کہ وہ مجھے ہاتھ تک نہیں لگا سکے۔ میں اُس کے صبر، اسکی برداشت، اسکی محبت کا کتنا مقروض ہوں کوئی نہیں جان سکتا۔

یہاں اولگ کی بھی ایک تحریر اُس کی شخصیت پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ میری قید کے دوران اُس نے سالن کو ہمیشہ قاتل کا ہی درجہ دیا۔ ادبی حلقوں، رسائل و جرائد اور اخباروں کے دفاتر میں لوگوں سے باتیں کرتے تکرار کیے چلا جاتا۔

”یہ خوشامدی، یہ درباری کا سہ لیس یہ جو دندنا تے پھرتے ہیں۔ انسانی لاشوں پر اپنی خواہشات کے محل بناتے ہیں۔ کب؟ کب کوئی انہیں نکیل ڈالے گا۔“

Akhmatova کے ساتھ اُس کا اچھا وقت گزرا اور اُس نے ڈاکٹر ژواکو کے دوسرے حصے پر تنقید کی سے کام کیا۔

اُنسکا یا کے تعلقات رہا ہونے کے بعد پاسترک سے اسی طرح دوبارہ جڑے جیسے ماضی میں تھے۔ وہ ماضی کی طرح ایک بار پھر اس کے حصار میں تھا۔

اس دوران پاسترک نے جارج آرویل کی Animal Farm انگریزی میں پڑھی اور لطف اٹھایا۔

ڈاکٹر ژواکو کے کچھ کلڑے 1920 - 1910 میں لکھے گئے مگر درحقیقت یہ کتاب 1956 سے پہلے مکمل نہ ہو سکی۔ اسے چھپنے کیلئے نوا میر کو دیا گیا جس نے چھاپنے

سے انکار کر دیا کہ کتاب سوشلزم کی سچائی سے انکاری تھی۔ اس کے ہیر و پوری ثروا کو کے ہاں انفرادی فلاح کی بہتری کا پہلو زیادہ اہم تھا بہ نسبت سوسائٹی کی ترقی کے۔ سنر دالوں اور تنقید نگاروں نے بھی اس کے کچھ پیرا گراف کو اینٹی سوویت کہا۔ اینٹی سٹالنزم اور "معاشرے کی صفائی" پر بھی تنقید تھی۔ ناپسندیدہ لوگوں کو پارٹی سے نکالنے پر بھی بہت لعن طعن کا اظہار تھا۔ انہی دنوں اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کے متعین کردہ نوجوان جرنلسٹ مسٹر میوڈی اینگلو جو سوویت کے سماجی اور ثقافتی حلقوں میں خاصا مقبول ہو رہا تھا اور جس کا میلان کے ایک پبلیشر سے کمیشن بھی طے تھا کہ وہ روسی لکھاریوں کے نئے مسودے حاصل کرے کہ جو مغربی قارئین کیلئے دلچسپی کا باعث ہوں۔

شہر میں ڈاکٹر ثروا کو کے بارے میں مختلف آراء کی گردش نے اُسے فوراً متوجہ کیا اور وہ پیریڈکونو Peredelkino پہنچا جہاں پاسترک اپنے ڈاچے میں مقیم تھا۔ اُس نے ناول کو اشاعت کیلئے Feltrinelli کمپنی کی پیشکش کی۔ پاسترک پہلے تو ایک دم سراپیمہ سا ہو گیا۔ پھر وہ اٹھا اپنی سٹڈی روم سے مسودہ لاتے ہوئے "مجلوڈی سے بولا۔

"تو تم نے مجھے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا ہونے کی دعوت دے دی ہے۔"

یہاں ہمیں لیزر فلیش مین کے بیانات سے مزید رہنمائی ملتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاسترک کو احساس تھا کہ وہ ایک بڑا خطرہ مول لے رہا ہے۔ ایک بھی ایسی مثال نہیں تھی کہ جہاں کسی روسی مصنف نے کسی مغربی پبلیشر سے 1920 سے لے کر اب تک کوئی ڈیل کی ہو۔ اب طوفان تو متوقع تھا۔ تاہم پاسترک کھوڑی سی یہ بھی امید تھی کہ فلٹرینیلی پبلیشنگ ہاؤس کی کموزم سے وابستگی اور تعلق شاید سوویت سٹیٹ کو نہ صرف اجازت بلکہ شائع کرنے پر بھی مجبور کرے۔

تاہم جب معاہدہ ہو رہا تھا اُس کے ہر ہر لمحے میں پاسترک کی زندگی کی دونوں

اہم عورتیں اُس کی بیوی زہرا اور محبوبہ اولگا اونسکا یا خوف زدہ تھیں۔ پاسترک البتہ حوصلے میں تھا۔ اس نے دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ ناول کی اشاعت کیلئے ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو ایک اچھے ناول سے محروم کر دینا زیادتی نہیں جرم تھا۔ یہاں فلٹرینیلی پبلیشنگ ہاؤس کو بھی خراج پیش کرنا پڑے گا کہ انہوں نے سوویت کے ہر دباؤ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ سوویت گورنمنٹ نے پاسترک پر بھی دباؤ ڈالا کہ مسودہ واپس منگوائے مگر اس نے اندر خانے پیغامات سے کہا کہ حکومت کے ہر دباؤ کو نظر انداز کیا جائے۔

ناول کے خلاف ایک مسلسل مہم چلانے کے باوجود ڈاکٹر ژواکو غیر کمیونسٹ دنیا میں اپنی اشاعت پر بے حد سنجیدگی سے خیز واقعہ ثابت ہوئی۔ اسرائیلی ریاست میں بھی تاہم اس ناول پر سخت تنقید ہوئی۔ یہودیوں سے متعلق اس کے خیالات و نظریات کھرے، سچے اور متاثر کن تھے۔ پاسترک نے اعتراضات پر صاف کوئی سے کہا۔

”میں تو مذہب، قبائل اور نسل پر ایمان ہی نہیں رکھتا۔“

یہاں ہمارے سامنے فلیٹین مین کا ایک بیان ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت پاسترک بہت باقاعدگی سے ایسی عبادت گاہوں میں حاضری دینے لگا تھا جہاں عبادت مردہ طریقوں کی بجائے لبرل طریقوں سے ہوتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ روسی یہودیوں کیلئے سالن ازم اور دہریے بننے کی بجائے عیسائی بننا زیادہ بہتر ہے۔

ژواکو کا پہلا انگریزی ترجمہ بہت جلدی میں ہوا۔ 1958 میں یہ منظر عام پر آگیا اور پچاس سال سے زیادہ عرصے تک یہی رہا۔ کتاب بیٹ سیلر کے طور پر لسٹ پر رہی۔ اونسکا کی بیٹی بھی اس کتاب کی ٹائپ شدہ کاپیاں بانٹنے میں سرگرم رہی۔ یہ بڑی پرکٹف سی بات تھی کہ سوویت نقادوں نے مین کردہ ناول نہیں پڑھا۔ پھر بھی پریس میں یہ

سرگرم موضوع رہا۔ ایک لطیفہ بھی زبان زد عام ہوا۔

”اگرچہ میں نے پاسترنک کو نہیں پڑھا۔ مگر اس کی مذمت کرتا ہوں۔“

مصنف کو اندرون اور بیرون ملک اپنی آخری زندگی تک بے شمار ایسے خطوط ملتے رہے جس میں کتاب پر اچھے برے تبصرے ہوئے۔ اس ضمن میں اس کی ایک دوست Ekaterina Krashennikova کا خط ہمارے سامنے ہے۔ جس میں وہ لکھتی ہے۔

”پاسترنک مت بھلو یہ بات کہ تم نے یہ کام کیا۔ یہ تو روی لوگ ہیں۔ یہ تو ان کے مصائب اور ان کے دکھ ہیں جنہوں نے تم سے یہ کام کروایا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمہارے قلم کو یہ طاقت دی۔ ہاں میں یہ ضرور کہوں گی کہ تمہارا کمیکل فیکٹری میں کام کرنے کا تجربہ تمہیں مالا مال کر گیا۔“

ناول نے چونکہ بین الاقوامی سطح پر بہترین پڑھی اور لکھنے والی کتاب کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اب استعماری طاقتوں کو بھی سیاست کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ برٹش ایم 16 اور امریکی سی آئی اے نے اسے نوبل پرائز دلوانے کی مہم جوئی شروع کر دی تھی۔ ایسا اس لیے بھی کیا جا رہا تھا کہ ظاہر تھا پاسترنک کو نوبل ایوارڈ کا ملنا سوویت یونین کے وقار اور معتبریت کو نقصان پہنچانے کا موجب بنتا۔ دونوں بڑی طاقتیں سرگرمی سے اس پر عمل پیرا تھیں۔

23 اکتوبر 1958 کو ادبی ایوارڈ بورس کو دینے کا اعلان ہوا۔ پچیس اکتوبر کو بورس نے سویڈش اکیڈمی کو شکریے کا تار بھیجا۔ اس میں حیرت، خوشی و مسرت اور فخر کے سے جذبات کا اظہار تھا۔

یہی وہ دن تھا جب ماسکو کے ادبی حلقوں نے اپنے تمام طلبہ سے ایک مطالبہ کیا

کہ وہ سب ایک مظاہرہ کرنے کا اہتمام کریں جس میں اُسکا نہ صرف ایوارڈ سے انکار بلکہ یہ مطالبہ بھی کہ بورس کو جلا وطن کیا جائے۔ اسی پر اکتفا نہ ہوا۔ اس مہم جوئی کو حکومتی سطح پر دہرایا جانے لگا۔

صورت ایسی گھمبیر اور کشیدہ ہو گئی کہ اُس نے پریشان ہو کر ایک دوسرا تار بھیجا۔ انکار کا، اپنی مجبوری کا۔

تاہم سویڈش اکیڈمی نے اعلان کیا۔ یہ انکار ایوارڈ پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوگا۔ یہ سویڈش اکیڈمی کے پاس رہے گا۔ ہاں اس کی تقریب نہیں ہوگی۔ اس سب کے باوجود سودیت کے لکھاریوں نے پاسترک کو ملا مت کرنا نہ چھوڑا۔

وہ لکھتا رہا۔ لکھتا رہا۔ When the weather clears جیسا شاہکار اُس کے اسی آخری دو کی یادگار ہے۔ شاعری کا ایک لا جواب مجموعہ۔

پچھڑوں کے کینسر میں مبتلا ہو کر اذیتیں سہتا، اپنے دکھوں پر کڑھتا وہ 30 مئی 1960 کو اپنے ڈاچا میں فوت ہو گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ 1930 کی کیمونسٹ حکومت نے اُس کی شاعری کو زندہ درگور کر دیا۔ ایک طویل تاریکی کا دور۔ جہاں وہ ترجمے جیسے کاموں سے زندگی کو گھسیٹتا رہا تھا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ انقلاب کے ساتھ رد انقلاب کا لاحقہ بھی جڑا ہوتا ہے۔ شاعروں، مصنفوں، موسیقاروں اور فنون لطیفہ کے ماہروں نے اکتوبر انقلاب کی آبیاری اپنے خون سے کی۔ ٹراٹسکی، میکسم گورکی، مایا کوفسکی۔

لیکن وہ جو انقلاب میں کہیں عقبی سیٹوں پر تھے، ماقابل اعتبار تھے۔ فرنٹ لائن پر آگئے اور شاعر کی اس شعر کی تفسیر بن گئے۔

”منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔“

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اپنے ملک کی تاریخ چھوٹی بڑی جزئیات کے ساتھ میرے سامنے آگئی تھی۔

اور پھر وہ تاریخ کا آگے بڑھا ہوا پہیہ گھما کر اُسے وہیں لے جاتے ہیں جہاں سے وہ شروع ہوا تھا۔ ”انقلاب کے نقیب“ کا خطاب پانے والا مایا کوفسکی جیسا شاعر اور ڈرامہ نگار نہ سٹالن سے ہضم ہو رہا تھا نہ اُس کی بیوروکریسی سے۔ 1930ء میں اُس کی خودکشی اِس نوکر شاہی کے خلاف بڑا واضح احتجاج تھی۔

ٹراٹسکی جیسے دانشور کو سٹالن کے ایجنٹ رامون مرکیڈور نے 1940ء میں میکسیکو میں قتل کروا دیا اور 1960ء میں اُسے سیاسیات پر لینن ایوارڈ سے نوازا گیا۔

عظیم شاعر اوسپ مینڈل کا بھی یہی حشر ہوا۔

شوستا کووچ کی چھٹی سمفنی پر سٹالن نے خود پابندی لگائی۔

بوس پاسٹرک نے خودکشی تو نہ کی۔ پر زندگی کی تلخیوں نے اُسے پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا کر دیا تھا۔ 1858ء میں سویڈن نے جب ڈاکٹر ڈاکو پر اُسے نوٹیل پرائز دیا۔ اُس نے خوشی کا اظہار کیا کیا۔ جیسے اُس کے خلاف نفرت کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ اُسے غذا رکھا جانے لگا۔ الزامات اور اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ملک بدری پر اصرار ہوا۔

ہندوستان اور پاکستان کے اہل قلم آنکھوں کے سامنے آگئے تھے۔

میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں کیونکہ اس کی اپیل مجھے یاد آئی تھی صدر مملکت کے

نام۔

”کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے کہ روس میرے لئے کیا ہے؟ میرا کام میرا نام میری عزت اور موت سب روس سے ہیں۔ مجھے کسی نوٹیل پرائز کی نہیں صرف اپنے وطن کی

ضرورت ہے۔ میرا وطن رُوس۔“

اور نو بیلی پر انز لینے سے اُس کا انکار ہوا۔

اور آنسوؤں کی بو چھاڑتھی جو میرے گالوں پر بہہ رہی تھی۔ اُسے اتنی تاویلیں دینے کی ضرورت تھی۔ ہائے یہ اہل اقتدار۔

اُس کی موت پر ایک بڑے ہجوم کے سامنے باوجود حکومتی ڈر اور خوف کے ایک نوجوان نے اونچی اور غصیلی آواز میں اُس کی بین شدہ ممہملت Hamlet پڑھی۔

پھر ایک بڑے مقرر نے اپنی آواز کی پوری طاقت سے قبرستان میں مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

خدا کے مازدلو کوں کے راستے کانٹوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ پاسترک کو بھی خدا نے منتخب کیا۔ وہ ابدیت پر ایمان رکھنے والا سچا اور کھرا انسان تھا۔ ہم نے نالٹائی پر لعن طعن کی۔ ہم نے دوستوں کی کو دھتکارا اور اب ہم پاسترک کو بھی اسی سولی پر چڑھا رہے ہیں۔ ہر وہ چیز جو ہمارے لیے عزت اور شہرت لاتی ہے۔ ہم اسے مغرب کے حوالے سے بین کرتے ہیں۔ لیکن اب ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔

اُس کی آواز بھڑا گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ اور جب اس نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا اس کا لہجہ جوش و جذبے سے لبریز تھا۔

”ہم پاسترک سے پیار کرتے ہیں۔ اور ہم اس کا ایک عظیم شاعر، ایک عظیم مصنف کے طور پر اعتراف کرتے ہیں۔ پاسترک ہمیشہ ہمارے دلوں میں اور اپنے قارئین کے دلوں میں زندہ رہے گا۔“



الگزينڈر ڀشڪن

رُوس كا بے بدل عظيم قومی شاعر الگزينڈر ڀشڪن

- ایوگے فی انے گن Eugene onegin رزمیہ شاعری کے منکوم ناول اور طویل بیانیہ نظم ”زسلاں اور لڈ میلا“ نے روسی شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے سجا کر دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا۔
- باغیچہ سرانے The Fountain of Bakhchisarai کی طویل نظم حرم کی عورتوں کی زندگی، ان کے نفسیاتی و جذباتی مسائل، خواہہ سراؤں کے کردار، سلطان کے حرم کے اندر زندگی گزارنے کا ڈھنگ، تاریکی اور اُن گیتوں کے کرداروں کی دلا آویزاں اور دل کش تصویر ہے۔
- اُس کی شاعری کے حسن میں نئے رنگ بھرنے میں اُن ذی علم منجلیوں کا بھی ہاتھ ہے جو اپنے حقوق کے لئے جلوس نکالتے، ہڑتائیں کرتے اور زار کے خلاف شازشوں کے جال بنتے رہتے۔
- کیٹس کی طرح وہ بھی تھوڑی عمر لکھوا کر لایا تھا۔

”زندگی کی شام“
 میں موت کی تمنا کیوں کروں
 مجھے زندہ رہنے کی شدید ترپ ہے
 فکر و آگہی سے میرا گہرا تعلق ہے
 غم سے بھی مجھے نسبت اور عرفان ہے
 دنیا کی تنقید اور تم بھی سہنا ہے
 کہ میرے شاعرانہ افکار و ذمہ دار ہیں
 انہی شعلوں اندر زندگی بسر کرنے کا
 لطف و سرور ہے
 کبھی کسی مترنم آواز کی لہریں
 دل کو سرور دے جاتی ہیں
 کبھی یونہی اشکوں کا سیلاب بہہ جاتا ہے
 کیا خبر جب میری عمر کی ڈھلتی شام ہو
 عشق دے جائے تبسم کا چھلکتا ہوا جام

الکگزینڈر پشکن

اس اپارٹمنٹ کی کوئی چیز ایسی تھی جو اپنی تاریخی حیثیت میں کم قیمتی ہونے کے باعث کم تر توجہ کے قابل تھی۔ شاید کوئی بھی نہیں۔ پھر میں نے اُس کمرے میں کیوں ڈیرہ لگا لیا تھا جو انکی خواب گاہ تھی اور جہاں متالیا کا دلکش پورٹریٹ اور تصویریں آویزاں تھیں۔

کوئی چہرہ اس ظالمانہ حد تک بھی خوبصورت ہو سکتا ہے۔ جیسا دیواروں پر لٹکا ہے۔ میری آنکھوں کی ایکس رے مشین اسکے ایک ایک نقش کی باریکی میں اترتی تھی۔ اسکے بالوں کے براؤن سنہری شیڈ نے بے اختیار ساحلوں پر ڈوبتے سورج کے شفق رنگوں کی مجھے یاد دلائی تھی۔ یہ فنکار کے نوک برش کا مبالغہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ ماسکو اور درالحکومت پیٹرز برگ کی کورٹ سوسائٹی کی سب سے زیادہ زبان زد شخصیت۔

یہ روس کے بے بدل عظیم قومی شاعر اور نثر کے بڑے لکھاری الکگزینڈر سرگیویچ پشکن (Aleksandr Sergeevich Pushkin) کا گھر تھا ویسے تو دراصل یہ جگہ شہزادی والکنو سکایا کی ملکیت تھی۔ پر زار شاہی کی طرف سے پشکن کو رہائش کے لئے

عنایت ہوئی تھی۔ یہاں اُس نے اپنی زندگی کا ایک سال گزارا۔ اسکی موت کے بعد اسے میوزیم بنادیا گیا۔

بڑی تھوڑی سی زندگی۔ 26 مئی 1799ء کی پیدائش اور 10 فروری 1837ء کو وفات۔ درمیانہ مختصر سادقت ہنگاموں، باغیانہ سرگرمیوں، بغاوتوں، رومانوں اور تخلیقی کاموں میں بسر ہوا۔

”کیئس کی طرح بھلا اتنی کم عمر کیوں لکھوا کر آیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔“

ہماری واپسی اب سر پر تھی سات دنوں کا ہواؤں میں اڑتے ہوئے پتہ بھی نہ چلا تھا۔ اور ابھی تک اسے دیکھا نہیں گیا تھا۔ پھٹکن میوزیم نہ دیکھا جاتا تو میرے لیے آگرہ پہنچ کر تاج محل نہ دیکھنے والی بات ہو جانی تھی۔ جو مجھے قطعاً قبول نہ تھی۔ پس بھاگی۔ الیگزینڈر کالم کے پاس مویا کا نہر کے کنارے پر خوبصورت سہ منزلہ اور دو منزلہ عمارتوں کے حصار میں گھری نمبر بارہ کے سامنے جارکی۔

میں نے پھٹکن کو نہیں پڑھا تھا۔ جب رُوس کیلئے تیاری کے مراحل میں تھی ذوالفقار تابش ایک دن فون پر تھے۔ تابش صاحب میرے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ محبت سے گویا ہوئے۔

”تم نے کن کن رُوسی لکھاریوں کو پڑھا ہے۔“

جنہیں پڑھا تھا گنوا دیا۔ سوال ہوا۔ پھٹکن نہیں پڑھا۔ میں کتاب بھیج رہا ہوں۔ اُسے پڑھے بغیر نہ جانا۔

چچی بات ہے میں ممنون بھی ہوئی اور دعا بھی دی کہ چلو میرا ایک عظیم شاعر سے ابتدائی تعارف تو ہوا۔ ظانصاری صاحب کا منظوم ترجمہ بھی کمال کی چیز تھی۔

بلند و بالا اور اون محرابی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ تو ایک شاہانہ عظمت کا پرتو ہر سونکھرا ہوا نظر آیا تھا۔ یہ میوزیم دوستو و سکی سے بہت مختلف تھا۔ محرابی صورت والے برآمدوں سے آگے وسیع لان جسمیں کول چوڑے پر کھڑا ٹھکن دراصل اپنی عظمت کے بلند مینار پر کھڑا ہے جس کا اعتراف اسکی موت کے بعد ہوا۔

شاعر اپنے دو ہیالی حوالے سے رُوسی اشرفیہ کی اونچی کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ ماں ایتھوپیا کے ابرام پیٹر دوچ ہنی بال کی نوای تھی جسے افریقہ میں اغوا کر کے قسطنطنیہ لایا گیا اور عثمانی سلطان نے اسے پیٹر اعظم کو تحفے کے طور پر بھیجا۔ پیٹر اعظم کو اپنا یہ خادم بے حد پسند تھا۔ اسکی شادی خاص طور پر منصب دار گھرانے میں کی گئی۔

میں اُس وقت ڈرلنگ روم میں تھی۔ آسمانی رنگ کی دیواروں والا کمرہ جس کا سامان آرائش بے حد سادہ اور مختصر تھا۔ دیوار پر ٹھکن کا پورٹریٹ سجا ہوا تھا۔

اُچھے اُچھے گنکھر یا لے بال موٹی آنکھیں اور موٹے ہونٹ رخساروں پر پھیلی پر ٹھوڑی پر سٹی ہوئی داڑھی۔ ٹھکن اپنے افریقہ سے تعلق پر ہمیشہ مازاں رہا۔ اور جب کبھی بھی اسکا سانولا رنگ اسکی گرم مزاجی اسکی باغیانہ طبیعت اور خود مری زیر بحث آئی اُسے ہمیشہ مسرور لہجے میں کہا۔

”مجھے اپنے مشرق سے تعلق پر فخر ہے اور افریقہ یقیوں سے مجھے قلبی محبت ہے۔“ اور اُسکا اظہار اسکی شاعری میں کہیں کہیں پر کہانیوں اور تاریخی مادلوں میں خاصی مقدار میں ہوا۔

کمرے میں رکھی میزوں پر خوبصورت شمع دان، ٹیبل لیمپ اور اُس کی شاعری کے دتی نمونے سجے تھے۔

جس ماحول میں اُس نے آنکھ کھولی تھی وہ گھر بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ اُس کا چچا

شاعر، اُس کی پھوپھیاں ادب شناس اور اُس کے گھر میں اُس وقت کے رُوسی ادب کے مایہ ناز ادیبوں جن میں نکولایا کرامزن Nilolai Karmzin اور یسلے زکوسکائے۔

Vsily Zhulov Sky کا کثرت سے آنا جانا تھا۔ اُس کے باپ کے گھر کی الماریاں اگر فرانسیسی ادب سے مالا مال تھیں تو جس گھر میں اُس نے اپنی آخری سانسیں لیں وہاں بھی فرینچ لٹریچر کثرت سے تھا۔

میں اُس وقت اُس کے سٹڈی روم میں تھی۔ جہاں سبز دیواروں کی چھتوں کو ہاتھ لگاتی الماریاں پاؤں سے سر تک انتہائی قیمتی کتابوں سے سجی ہوئی تھیں۔ دراصل اُس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی اس میں فرانسیسی کچر اور ادب رُوسی کچر اور ادب کے ساتھ بہت نمایاں تھا۔ اُس کے گھرانے کے بچوں کے لئے نوکر چاکر اگر دیہاتوں سے آتے تو ایک اتالیق کا فرانسیسی ہونا بھی ضروری تھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ وہ بہت چھوٹی عمر میں سترھویں اور اٹھارویں صدی کے فرانسیسی ادب سے روشناس ہو چکا تھا۔

اُس کی میز پر کاغذ پڑے تھے۔ بڑا خوبصورت ٹیبل لیپ سجا ہوا تھا۔ ایک جانب کتابوں کا ڈھیر تھا۔ لٹش ٹرے، ڈیکوریشن پیس اور بڑے خوبصورت پیپر ویٹ تھے۔ گری کا رُخ ذرا سا نیڑھا تھا یوں جیسے کوئی لکھتے لکھتے کسی کام سے اُٹھ کر باہر چلا جائے۔ وہ بھی تو شاید ہی اُٹھ کر باہر گیا تھا اور پھر اس گری پر دوبارہ بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا۔

اُس کی پیدائش ماسکو کی تھی۔ ابھی بھی اُس کے والدین اور رشتہ داروں کی تصویریں دیکھتی ہوئی باہر آئی تھی۔ باپ سرجی لیوویچ Lvovich اگر اپنی طاہری ہیبت میں رو مانوف کے زبردست زاروں جیسا تھا تو ماں نادیزدا ہنی ہال بالشت بھر لمبی گردن پر نکلے خوبصورت چہرے والی متکبر اور نخوت پسند عورت نظر آئی تھی۔ یوں عملی زندگی میں وہ تھی بھی ایسی ہی۔ بچوں سے لاپرواہ اور لاتعلقی سی۔ مٹکن کی شاعری میں ماں کا ذکر نہیں۔ ہاں

البتہ اپنی آیا سے محبت کا کئی بار اظہار ہے۔

اس شرارتی ضدی اور ہٹ دھرم سے بچے کو گیارہ سال کی عمر میں سکول کے جس بورڈنگ ہاؤس میں بھیجا گیا۔ وہ الیگزینڈرا ڈول نے روس کے اعلیٰ طبقے کے بچوں کیلئے Tsarkoye Selo میں امپریل الیم کے نام سے قائم کیا تھا۔ ٹشکن منفرد اور مشکل بچہ تھا۔ رُوسی اور فرانسیسی لٹریچر میں اسکی کارکردگی بہت نمایاں تھی۔ باقی مضامین میں بس گزارہ تھا۔

اسکی شاعرانہ صلاحیتوں نے بھی اسی عمر میں پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ یہاں اُسکا ہدف اُسکے ہاپسندیدہ ہم جماعت اُستاد خاص طور پر مذہبی تعلیم اور سرکاری کارندے بننے مگر اس قیام نے اُسے ذہنی اور فکری بلوغت بھی دی۔

صرف سولہ سال کی عمر میں اُسنے رُوسی اشرافیہ کے ایک بڑے اجتماع میں اپنی نظم سنائی۔ داد سمیٹی اور لوگوں نے یک زبان کہا: ”مستقبل میں روس کا عظیم شاعر ہوگا۔“ ”رپن“ کی یہ پینٹنگ میں نے بڑے کمرے میں دیکھی تھی۔ کرسیوں پر بیٹھے عمر رسیدہ اُدھڑ اور نوجوان مردوں عورتوں کا ایک جھوم ایک طرف دھری میزوں کے آگے کرسیوں پر بیٹھے غالباً جج صاحبان اور عین درمیان میں نوخیز سالک کا ہاتھ اٹھائے نظم پڑھتا ہوا۔ کس غضب کا انداز تھا۔

نپولین کا رُوس پر حملہ آور ہونا اور اُس کا شکست کھانا۔ فوجی جوانوں کا سکول کے دیوار کے پاس سے مارچ کرتے اور ترانے گاتے ہوئے گزرنے اور اُسکا انہیں دیکھنا اُسکی اوائل عمری کے وہ نقش تھے کہ جنگی کیفیات کے عکس اُسکی آئندہ شاعری میں نمایاں ہوئے۔ اسی طرح یورپ سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ترقی پسند خیالات کے ساتھ واپس آکر مجلسوں اور محفلوں میں لکچر دینا، مباحثے اور مذاکرے کرنا اور اسکی اُن میں مسلسل شرکت نے

اُسکے فکری شعور کی تربیت کی۔

میوزیم کے کمروں کے دروازے اندر ہی اندر ایک دوسرے میں کھلتے چلے جاتے تھے۔ کہیں بچوں کے کمرے، کوئی نشست گاہ تو کوئی نٹالیا کا ڈریسنگ روم۔ کمروں کا جدا گانہ رنگ و روپ انہیں انفر دیت دینے کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق کا بھی حامل تھا۔

تھوڑی سی دیر کیلئے برآمدے میں پڑی بیچ پر بیٹھی تو پٹشکن کی زندگی کے کچھ نئے پہلو سامنے آ گئے تھے۔ ملازمت سرکاری ملی اور اونچی بھی تھی۔ ریسمانہ ٹھاٹ بھاٹ تو پہلے ہی تھے۔ یہ دور مکمل لعود لعب اور عیاشیوں میں گذرا۔ سناچ گانے، تھمیر جوئے بازی، شراب نوشی، مذہب اور حکومتی اراکین پر طنز و مذاق تو خیر عام سی باتیں تھیں۔

جلد باز بھی تھا اور جذباتی بھی۔ ذرا سی بات پر کوئی سے فیصلہ کرانے پر مصر ہو جاتا۔ اس کے احساسات و جذبات کی بے باکی نے جنس، رومان اور سیاست پر اُسکی خوبصورت طبع آزمائی کو بطور ایک رومانی شاعر کے اُسے اہم کیا۔

اُسکی طویل بیانیہ نظم ”رسلان اور لڈمیل“ روسی معاشرے کی ایک فوک عشقیہ داستان منظر عام پر آئی۔ تین ہزار مصرعوں کی اس نظم نے روسی شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے سجا کر دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا۔

پھر ایک حیرت انگیز اور عجیب سی بات ہوئی بے حد عجیب۔

کوئی تیس (30) بتیس (32) کے دائرے میں گھومتی ایک قدرے فربہ مائل جسم کی دراز قامت لڑکی میرے پاس آ کر رُکی۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور دو سوال پوچھے۔ پہلا سوال تو چلو سیاحوں سے ہر کوئی پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ آپ کہاں سے ہیں؟ لیکن دوسرے سوال نے مجھے حیرت کے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھتی تھی کہ آخر اس درجہ باریک بینی سے اُسے میری حرکات کا مشاہدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے مسکراتے ہوئے اُسکا بازو پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔
 تاریخ میں اپنا نام بڑے آدمی کے طور پر لکھوانے والے لوگوں کے محبوب یا انکے
 زوج کے بارے میں جاننے کا بالعموم فطری تجسس ہر کسی کو ہوتا ہے۔ مثالیہ کی تصویروں کے
 سامنے دیر تک کھڑے ہونے کی وجہ یہی احساس اور یہی فطری تجسس تھا۔
 ”خبیث عورت“۔

اُسے ہونٹ سکوڑے اور ایک ایسے لہجے جس میں دُکھ گھلا ہوا تھا بولی۔
 ایسے بے مثال شاعر جس نے تھوڑے سے وقت میں رُوسی ادب کو اتنی بے
 شمار جہتیں دیں۔ اسکی بے وفائی اور کٹھور پن کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یوں اگر وہ اسکے عاشق
 جارج دی انتھیس کے ساتھ ڈوئل میں اُسکی کوئی کانٹا نہ بھی بنتا تب بھی ایک دن اُسے مرجانا
 تھا۔ بس یہی ایک دو سال اور جی لیتا۔ گٹھن اور پریشر نے اسکا سینہ پھاڑ دینا تھا۔“
 میں بڑبڑا اسکا چہرہ دیکھتی تھی۔

ایسی سُشتہ انگریزی بولتی تھی کہ اپنے نو دن کے قیام میں ایک دن بھی اتنا رواں
 لب و لہجہ سننے کو نہ ملا تھا۔ وہ مالداویا کے دار الخلافہ کیشیف (Kishinev) کی سا شاتھی جو
 لندن کی کسی یونیورسٹی میں رُوسی ادب پڑھاتی تھی۔ ان دنوں پیٹر زبرگ آئی ہوئی تھی۔ اور
 اُس ٹورسٹ گروپ کی منتظر تھی جس نے دو بجے میوزیم پہنچنا تھا۔ پُھکن کی چچی عاشق۔

میں کنگ سی بیٹھی اسے اتھاہ حیرت سے دیکھتی تھی۔ مغربی پہناوے میں لپٹی اس
 لڑکی کے اندر کیسی مشرقی روح تھی۔ ایسے خیالات و احساسات تو ہم تیسری دنیا کی عورتوں
 کے ہوتے ہیں جنہیں بڑا دقیانوسی کہا جاتا ہے۔

محبت کے خیر میں گندھی سا شاکا کی قربت مجھے اُس سردی سرزمین پر بہار کے کسی
 معطر جھونکے کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔

اسکی Ode To Liberty پڑھی ہے آپ نے؟ سا شانے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر بلایا۔

دراصل اسکی یہی نظم اُسکی جلاوطنی کا باعث بنی تھی اس نظم میں زار زوس "انگیزینڈ راول" کے اُس ظلم و زیادتی پر بھرپور احتجاج اور دکھ کا اظہار تھا جسکا وہ اپنے والد پال اول کو قلعہ میخانکوسکا میں دھوکے سے قتل کرنے کا مرتکب ہوا تھا۔

پر یہ جلا وطنی بڑی نعمت ثابت ہوئی تھی۔ زوس کی جنوبی ریاستوں کوہ یورال، کوہ قاف کی وادیوں، بحیرہ ارل اور بحیرہ کیسپین کے ساحلی علاقوں نے اُسکے مشاہدے، اسکے تجربے اور انسانی فطری رویوں کے مطالعے نے اسکے علم میں اضافہ اور تخلیقی کام میں رنگ بھرا۔ ٹرکوں، چمکوں، تار تار یوں، جار جیائی اور کاکیشیائی قبائل کے لوگوں سے میل جول اور جنوب کے علاقائی حسن، سادگی اور قنصع سے پاک ماحول اسکی شاعری پر کئی جہتوں سے اثر انداز ہوا اس دور کی شاعری پر لارڈ ہارن کا بھی اثر ہے۔ "Sea" اسکی واضح مثال ہے جہاں وہ ہارن کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اُسکے دنیا سے جانے پر افسردہ ہے۔

"The Caucasian Captive" کوہ قاف میں رہنے والے قبائل چمکوں اور کاکیشیوں کے ایک روسی قیدی کی زبان سے اُسکے رہن سہن، اُنکی دلیری شجاعت، اُنکے گھوڑوں کے اوصاف، اُنکی مہمان نوازی کا ذکر کرتے ہوئے وہ زوس کے جیالے سپہ سالاروں کو بھی خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ جنہوں نے ان قبائل کے ساتھ سرحدی لڑائیوں میں داد و شجاعت دی تھی۔

مستی سلاف کہ جب روسی فوج ماری گئی تھی اور وہ تنہا لڑا اور فتح یاب ہوا۔ اسکے لہجے کا فخر اور غرور بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے روس کا دوسرا الاعقاب سے سچا پرچم فضا میں اہرایا تو ہم کس قدر مسرور اور سرخرو تھے۔

روی جرنیل سیسیانوف کا ذکر کرتے ہوئے بھی اس کا انداز اُسی تفاخر میں ڈوبا ہوا ہے کہ جب شمالی قازقستان کے تیریک دریا کے پانی لہو بن گئے تھے۔ اُن چٹانوں اور پانیوں پر سیسیانوف کی پیٹانی کی چمک تھی۔ روی جرنیل یرمولوف کے بارے میں لکھتے ہوئے قازق لوگوں کو خیردار کرتا ہے۔

”ذرا سن اے قازق یرمولوف آتا ہے۔“

مجھے ہنسی آگئی تھی۔ کتنا مانوس سایہ فقرہ تھا۔ میں نے ساشا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

ساشا مجھے تمہارے اس فقرے سے اپنے لوگ یاد آگئے ہیں جو اپنے اپنے سیاستدانوں کے لئے کہتے ہیں۔

ذرا ٹھہرو قاضی حسین آتا ہے۔ ذرا سُنو نواز شریف آتا ہے۔ ذرا سُنو بے نظیر آتی ہے۔

ساشا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کی ہنسی مجھے باغیچے میں سبز گھاس پر بکھری دھوپ کی مانند خوبصورت لگی تھی۔

پٹھکن یوں بھی یرمولوف کا بہت مداح تھا کہ وہ زار روس کا مخالف اور دسمبر کے باغیوں کا حمایتی تھا۔

اُن لوگوں کے شب و روز کی پٹھکن ایک ایسی تصویر پینٹ کرتا ہے کہ انکی معاشرت کے سبھی رنگ، انکی فکری سوچ اور علاقے کا سُسن و روپ یوں سامنے آتا ہے کہ قاری خود کو کسی گرفت میں لینے والی فلم کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

یہی صورت The Gypsies میں ہے۔ بلقان کے خانہ بدوشوں کی زندگی کی ایک سچی تصویر جسکے مرکزی کردار شہری مرد الیکو بسرابیہ (بلقان کا ایک علاقہ جس پر

روسیوں اور ترکوں کی لڑائی ہوتی رہی) کی زیمفیر اور اُسکا بوڑھا باپ جسے سنتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ خانہ بدوشوں کے فطری احساسات و جذبات سرحدوں سے اور فاصلوں سے کتنے بلند و بالا ہیں۔ بنجارے ہمارے ہاں بھی ایسے ہی ہیں۔ شاعر نے کیسی سچی انکی عکاسی کی ہے کہ ایک تاناک تصویر سامنے آگئی ہے۔

باغیچہ سرائے The Fountain Of Bakhchisarai

کی اس طویل نظم میں شاعر کا تاریخ پر گہرا مطالعہ، عمیق مشاہدہ اور ذاتی تجربہ بہت شدت سے نظر آیا۔ روس کے جنوب کی وہ ریاستیں جن پر کبھی تاتاریوں کے جھنڈے لہراتے تھے۔ اور چنگیز خان کے پوتے کے کولڈن ہووڈ (فوجی لشکر) یوکرائن، ماسکو، منگری اور پولینڈ تک کے علاقوں کو روندتے پھرتے تھے۔

نظم میں حرم کی عورتوں کی زندگی، انکے نفسیاتی و جذباتی مسائل، خواہجہ سراؤں کے کردار، سلطان کا حرم کے اندر زندگی گزارنے کا ڈھنگ، تاتاری گیت، اُن گیتوں کے کردار زرمیمہ جو جارجیا کی فتح کے بعد سلطان کے حرم میں داخل ہوئی اور پولینڈ کے شہر باغیچہ سرائے کی شہزادی ماریا جسے تاتاری خان اپنا دل دے بیٹھا تھا۔ شاعر نے کس کمال سے منظر کشی کی تھی کہ ایک ایک منظر اپنی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ساتھ سامنے آتا تھا۔

اس طویل نظم کا وہ حصہ بہت خوبصورت ہے جہاں تاتاریوں کے عروج و زوال کی داستان کو اختتام پذیر کرتے ہوئے انکے دیران محلوں، افسردہ باغوں اور قبرستانوں کے ساتھ ساتھ اُس فوارے کا بھی ذکر ہے۔ جو شہزادی ماریا کی یاد میں تاتاری خان نے بنایا تھا۔ فوارے کے اوپر ہلال اور صلیب ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اُسکا نام محل کی عورتوں نے ”آنسوؤں کا فوارہ“ رکھ چھوڑا تھا کہ باغیچہ سرائے کی شہزادی وہاں بیٹھ کر اپنے محبوب کی یاد میں رویا کرتی تھی۔

ساشا نے کتنے خوبصورت انداز میں اُس کی شاعری کے چند اہم شہ پاروں کو
بیان کیا تھا۔ سُن کر مزہ آیا تھا۔

جنگ قفقاز کے بھڑکتے شعلوں میں

جل گئے جو ملک ہمسائے تھے

روس کے گاؤں، شہر

امن کا گہوارہ تھے

خان نے بھی جلا ڈالے

پھرتے پھرتے جو میں آنکلا تو پیدا

دیکھا محل میں آنسوؤں کا نوارہ

ہلال اور صلیب دونوں ہم رکاب

جگمگاتے تھے پانیوں پر

پھر چل دیا باغیچہ سرا کی جانب

خوابیدہ تھے محل مینارے

برآمدے پیران اور کمرے خاموش

یہ وہ جا جہاں کبھی تار

جنگوں سے تھک کے آتے تھے

مخفلیں سجاتے تھے

باغبان نہ رہے پر باغ باغیچے

کہانیاں اُن کی سناتے ہیں

جن کے دبدبے سے لرزاں تھے

شہر و بیابان

"Prophet" بھی ایک ایسی ہی شاہکار مختصر نظم ہے۔ دیکھئے رُوح کی تشنگی سے
ہلکان شاعر کو چھ پروں والے فرشتے نے اپنی سبک انگلیوں سے چھو کر اُس کا سینہ چاک کر کے
کیسے اسمیں سچ کہنے کا نگارے بھر دیئے ہیں۔
”سنو ذرا“۔

راستے کے ایک چوارہ پر
چھ پروں والے فرشتے کو دیکھا
انگلیاں ایسی سبک سی
جیسے کوئی جگمگا تا روشن خواب ہو
میری آنکھوں پر اُس کی آنکھوں کا لمس پھرا
جیسے روشنیوں کے سیلاب میں ڈوب گئیں
میرے کانوں کو چھوا اُس نے
اور نغمہ افلاک سے بھر دیا انہیں
آسمان کی تھر تھراہٹ نے متوجہ کیا
فرشتے فضاؤں میں پرواز کرتے
اور سمندروں کے پانیوں پر تھرکتے دیکھے
میرے ہونٹ کھولے اور دہن دہایا
میری باتونی، شوخ زبان کو
تالو سے کھینچیا
تلوار سے میرا سینہ چاک کیا

دھڑکتا دل میرا سینے سے جدا کیا
 شعلوں جیسے انگاروں سے بھر دیا اُسے
 صحرائیں کسی لاش کی طرح پڑا رہا میں
 حتیٰ کہ آسمان سے آئی صدا
 اٹھو! آنکھیں کھولو

تو پیر ہے میری روح تیرے اندر
 بحر و بر میں میرا پیغام سنا
 یوں کہ قلب انسان
 میرے لفظوں سے روشنی پائیں

سچی بات ہے میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھیج لیا تھا۔ پیغمبروں پر نزول کی ساری
 کیفیات سامنے آ گئی تھیں۔

ان نظموں کی نفسی معنوی خوبصورتی، جدوجہد، دلکشی، اشعار کا توازن اور تناسب
 ان کی جامعیت اور بندش۔ اُس کی چار مصرعوں کے بند والی نظمیں رُوسی زندگی کی حقیقی
 ترجمان بن گئی تھیں۔ فطرت کے عناصر ہوا، سورج، روشنی، اندھیرا زندگی کے ہنگامے اور
 حقیقتیں اُس کی شاعری کے وجود میں یوں گھسستی تھیں جیسے انسان کے وجود میں
 سانس۔ شہرت کا ہمارا سر پر بیٹھ گیا تھا۔

اُسکی شاعری کے حسن میں نئے رنگ بھرنے میں اُن ذی علم منچلوں کا بھی ہاتھ
 ہے جو اپنے حقوق کیلئے جلوس نکالتے، ہڑتالیں کرتے اور زار کے خلاف شازشوں کے جال
 بنتے رہتے۔

دسمبر 1825ء کی انسانی حقوق کی تحریک (دسمبر سٹ موومنٹ) کے حامیوں کے

جلوسوں پر جب کولیاں چلیں۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ باغی سولیوں پر چڑھائے گئے۔ بے شمار
جلاوطن ہوئے۔ جانتی ہو۔ ساشا نے میری طرف دیکھا تھا۔ اُسکی آنکھوں میں مجھے عقیدت
و محبت کا ایک سمندر نظر آیا تھا۔

اُنکی زبانوں پر اُسکے اشعار تھے۔ اُنکے سامان میں پٹھان کے خطوط تھے۔
میں ایک تک اسکے چہرے اور اسکے ہونٹوں کو ہلتے دیکھتی تھی۔
”سنو“۔

اُسے گنگنا شروع کیا اپنی لے میں وہ گنگنا تلی چلی گئی یہ سوچے بغیر کہ مجھے روی
نہیں آتی۔ شاید اُسے جلد ہی احساس ہو گیا تھا۔
”اوہ“ وہ انگریزی بولنے لگی تھی۔

سائبریا کے جنگلوں، بیابانوں میں تمہارے دل اور عزائم بلند رہیں۔ تمہاری قید
کے مہیب غاروں میں میری آواز تم تک ہر صورت پہنچے گی۔ تمہاری یہ گہنی بیڑیاں اور
تمہارے زندان کی تیلیاں ایک دن ٹوٹ جائیں گی اور وہ صبح طلوع ہوگی کہ جب تمہارے
ہم وطن تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔ یہ ایک نئی صبح ہوگی جس کا تمہیں انتظار ہے۔
مجھے فیض یاد آیا تھا۔ اور میری آنکھیں بھگ گئی تھیں۔

میں نے دیکھا تھا ساشا اپنی ترنگ میں مست پڑھے چلی جا رہی تھی۔

یہ آہنی زنجیریں کٹ جائیں گی ایک دن
یہ قفس کی تیلیاں ٹوٹ جائیں گی ایک دن
ہم وطن خوشیوں کو گلے لگائیں گے ایک دن
تمہاری کاوشیں رنگ لائیں گی ایک دن

”پٹھان نے بہت سارے عشق کیے تھے“۔ ابھی اتنا ہی بول پائی تھی۔

اُسکے لہجے میں تیزی تھی۔ اُس نے میری بات کاٹ دی تھی۔ ”شاعر تو ہوتا ہی عشق کرنے کیلئے ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں کا اس سے اور اسکی شاعری سے عشق بہت ضروری ہے۔ یہ عمل نہ ہو تو اکثر تخلیق کے سوتے نمونہیں پاتے۔ تمہارے ہاں شاعر سے عشق نہیں کیا جاتا۔“

”بنیادی طور پر تو دنیا کے ہر خطے کے انسان اپنی نفسیات اور جبلت میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کم و بیش ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ دیس کے شاعروں کی لمبی قطار آنکھوں کے سامنے آگئی تھی۔“

”مجھے دیکھو سا شامیری آنکھوں میں جھانکی میں اُسکے عشق میں گرفتار ہوں۔ تمہارے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی ہوں تمہارے لئے نہیں اپنی تسکین کیلئے۔“

پٹھکن نے اپنی جلا وطنی کا زمانہ مالدوایا میں گزارا۔ تین چار سال۔ اُس نے ہم لوگوں سے محبت کی۔ ہمارے اُوپر لکھا۔ ہماری تہذیبی زندگی اور کارناموں کو اپنی شاعری میں سمو کر اُسے عام کیا۔

کیشنیف میں لینن سٹریٹ پر وہ خوبصورت سفید بڑا سا گھرا بھی ہے جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ کیکرا اور لائٹ کے درختوں سے جتنی سڑک پر میرے ابا کے گھر سے تھوڑی ہی دُور ایک ہزار سال پرانے پتھر کا مہرابوں والا پھاٹک ہے جس پر ٹرکوں سے چھینی ہوئی توپوں سے ایک گھنٹی بنا کر لگائی گئی ہے۔ اُس کے پاس ہی واقع پارک میں جب بھی شام کو کھیلنے جاتے۔ میں اُس ستون کے پاس ہمیشہ رکتی۔ اس پر نصب مجسمے کو دیکھتی اور اپنی بڑی بہن سے پوچھتی۔ جو مجھے بتاتی۔ یہ بہت بڑا شاعر ہے۔ ہمارا شاعر یہ الیگزینڈر پٹھکن ہے۔

مالدوایائی لوگ پٹھکن سے بہت پیار کرتے ہیں۔

رُوی لوگوں اور اُن کے کچھرے محبت بھی اُنہیں پٹھن کی وجہ سے ہے۔
 پھر ساشا نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اٹھا کر اُس کمرے میں لے گئی جہاں ٹی وی پر
 اسکی زندگی کی ڈاکومنٹری چل رہی تھی۔ ہم دونوں میٹ پر بیٹھ گئیں۔ میں نے دیوار سے ٹیک
 لگالی تھی۔

سکرین پر میرے سامنے پمکوف کا شہر آیا اس شہر کا گاؤں میخائلو فسکوے اسکی
 خاندانی جاگیر پر بنا ہوا وہ گھر جہاں وہ عظیم شاعر رہتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں نازیوں نے اس علاقے کو تباہ کر دیا تھا۔ رُوی کچھر کی سب
 یادگاریں ملیا میٹ ہو گئی تھیں۔ ساشا نے مجھے بتایا۔ جنگ کے فوراً بعد حکومت نے محفوظ
 خاگوں کے مطابق گھر دوبارہ اسی انداز میں تعمیر کیا۔ پٹھن کی آیا آرینا رودیونووا کے گھر کو
 بھی ٹھیک کیا گیا۔ سوویت حکومت نے ہر اُس یادگار کو محفوظ کیا جو کسی نہ کسی حوالے سے
 شاعر سے متعلق تھی۔ دونوں گھر سکرین پر میرے سامنے آئے۔ یہاں اُس نے قید تہائی کاٹی
 تھی۔ سخت سردیوں میں برف سے ڈھینچنے راستے اور گھر کی کھڑکیوں دروازوں سے جھانکتی
 تہائی اُداسی اور دریائی کے گھمبیر سے ناثر نے مجھے افسردہ کر دیا تھا۔

”سویتا کورسک“ کی خانقاہ میں شاعر کی قبر پر ہر سال لگنے والے میلے کی جھلکیاں
 تھیں۔ لوگوں کا ہجوم بے کراں تھا۔ ان کی محبتوں اور چاہتوں کے اظہار تھے۔

”تو آؤ پھر مینا و ساغر کی بات کریں۔“

جب وہ Tsarkoye Selo میں زیر تعلیم تھا پبلِس کے شاہی باغوں میں بہت سی لڑکیوں
 سے اسکی دوستی تھی۔ وہ اپنی نظمیں انہیں سنا تا اور مُسکراتے ہوئے کہتا۔

”صرف تمہارے لئے۔“

بحیرہ کیسپین کے ساحلی حصوں جارجیا پاکیشیا، یورال کے پہاڑی سلسلوں قازقستان

میں اپنے قیام کے دوران یہاں کی تو بہ ممکن حسن کی مالک عورتیں اسکی کمزوری بنیں۔
 کارولینا سوہیکا کے کمال کی خوبصورت عورت تھی۔ عمر میں اُس سے بڑی تھی۔
 ذہین، حسین اور عیار۔ دھڑلے نخرے نخرے اور شاعرانہ ذوق کی حامل، اسکی شاعری کی
 نزاکتوں اور ہارمونیوں کو سمجھنے والی۔

پشکن بھی اسکی ذہانت اور رسیلی آواز کا شیدائی تھا۔ جارجیا کو روسی گرو زین کہتے
 ہیں اپنی ایک نظم میں گرو زینی حسینہ کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے جس دل پذیر انداز میں اُسکے
 حسن اسکے گرو زینی گیتوں اور ان میں چھلکتے اپنے گھر سے دور ایک انسان کے احساسات کی
 ترجمانی کی ہے۔ وہ اپنی مثال آپ تھا۔

غم زدہ سے یہ گیت
 دل کش سے یہ نغمے
 اے دل رہا و دلکش حسینہ
 یہ گرو زینی راگ نہ سنا
 تو جو گاتی ہے تو کیا دل پہ گزر جاتی ہے
 ساحل کے شب و روز کی یاد آتی ہے
 یونہی میرے آنسو بہتے رہیں گے
 یادیں مضطرب کئے رکھیں گی
 تم سے کچھ بن نہ پڑے گا
 یہ دردِ جدائی خود ہی کم ہو جائے گا

Beneath the blue sky of her native land

وہ اکثر اُس سے فرمائش کر کے سنا کرتی۔

اینا کیرن بوڑھے جرنیل کی بیوی Amalia Riznich کسی بڑے تاجر کی بیوی۔ اینا اولییا اینا دلف بے شمار عورتوں کا وہ شیدائی اور بے شمار عورتیں اس پر عاشق۔
 پشکن انسانوں کو سمجھنے میں تیز تھا پر عورتوں کو سمجھنے میں بودا۔ ان ڈھیر ساری عورتوں میں سے کسی نے بھی اُس سے بے لوث اور دل و روح کی سچائی سے پیار نہیں کیا تھا۔ سوائے اینا دلف کے۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ شاعر اُسکے کیلئے جذبات کی وہ شدت محسوس نہیں کرتا تھا۔ کو اُسے کچھ وقت اسکے ساتھ ضرور گزارا۔

کونٹس علیزہ روزنوسو طرح دار اور خوبصورت ہی نہ تھی اوڈیسے کے گورنر کی بیوی بھی تھی۔ اور گورنر کو اسکے معاشرے کا علم ہو گیا تھا تو عتاب کا کولہ برسا۔ اوڈیسے سے اُسکا اخراج ہوا بہت سارے الزامات کے ساتھ۔ جن میں بد چلنی بھی ایک تھا۔ سرکاری ملازمت ختم۔ زار نے اُسے میخا کو فکس کوئے پر نظر بند کر دیا۔

رشتے دار تو پہلے ہی مالاں تھے۔ ماں باپ کے ساتھ تعلقات بھی خوشگوار نہ تھے باپ اسکی باغیانہ سرگرمیوں پر ہمیشہ سے تشویش اور فکر میں مبتلا رہتا تھا۔ بیٹا شاہی اشرافیہ میں اسکے لیے باعث فخر بننے کی بجائے شرمندگی اور ذلالت کا مو جب بن رہا تھا۔ زار بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اسکے باپ کو تائید کی گئی تھی کہ بیٹے پر کڑی نظر رکھے اسکی ڈاک کھولی اور پڑھی جائے اور جہاں روکنے والی ہو۔ روکی جائے۔ ایک بدنام سی کہانی اس پیرائے میں بھی مشہور ہو گئی تھی کہ اُسے اپنے باپ کو مارنے کی کوشش کی۔

خاندان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اُسے جاگیر پر تنہا چھوڑا جائے۔ شاید خاندان کا یہ بایکٹ اور انتہائی قدم اُسے راہ راست پر لے آئے۔ پورا خاندان نومبر کے وسط میں سٹیٹ سے چلا گیا اور پشکن وہاں صرف آیا آرینا کے ساتھ رہ گیا۔

پردہ بھی شاعر تھا اور شاعر بھی خدا داد حالات کا ہر تازیانہ اسکی شاعری کیلئے مہمیز

ثابت ہو رہا تھا۔

سرکاری نگرانی اور بغیر اجازت کے باہر نہ جانے کی سزا نے اُسے تک کر بیٹھنے اور
نامکمل کاموں کی تکمیل کی مہلت دی۔ ”ایوگے فی انے گن Eugene Onegin“ کا
پورا خاکہ ترتیب دیا گیا۔ بلکہ تین چار باب مکمل بھی کئے۔

اُسکی خاندانی آیا آرنیا (Arina Rodionovna) کی شفقت اور پیار
نے اُسپر عام رُوسیوں کی سادہ دلی، محبت، ہمدردی اور ممتا کے نئے رنگ دیکھے اس پر اس
طبقے کی وہ خوبیاں آشکارا ہوئیں جن سے بالائی طبقہ محروم تھا۔

آرینا نے پٹھن کو زمانوں پرانی وہ نوک کہانیاں سنائیں جو حکمت و دانائی سے
پُر اور زندگی کے تجربے سے گندھی ہوئی تھیں۔ یہ وہی تھی جس نے اس نوع کی زندگی کے
احساسات سے اُسے روشناس کیا اور اسکی جھلک اسکی بہت سی نظموں میں ظاہر ہوئی۔

آرینا پٹھن کی کئی حماقتوں اور غلطیوں کو چھپا جاتی۔ ممتا کی چھاؤں میں اسکی
پریشانیوں کو سمیٹ لیتی۔

”Winter evening“ میں وہ اُسی سے مخاطب ہے۔

محبت اور عقیدت کی ایک اتھاہ ہے اُسکے لہجے میں جب وہ کہتا ہے۔

جام کا پیالہ اٹھا

اور میرے ساتھ پی

کہ تو مجھ جیسی دکھی جوانی کی ساتھی ہے

آ کہ ہم اپنی تلخیاں اس جام میں گھول لیں

مجھے ننھی چڑیا کا گیت سنا

مجھے اُس لڑکی کا گیت سنا

جو بہت سویرے پانی بھرنے جاتی ہے
ایک اور جگہ وہ پھر اُس سے مخاطب ہے۔

تمہارے ہاؤرچی خانے کو اندھیرے کا خوف بھر دیتا ہے
کچھ بولو

میری موسم بہار جیسی جوانی کی ساتھی
تا کہ خاموشی کا طلسم توڑے

برسات اور خزاں دونوں موسم اُسے بہت ہانٹ کرتے تھے۔ برسات جب گلیاں
اور سڑکیں کچھڑے لت پت ہوتی تھیں اور خزاں جب انگور پکتے تھے۔

پھر دوستوں کی کوششوں سے ماسکو واپسی ہوئی۔ یہ چھ سات سال اسکی ادبی زندگی
کا عروج تھے جسمیں اُسے رزمیہ شاعری کی ”ایو گے فی انے گن Eugene
Onegin“ منظوم ناول میں فکر و سوچ اور بیان کی دلکشی و بے ساختگی نے روسی شاعری کو
مالا مال کر دیا۔ روسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ پلٹاوا بھی جب منظوم صورت میں منظر عام پر آیا
تو قدامت پرست روسی بھی ٹھکن کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوا۔

The Bronze Horse man کو بھی تنقید نگاروں نے اُسکا شاہکار کہا

ہے۔

شاشا بولے چلی جاتی تھی اور میری نگاہیں جو سکرین پر جمی تھیں۔ دی بروڈز ہارس کا
سننے ہی دو دن پہلے کے دیکھے ہوئے ڈمبر سٹ سکوار پھینچ گئی تھی۔ بڑی دلچسپ تاریخ تھی
اس کی بھی اور ساتھ ہی بروڈز ہارس کی بھی۔

ڈمبر سٹ سکوار تاریخ روس کے چند عہد ساز واقعات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں
جس پہلی چیز نے بھرپور توجہ کو کھینچا وہ کانسی کے گھوڑے پر سوار وہ مجسمہ ہے۔ جو کیہ تھران دی

گریٹ کی طرف سے اپنے مانا سسر پیٹری گریٹ کو خراج ہے۔ عقیدت مندانہ اظہار ہے۔ کیتھرائن غیر رومی ہونے کی وجہ سے اپنا ماطہ اور تعلق رومی تاریخ کے ابتدائی زاروں اور رومانوف خاندان سے جوڑنے کی بہت خواہشمند رہتی تھی۔

میدوز ہارس مورائس فالکون (Maurice Falconet) کا یہ شاہکار دراصل روس میں پہلا رومن سٹائل مجسمہ تھا جو 1782ء میں یہاں نصب کیا گیا اور اس جگہ کو پیٹرز سکوائر کا نام ملا۔

بادامی اور گلابی گھٹے ملے رنگ کے تین خفیف سے سٹیپ والے اس چبوترے پر موٹا تازہ اور لمبا سا سانپ بکھرا ہوا ہے۔ گھوڑے کے اگلے سم سانپ کا سر گچل کر آگے بڑھتے ہوئے اس انداز میں اوپر اٹھے ہوئے ہیں جیسے ابھی وہ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کر جائے گا۔

گھوڑے کے پٹھو لے ہوئے نتھنے، اوپر اٹھی کنتیاں اور برہا چھو کو چیرتی لگام جس کا سر اسٹہ سوار کے ایک ہاتھ میں ہے۔ شہ سوار کے چہرے اور آنکھوں میں آہنی عزم کی دہکتی لو ہے۔

سانپ سویڈن کا علامتی نشان ہے۔ سویڈن جو جانی دشمن ہے روس کا۔ دشمن جس کا سر بُری طرح کچل دیا گیا ہے۔

فضا میں پھیلے ہوئے ہاتھ کا تمثیلی انداز، کیا کہہ رہا ہے؟ مجھے اس کا پس منظر تو نہیں ملا۔ میرے خیال میں ایک اچھا شہنشاہ اپنی دھرتی کو اپنی پناہ، عافیت اور شفقت کے سائے تلے رکھنے کا عزم ہی دہراتا ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں پیٹرسکوائر سینٹیٹ سکوائر میں بدل گیا۔ نام کی تبدیلی ایک بار پھر اُس وقت ہوئی جب ایک بے حد اہم واقعے نے جنم لیا۔ حکمران زار نکولس اول

تھا۔ سخت گیر، فوج جس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ سلطنت فوجی ٹولے کے ہاتھوں میں تھی۔ شرفاء مملکت کے ایک گروپ نے آزادی اظہار، بنیادی انسانی حقوق اور آئین کی بالادستی کے لئے بغاوت کر دی۔ تاریخ میں سنائی دینے والی اس پہلی احتجاجی آواز پر اس کا گلا جس بُری طرح گھونٹا گیا اُس نے تاریخ کے صفحات میں ڈکھ اور ملال کے تاثرات بکھیر دیئے۔

میں نے اس واقعے کی پینٹنگ دیکھی تھی۔ اس وقت وہ منظر فریم سے نکل کر سکوائر میں مجسم ہو گیا تھا میں دیکھتی تھی یادگار کے پاؤں میں بکھرے احتجاجی تو شاید پندرہ اٹھارہ سو سے زائد نہ ہوں پر گھڑسوار بندوقوں والے ہزاروں کی تعداد میں میدان کے ہر طرف کیل کانٹوں سے لیس یوں کھڑے تھے جیسے سامنے دشمن کی بھاری نفری مقابلے پر۔ اور بس کوئی دم میں جنگ کا طبل بجا چاہتا ہو۔

حبیب جالب بھی کیسے وقت یا د آیا تھا اور وہ پیاری سی لڑکی بھی چھم چھم کرتی جمہوریت اور آئین کی بالادستی کا جھنڈا اٹھائے سامنے آ گئی تھی اور سکوائر حبیب جالب کی کوچ دار آواز سے بھر گیا تھا۔

ڈرتے ہیں بندوقوں والے اک نہتی لڑکی سے۔

اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے لوگ کس قدر بُزدل ہوتے ہیں کہ سچ کا علم تھا مے چند لوگوں سے ڈرتے ہیں۔

14 دسمبر 1825ء کے بے حد سرد دن جب احتجاج کرنے والے لوگ ”دی مدوز ہارس مین“ کے قدموں میں اکٹھے ہوئے، اُن پر کولی چلی۔ پانچ لیڈر اور سینکڑوں لوگ تو وہیں ختم۔ بقیہ گرفتار ہوئے اور سائیریا کے کالے پانیوں میں پہنچائے گئے۔ اور یہی وہ لوگ تھے جو دسمبر کی کہلائے۔ انہی جیسے لوگوں کے لئے پٹھان جیسے شاعر نے انقلابی نظمیں

لکھیں۔ دوستوں کی نے اپنے مالوں میں ذکر کیا۔ اس سکوائیر کو دبیر سٹ سکوائیر کا نام تھی ملا۔

ماحول میں افسردگی کا رچاؤ عود آیا تھا۔ میں نے گھوڑے کو بغور دیکھا تھا۔ میں شاید یہ جاننا اور دیکھنا چاہتی تھی کہ اپنی پخت پر عہد ساز شخصیت کو بٹھانے کا جو گھمنڈ اُسکے منتوں کو پھلوائے ہوئے ہے کیا اسکی آنکھوں میں کہیں اُس احساس، اُس درد کی کوئی ہلکی سی رمت بھی رقصاں ہے کہ جب بے گنا ہوں کے خون سے یہ جگہ رنگین ہوئی؟

”The Bronze Horseman“ دی ہرونز ہارس مین“ اِس سکوائیر کی جان، اسکی رونق بڑھانے، فرانسیمی مجسمہ سازی فنکاری نمایاں کرنے، پیٹر دی گریٹ جیسے تخلیق کار کی خوبیوں کے بہرے کھولنے کے ساتھ ساتھ پٹنن جیسے بے مثال شاعر کی لازوال نظم کو بھی اُجاگر کرتا ہے کہ اس کی نظر نے اسے کس انداز میں دیکھا اور محسوس کیا۔ نظم کے پس منظر میں 1777ء کا خوفناک سیلاب تھا۔

میں نے گھڑ سوار کے پھیلے ہوئے آہنی ہاتھ کو دیکھا۔ لرزش یا تھر تھراہٹ نہیں تھی وہاں۔ اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ آنکھوں سے چمکتے جلال اور بیت نے مجھے ایوگینی کی طرح ہی خوف زدہ کر دیا تھا۔

”ہرونز ہارس“ کا ایوگینی، دریائے وینا کی کھاڑی کے کسی چھوٹے سے جھونپڑے میں رہنے والا چھیرا، دریا کے منہ زور سیلاب میں اپنے جھونپڑے اور اپنی محبوبہ پر اشا کو کھو بیٹھا تو گھڑ سوار سے یہ پوچھنے چلا آیا کہ تو کیسا شہنشاہ ہے؟ منہ زور پانیوں کے کنارے شہر آباد کرنے سے پہلے تو نے نہ سوچا کہ یہ پانی بھی کبھی کبھی انسانوں کو سبق سکھانے آ دوڑتے ہیں۔ اور جب بھی ایسا ہوگا تو مرنا کس نے ہے؟ غریبوں اور ماٹھے لوگوں نے۔ تیرا کیا ہے؟ تیرے محلوں میں بھرے ہوئے پانی کو تو تیرے جرنیل تیری ایک آواز پر سیٹنے

کے لئے دوڑ پڑیں گے۔ پر ہم جیسے ماڑے لوگ تو برباد ہو جاتے ہیں۔ اب تو مجھے بتا۔ میری کٹلیا او میری پراشا جو میرا خواب، میری امید تھی۔ وہ سب تو پانیوں میں بہہ گئے۔

”کٹ گیا میں تو؟ زندگی اُجڑ گئی نا میری تو۔ بول۔ جواب دے مجھے۔ آدھے جہاں کے مالک و وارث! تجھے اُس آگ کا کچھ اندازہ بھی ہے جو میرے سینے میں جل رہی میں جل رہی ہے؟“

اُس نے سر کو چبوترے پر چنچا پھراٹھایا۔ مجھے کو دیکھا اور طہر سے بولا۔
 ”بڑا آیا عمارتیں بنوانے والا۔ نیا شہر بسانے والا اور تاریخ میں اپنا نام لکھوانے والا۔“

اُس نے گھڑسوار کو بس اتنا ہی تو کہا تھا۔ اتنا سا گلہ اور اتنی ہی شکایت ہی تو کی تھی پر اُسے لگا جیسے گھڑسوار کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں پھوٹ پڑی ہیں زمین سنسنانے لگی ہے یوں جیسے کوئی زلزلہ آ رہا ہو اور گھوڑا اس پر چڑھ دوڑنے والا ہو۔ ایوگینی خوف اور دہشت سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُسے لگا جیسے گھوڑے کی ٹاپیں سڑک کا سینہ کونٹے ہوئے اُس تک پہنچ کر اُس کا سر گچل دیں گی۔

آہ! ایوگینی بیچارہ، یوں ہی بھاگتا پھرا اور ایک دن اپنی کٹلیا میں مر گیا۔
 میں نے ایک بار پھر گھڑسوار کو دیکھا تھا اس کے چہرے اور ہاتھ کو بھی۔ تجی بات ہے کہ میں ایوگینی کی طرح بھاگی تو نہیں تھی پر خوف زدہ ضرور ہوئی تھی۔

اپنی سوچوں سے باہر آئی۔ دھیان کو دوبارہ سکریں کی طرف متوجہ کیا۔ ذہن تو کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ پشکن روس کی ایلٹی کلاس کے مجمع میں شاعرانہ کلام سناتے ہوئے قدیم کلاسیکل سٹائل کے کپڑوں میں ملبوس نظم سنار ہا تھا۔ یہ تصویر بھی کسی کمرے میں دیکھی تھی۔ اب سامنے ماسکو کا وہ گھر تھا جہاں وہ پیدا ہوا۔ سکول جہاں اُس نے پڑھا۔ اُسکے ڈھیروں

ڈھیر انداز۔

یہاں روس میں اُسے نتالیا کو دیکھا۔

نتالیا گپی رووا۔ نتالیا گپی رووا کے نام نے مجھے بھی چونکا یا تھا۔ میں ٹی وی چھوڑ کر یکسوئی سے اسکی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اسی قدر خوبصورت تھی جتنا ایک شاعر اپنی شاعری میں حسن کے گڈے باندھ سکتا ہے۔ سولہ سال کی بالی عمر کی چنچل و شوخ و شنگ لڑکی جسکے حسن اور دادوں کی روس کی ایلینٹ کلاس میں دھوم مچی ہوئی تھی۔

اب پشمن کی شادی کی تفصیلات ہوں۔ ساشا اُس کی عاشق صادق ہو اور مجھ جیسی سیاح عورت ہو جسے بہر حال ایک بڑے انسان کی زندگی کے اس پہلو سے انتہائی دلچسپی تھی۔ خود ہی جان جائیے کہ سننے اور سنانے میں شوق و مستی کا کیا عالم ہوگا۔ یہ کس قدر دلچسپ بات ہے کہ اس کی محبت کا آغاز اگر نتالیا کے نام سے ہوا تو اختتام بھی نتالیا کے نام سے ہو رہا تھا۔

”نتالیا میرے دل میں ہی نہیں دماغ میں بھی گھس گئی ہے۔“ اُسے اپنی ساس کو لکھا تھا۔

سُسرال کو شادی کی ذرا جلدی نہیں تھی۔ انکے مطالبات بھی بے شمار تھے اور تحفظات کی بھی لمبی لسٹ تھی۔ کو باپ نے بولدی نوکی جائیداد اس کے نام کر دی تھی۔ شاہی ملازمت بھی مل گئی تھی کہ شہرت بطور شاعر مسلمہ ہو چکی تھی۔ کتابوں کی آمدنی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ پر زندگی میں میانہ روی اور اعتدال نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

شاعر کا دل بُری طرح اسپر آ گیا تھا۔ اُسکے لئے وہ کسی دیوی کا روپ دھار گئی تھی۔

”میڈونا“ میں وہ اُسی سے مخاطب ہے۔

”کاش میں بتالیا ہوتی۔ اور پٹھکن نے وہ نظم میرے لیے لکھی ہوتی۔“ ساشا ہنستے ہوئے بولی تھی۔

میں بھی ہنس پڑی تھی اور میں نے کہا تھا۔
 ”جو تمہیں پیار کرتا ہے اُسے پٹھکن جیسا ہی سمجھو۔“
 ”ذرا سنو۔“

اسکی تشنہ سی آرزو سامنے آتی ہے۔ ”کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ میں اپنا گھر بھی بناؤں گا اور پرانے شاہکاروں سے اسے سجاؤں گا۔“
 ”اونگین“ میں اُس کی دلی خواہش کھل کر سامنے آتی ہے۔
 ”اب میرا مطمح نظر گھر والی ہے۔ میری سب سے بڑی تمنا پرسکون زندگی اور کوکھی کے سوپ کا پیالہ ہے۔“

ساشا کی آنکھوں میں اُترتی نمی مجھ سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔
 ”میڈونا“ میں اُس نے بتالیا کہ حسن کوئسن مریم سے تشبیہ دی اور پاکیزگی مسیح ابن مریم جیسی چاہی۔ نظم میں اُس کا یہ اظہار کہ اسکی تخلیق اس خوبصورت رنگ و روپ کے ساتھ خدا نے بنائی ہی اُسکے لئے ہے۔ خوبصورتی اور رعنائی کے اس مجسمے کو وہ اپنے گھر میں دیکھنے کا خواہشمند ہے کہ جسکے ریشے ریشے میں اسکی مشقت گھلی ہوئی ہے۔

دل کھول کر اُس نے دہن اور سسرال کی خواہشوں کو پورا کیا۔ شادی 1831ء میں جس شاہانہ انداز اور کڑو فر سے ہوئی اُس نے اُسے ساٹھ ہزار روپے کے قرضے کے نیچے دبا دیا تھا۔

”پُر دیکھو“

ساشا رُک گئی تھی۔ میری آنکھیں تجسس کی کو سے دہکتی اسکے چہرے پر جمی

تھیں۔ چند لمحے ایک پراسراری خاموشی میں لپٹے گزر گئے۔

شادی سے قبل وہ مضطرب سا تھا۔ بے چین ساجیب سے جذبات و احساسات کی
بلغاری زد میں آیا ہوا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

”کیا یہ انتہائے مُرّت ہے۔“ اُسے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔
”ہاں نہیں شاید۔“

اُسے باری باری تینوں جواب خود کو دیئے۔ پر پھر بھی کہیں اضطراب تھا۔
اور شادی سے اڑتالیس گھنٹے قبل وہ تانیہ کے پاس گیا جس کا خانہ بدوشوں سے تعلق
تھا۔

”تانیہ کچھ گاؤ۔ کوئی ایسی چیز جو میرے لیے خوش قسمتی کی تعبیر ہو۔ تم جانتی ہو میں
شادی کر رہا ہوں۔“

تانیہ کی خوبصورت غزالی آنکھوں میں گزرے دنوں کے خوبصورت عکس
جھلملائے۔ بغیر ایک لفظ بولے وہ اٹھی اُسے گتیارا اٹھایا۔ قالین پر بیٹھی۔ تاروں سے نکل کر جو
گیت فضا میں بکھرا، اُس میں نچون و ملال کا وہ رچاؤ تھا جس نے ساری فضا کو پل جھپکنے میں
غمناک کر دیا۔ شاعر نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور کسی چھوٹے سے بچے کی طرح پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگا۔

تانیہ کی آنکھیں بند تھیں۔ لمبی گردن پورے وقار سے کھڑی تھی گیت کا نچون اور
شاعر کی سسکیاں پورے ماحول پر پھیلی ہوئی تھیں۔

”آہ“ بہت دیر بعد اُسے سراٹھایا اور کہا۔ اس گیت نے مجھے ختم کر دیا۔ یہ کسی
بڑے صدمے کی پیشین گوئی ہے خوشی کی نہیں۔

میں عجیب سے بحر میں گرفتار اُسے سُنتی تھی۔

اور جب قریب عزّی میں ایک دن باقی تھا۔ اُسے اپنے دوستوں سے کہا۔

”تو آؤ کہ میرے ساتھ مل کر میرے کنوارے بچے کی زندگی کو دفن کرو۔“

اور اسکے گہرے درجن بھر دوست اکٹھے ہوئے اور چاہا کہ محفل موج و مستی ہو۔ پر حیرت زدہ ہوئے کہ وہ کیسی اذیت میں ہے۔

اپنی جوانی کو، اپنی آزادی کو، الوداع کہنے کیلئے اُسے اپنی نظم میں سے چند اشعار پڑھے۔

”میں موت کب چاہتا ہوں مجھے تو زندگی کی آرزو ہے۔ میں غم سے آگاہ ہوں اور فکر پریشانی سے بھی میرا تعلق ہے۔“

ایسے اشعار جیسے وہ جوانی کو رخصت نہیں کر رہا تھا بلکہ زندگی سے رخصت لے رہا تھا۔ جیسے وہ نئی زندگی کو نہیں بلکہ موت کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ جیسے آج کے بعد اسکی زندگی میں کل نہیں ہوگا۔

اور میز کے گرد بیٹھا اُسکے دوستوں کا ٹولہ دہشت زدہ سا اُسے دیکھتا تھا۔ اور پھر اُسے روندھے گلے اور بھرائی آواز میں انہیں خدا حافظ کہا اور اپنی مگیت سے ملنے چلا گیا۔
میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں اُس کمرے میں نہیں تھی۔ اور یقیناً ساشا بھی نہیں ہوگی۔ زمان و مکان کے فاصلے سمٹ چکے تھے۔ اور وجود وقت کی اُس منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاں دو صدی قبل کا دورانیہ متحرک تھا۔

یہ اٹھارہ فروری 1831ء کا سرد درہ فلی کیٹلی ہواؤں کے جھکڑوں میں جھولتا جھومتا دن تھا۔ پُھکن کی شادی کا دن۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی ماسکو کے چرچ Ascension میں ہو رہی تھی۔ ماسکو کی ایلینٹ کلاس چرچ میں اس اتنی شاندار شادی اور اخراجات کے تخمینوں پر تبصروں اور حاشیہ آرائیوں میں مصروف تھی۔ زرق برق گاؤں پہنے اور منقش

ٹوپیاں اوڑھے داڑھیوں والے پادری منتظر تھے۔

دہن کی آمد، اسکا شاہانہ عروسی لباس، روشنیوں کا سیلاب اور گیتوں کی آوازیں سنہری کارپٹ پر چلتی دہن کی تمکنت، حسن اور بانگین اتنا بھرپور تھا کہ وہ مسکرایا۔ اپنی گردن کو اکڑایا سینے کو اوپر اٹھایا اور اپنی قامت کو لمبا کیا کہ دہن اس سے لمبی تھی۔

سیٹوارڈ نے تقریباتی کراؤن اُنکے سروں پر رکھے اور پادری نے انہیں زندگی اُسٹھے گزارنے کے دعائیہ جملے کہے۔

اور جب انگوٹھیاں پہنائی جا رہی تھیں۔ اچانک ایک آرائشی سنگار پٹی فرش پر گری۔ خود کو اس سے بچانے کیلئے وہ چھکا۔ رحل سے نکرایا۔ صلیبی مجسمہ اور کوپیل ایک بھدی آواز سے گرے اور چٹکن کی کینڈل بجھ گئی تھی۔

شاعر کھڑا ہوا۔ چہرے پر پیلاہٹوں کی زردی کے ساتھ۔ ڈوبتی شکستہ آواز اسکے ہونٹوں سے نکلی۔

“All the bad omens”

نتالیا سے شادی پر وہ خوش تھا۔ کو شادی مسائل کے انبار لیکر آئی۔ غیر معمولی شخصیت غیر معمولی عزم و حوصلہ والا۔ جی داری سے کھڑا راجم کر کام کیا۔

”انچاز“ بھی ایک شاہکار نظم ہے۔ سلطنتوں کی ریشہ دوانیاں بے رحمی۔ سرحدوں کی وسعتوں کیلئے انسانوں کا قتل۔ ذرا سی ایک نظر

حکمران نے تیروں کو بچھایا زہر میں

نشانیہ لیا چلے میں چڑھا کر

یہ موت کے اڑتے ہوئے سندھے

سرحدوں کی جانب ہوئے نحو پر داز

ہمایوں کے لئے سوغات ہیں

زہر بھرے جام یہ

”پریشانی“ اور ”پشیمانی“ بھی کمال کی تخلیق تھیں۔

اُسے نثر، ڈرامہ، تنقیدی مضامین اور ادبی اخبار (لتر اتورنیا گزیتا جو آج بھی شائع ہو رہا ہے) میں لکھا اور خوب لکھا۔ ”Poet“ جو زمانے کے چلن۔ لوگوں کے اطوار، حسد، چلن، جیسے رویوں پر مشتمل ہے جنہیں وہ بخوبی سمجھتا ہے اور خود سے کہتا ہے کہ تیرا مضمین اور ثابت قدم ہونا ضروری ہے۔ ہجوم کی فکر نہ کر۔ واہ واہ کے نعروں پر نہ جا۔

وقت کا بادشاہ ہے تو

اپنی زندگی کا آپ مالک

تیرا شعور، تیری فراست

جلایا پائے تیری آزادی سوچ سے

ایسی دوران اُسے نکولائی کوکول کی کہانیاں کے مجموعے Evening On A Farm Near Dikanka پر بہت سے تنقیدی مضامین لکھے اور انہیں اپنے رسالے The Contemporary Boris Godunov میں شائع کیا۔ مشہور زمانہ ڈرامہ The Stone بہت پہلے کے لکھے ہوئے پر نظر ثانی کی اور چھایا۔ ”Guest“ ڈرامہ بھی بہت مقبول ہوا۔

نتالیا کو دراصل یہ احساس ہی نہیں تھا کہ جسے اُسے پسند کیا، اُسے چاہا اور اپنی شریک زندگی بنایا وہ کیا ہے۔ مہنگے ترین ملبوسات، منفرد جیولری، اپنے گرد عاشقوں کا ہجوم اور عیش و عشرت سے لبریز زندگی اُس کا منہ بھاتا تھا۔

1831ء میں شادی ہوئی اور 1835ء تک وہ چار بچوں کی ماں بن چکی

تھی۔ ماریا الیگزینڈر، گریگوری اور نتالیا۔ آغاز کا کچھ وقت اُس نے پشکن کی جاگیر پر گذارا۔ کیپٹل پیٹرز برگ میں آنے کے بعد اُس نے باقاعدگی سے کورٹ سوسائٹی میں جانا شروع کر دیا۔ سدا حوں اور عاشقوں کا جھوم اسکے گرد اکٹھا ہو گیا تھا جن میں زار نکولس اول سرفہرست تھا۔ اُسے نفرت تھی زار سے ”Cloud“ میں بادل کے استعارے میں اُس نے زار کو ہی مخاطب کیا تھا۔

یہ شب دروزچکی کے اُن دو پاٹوں کی طرح تھے جن میں وہ پس رہا تھا۔ زار نکولس کی طرف سے ملنے والا کورٹ ٹائیکل بہت تو بین آمیز تھا جس نے اُسے غضبناک کیا۔ پرنتالیا کا رویہ اس سے بھی زیادہ تو بین آمیز تھا۔

ابھی اسپر ہی اکتفا نہ تھا کہ دار الحکومت کی فضاؤں میں نتالیا کے ایک نئے سکیٹل کی افوائیں اڑیں۔ یہ فریج نوجوان جارج ڈی انٹھیس (George d' Anthes) حسن و جوانی اور وجاہت کا دلا آویز نمونہ جسے ڈچ سفیر میکرن نے اپنے بیٹا بنایا ہوا تھا۔ ”The Gypsis“ دی چسیر کے کردار اگر حقیقی تھے تو الیکو کا کردار اس کا تخلیق کردہ تھا۔ رُوسی شہری مرد۔ خانہ بدوش زمینفیرا کی ماں تاریکی میں جب اُسکے باپ کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی جاتی ہے تو شاعر کہانی کے ہیر و الیکو کی زبان سے زمینفیرا کے باپ بوڑھے خانہ بدوش سے کہتا ہے کہ تم نے اُس درندے کا پیچھا کیوں نہ کیا۔ دونوں کو کوئی کیوں نہ ماری۔ بوڑھے کا جواب اُسکے من کو نہیں لگا تھا جب اُس نے کہا۔

”محبت پر تو کوئی اختیار نہیں اور جوانی آزاد ہوتی ہے۔“

جب زمینفیرا بھی کسی اور کے ساتھ دل لگاتی ہے اور رات کی تاریکی میں اپنے عاشق سے ملنے جاتی ہے تو الیکو دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ محبت میں کیسی شراکت داری؟

تو وہ بھی الیکو ہی تھا۔ جوش غضب اور رقابت سے بھرا ہوا۔

”تو پھر آؤ۔ ڈوکل لڑتے ہیں۔“ اُس نے لکارا۔

یہ خوفناک اور شدید قسم کی ڈوکل تھی۔ بڑا اعلیٰ نشانہ باز تھا۔ وہ دو چھوٹی چھوٹی

شرطوں کا فیصلہ کو لیوں سے کرنے کا عادی تھا اور ہمیشہ جیتا تھا۔

”تو پھر کیا ہوا؟ وہ زندگی سے کیسے ہار گیا؟“

میرا اپنا لہجہ گلوگیر سا تھا۔

”جو دل سے ہار جائیں۔ زندگی بھی انہیں ہرانے پر تل جاتی ہے۔“

اُس کا تو غیض و غضب اُسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ گر نہ وہ تو ہار ہوا تھا۔

اس کی ایک نظم Thoughts دیکھو۔ وہ شاید جانتا ہی تھا۔

ہردن اور سے کی ہر ساعت

میں اسی خیال کی اُدھیڑ بن میں ہوں

کہ ان گزرتے لمحوں اور دنوں سے

موت کے سال کا اندازہ لگاؤں

میری قسمت موت کو مجھے لینے کے لئے

کہاں بھیجے گی بھلا

کسی میدان میں، حالت سفر میں

یا پھر کہیں سمندروں کے سینے پر

شدید زخمی تھا۔ لوگ اٹھا کر اسی گھر میں لائے۔ اور پورا پیٹر زبرگ اس گھر پر ٹوٹ

پڑا تھا۔ لوگ مشتعل تھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر ماتم کی کیفیت میں تھے۔ غضبناک تھے۔ موت

کی خبر کو دو دن تک چھپایا گیا۔ دو دن بعد بھی ہجوم اتنا بھرا ہوا تھا کہ آدھی رات کو خاموشی سے

میت کو رسک مناسٹری میٹاکلو فرمائے کے نزدیکی اسکی ماں کے پہلو میں دفن کے لئے لے جانی گئی۔

بہت دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے تھے۔ بتالیا کے بارے میں میرے پوچھنے پر ساشا نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا کوئی پانچ چھ سال تو زار نکولس اول کی باقاعدہ رکھیل رہی۔ پھر کہیں پیٹر دووچ لینسکوئے سے ملی۔ زار کی مکمل آشیر باد کے ساتھ اُس سے شادی کی۔ دو بیٹیوں کی ماں بنی۔ 1863ء میں فوت ہوئی۔

”ساشا نے وقت دیکھا۔ جن لوگوں کی وہ منتظر تھی وہ آنے والے تھے۔ ہم دونوں اکٹھے کھڑے ہوئے۔ میں نے اُسکے سینے پر بوسہ دیا اور ملاں کھلی آواز میں کہا۔ ساشا میرے پاس الفاظ نہیں جو تم جیسی پیاری لڑکی کا شکریہ ادا کریں۔ اگر کبھی کہیں پاکستان کا نام پڑھو تو اپنے آپ سے ضرور کہنا کہ اُس دیس میں تمہیں یاد رکھنے والی ایک عورت رہتی ہے۔ اور ہاں اگر کبھی آؤ تو میرے پاس آنا۔ تمہیں پر دیس میں اپنے گھر کا احساس ملے گا۔

پھر میں اُس کمرے میں گئی جہاں اُسے زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔ وہ بستر جہاں اُسے لٹایا گیا۔ وہ بندوق جس سے وہ زخمی ہوا۔ میز پر پڑی وہ گھڑی جو اُسکی آخری سانس کے ساتھ ساکت کر دی گئی تھی۔ چھوٹی سوئی دو (2) اور تین (3) کے درمیان اور بڑی نو (9) پر۔

وہ آگاہ تھا اپنے مقام سے۔ ایسے ہی تو اُس نے نہیں لکھا تھا کہ ایک دن رُوس کی سرزمین پر میرا نام ہوگا دنیا کی زبانوں پر میرا کلام ہوگا۔ اور زار شاہی کا منارہ میری عظمت کے سامنے سرنگوں ہوگا۔

ساشا اُس کی نظم نگہانے لگی۔

”زندگی کی شام“

میں موت کی تمنا کیوں کروں
 مجھے زندہ رہنے کی شدید ترپ ہے
 فکر و آگہی سے میرا گہرا تعلق ہے
 غم سے بھی مجھے نسبت اور عرفان ہے
 دنیا کی تنقید اور ستم بھی سہنا ہے
 کہ میرے شاعرانہ افکار ذمہ دار ہیں
 انہی شعلوں اندر زندگی بسر کرنے کا
 لطف و سرور ہے
 کبھی کسی مترنم آواز کی لہریں
 دل کو سرور دے جاتی ہیں
 کبھی یونہی اشکوں کا سیلاب بہہ جاتا ہے
 کیا خبر جب میری عمر کی ڈھلتی شام ہو
 عشق دے جائے تبسم کا چھلکتا ہوا جام



لیوٹالسٹائی
روسی ادب کا دیو
صوفیہ ٹالسٹائی
یادداشتوں کے آئینے میں

- اپنے وقت کے بڑے مادلوں اور مادل نگاروں کا اعتراف کرنے سے وہ ہمیشہ
منکر رہا۔
- اُس کا کہنا ہے کہ ایسا کرنا ہی میرا پہلا سچا اور کھرا مادل ہے۔
- صوفیہ اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہے کہ
ناسانی کے خیال میں دنیا میں محبت قسم کی کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف جسمانی
ضرورت ہے۔ جنسی تعلقات کیلئے ساتھی کی ضرورت۔ بس۔
- سچ تو یہ ہے کہ جب میں اُس کا لکھا ہوا پرہتی اور اُسے لکھتی مجھے لگتا تھا جیسے
کھلونوں کی طرح اُس کے ہاتھوں میں کھیلتے اور خیالات کسی آسانی پھوار کی
طرح اُس کے دماغ سے برستے۔

لیونا لسانی اور صوفیہ لسانی

اپنے ماسکو میں قیام کے دوران میں یاسنایا پولیانہ Yasnaya ployana جانے کی بڑی خواہش مند تھی۔ لسانی کا وہ گھر جہاں وہ پیدا ہوا۔ جہاں اُس نے اپنے ادبی شہ پاروں کی تخلیق کی تھی۔ پر جیسے وہاں حاضری دینی میری قسمت میں نہ تھی۔ یوں ماسکو میں کروپوتکن ٹریٹ پر موزے لسانی میں اس کی اپنی لکھائی میں لکھے ہوئے اُس کے دو شہرہ آفاق ناولوں وارئینڈ پیس اور اینا کرینینا Karenina کے مسودے رکھے ہوئے ہیں اور لسانی سکوائر کے دیران سے پارک میں اُس کے مجسمے کے ساتھ تصویریں وغیرہ بنوا کر دل کے رانجھے کو پر جانے کی کوشش کی تھی۔

پر یاسنایا پولیانہ جانے کی ہڑک نچلا نہ بیٹھنے دے رہی تھی۔ اُس دن اپنے ہوٹل کے سامنے ریسٹورنٹ میں ماسٹہ کرتے ہوئے میں ویٹرس ورونیکا جو یاسنایا پولیانہ سے تھی کہہ بیٹھی۔

”تمہارا تو گھر ہے وہاں۔ جس دن تمہاری چھٹی ہو۔ ہمیں لے چلو ما اپنے ساتھ۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”آپ کو معلوم ہے وہاں کوئی بھی چیز اصلی نہیں ہے۔ ندوہ درخت جنہیں ٹالسٹائی نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، ندوہ فرنیچر، ندوہ کمروں کا سامان، ندوہ تصویریں۔ دوسری جنگ عظیم میں مازی فوجوں نے ماسکو پر حملے کے دوران یا سنایا پولیا نہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایسے ننگ انسانیت لوگ تھے کہ درختوں کو کاٹ ڈالا۔ فرنیچر جلا دیا۔ یادگار تصویروں کو آگ لگا دی۔

مجھے احساس ہوا تھا کیفے کی ورونیکا اور داشا پر بھی لکھی ہی نہ تھیں ادبی ذوق کی حامل بھی تھیں۔ جب وہ پنیر پراٹھا اور بھاپ اڑائی چائے ہمارے سامنے رکھ رہی تھیں۔ میں نے اُن سے ٹالسٹائی کے اُن دونوں شاہکار ناولوں کی بابت پوچھا تھا کہ وہ انہوں نے پڑھے ہیں۔ ورونیکا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ساتھ ہی داشا کی طرف ہاتھ پھیلا یا جو کاؤنٹر پر کھڑی ہمیں مسکراتے ہوئے دیکھتی تھی اور بولی۔

”در اصل یہ صوفیہ ٹالسٹائی کو پڑھے بیٹھی ہے اور میں ٹالسٹائی کو۔ چلو اگر شام میں ایک نشست ہو جائے تو لطف آئے گا۔ آج شام ہم دونوں فارغ ہیں۔ یہیں چبوترے پر بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔“

شام بہت خوبصورت تھی۔ ہمارے ہوٹل کی دیوہیکل عمارت کیفے اور اس سے ملحقہ کمپاؤنڈ پر کسی مہرباں کی طرح سایہ فگن تھی۔ پرے بسوں کے یارڈ میں دھوپ اپنا بڑا حیا بڑے کروفر کے سے انداز میں گزار رہی تھی۔ سنبل کے بلند وہالا پیٹروں میں ہوا کی مست خرامیاں جاری تھیں۔

یارڈ کے موتی بکھیرتے نورے کی سنگی دیواروں پر بیٹھتے ہوئے ہم نے کونے والی

دوکان سے کسی اجنبی زبان میں گائے گیت کے بول فضا میں بکھرتے سُنے تھے۔ درمیانی عمر کی خوبصورت ورونیکا اُن بولوں پر جھومتے، زیر لب گنگناتے چبوترے پر بیٹھی اور ساتھ ہی اُس نے مجھ سے سوال کر ڈالا تھا کہ میں نے کون کون سے ناول پڑھے ہیں اور کس نے زیادہ متاثر کیا ہے؟

پڑھے تو میں نے دونوں تھے اور دونوں میرے پاس بھی ہیں۔ دار اینڈ پیس روسیوں کی پنولین بونا پارٹ کے خلاف عظیم جدوجہد کی شاندار کہانی ہے اِس ناول کا ایک حصہ "1805 کا سال" کے عنوان سے "The Russian Messenger" جیسے ادبی پرچے میں چھپنے سے اس کے بارے میں بے حد پسندیدگی سامنے آئی تھی۔ تین مزید باب چھپے۔ دونوں تنقید نگاروں اور عام قارئین نے اِس ناول کے تاریخی پس منظر کو پسند کیا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اینا کرینینا کی بات ہی اور ہے۔ یہ اُسکا دوسرا ناول تھا۔ اینا کرینینا کے کچھ حصے میں روس کی ترکی کے ساتھ جنگ کا بھی ذکر ہوا۔ تاہم یہ سچائی کی حقیقت نگاری اور جذباتوں کی انتہاؤں کو چھوٹا ایسا دلکش ناول جس نے اپنے وقت اور عہد کے بہترین لکھاریوں سے خود کو نوا یا۔ نقادوں کی رائے ہے۔

This is less a work of art than a piece of life,

but what it loses in art it gains in reality.

اُس کے سارے کردار تو جیسے چمک چمک کرتے میری آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔ اینا کرینینا کے چہرے پر پھیلی متانت اور خوبصورتی کی گھمبیر تا اس کے احساسات کی داخلی کشمکش، روح کی افسردگی، ورونسکی کے اندر بھرا ہوا جوش و جذبہ، جوانی کا اُسن اور جنون ایک شادی شدہ عورت سے انتہا درجے کا عشق، دلیر مگر اندر سے خوف زدہ بھی۔ ورونسکی کے

کردار کے ان پہلوؤں کی عکاسی کس درجہ خوبصورت تھی۔

لیوین Levin بھی انتہا درجے کا متاثر کن کردار ہے جو انیسویں صدی کی آخری نصف صدی کے روسی معاشرے پر اثر انداز ہوتے مختلف رجحانات جن میں تعلیم، خواتین کے حقوق، سیاسی نظریات، کسانوں کا معاشرے میں کردار جیسے موضوعات پر بے باکانہ اظہار لیوین کی شخصیت کو دلکش بناتے تھے۔

دراصل جب لکھنے والا اپنے زمانے کی معاشرتی خرابیوں کو موضوع بناتا ہے تو جاذبیت بڑھ جاتی ہے۔ اس ناول نے روسی معاشرے میں پھیلے ہوئے منافقانہ رویوں، ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کی عادتوں، حسد، بغض سے بھرے جذباتوں کی بڑی کھل کر عکاسی کی تھی۔

خاندانوں میں شادی بیاہ کے مسائل بھی اس وقت کا ایک اہم مسئلہ تھا۔ ناول میں یہ پہلو بھی مختلف انداز میں زیر بحث آیا۔ سوسائٹی میں نفسانی خواہشات کے بے ڈھنگے اور بے ڈھے اظہار، اخلاقی اقدار کی کمی، شہری زندگی کے طرز معاشرت میں دیہی زندگی اور زرعی مسائل کا دخول سب ایسے موضوع تھے کہ جو اس وقت کی سوسائٹی میں رچے بسے ہوئے تھے۔ جن کی خامیوں اور کمزوریوں سے معاشرے کا تانا بانا ہوا تھا۔

مزے کی بات یہاں ناولستانی کا منفرد اسلوب سامنے آتا ہے کہ ان پر لکھتے ہوئے ناولستانی ان کی اخلاقی نقطہ نظر یا بطور نشان دہی کے کسی وضاحت کے چکر میں ہرگز نہیں پڑا بلکہ وہ اپنے موضوع اور خیالات کو روسی زندگی کے وسیع پیمانہ میں پھیلاتے ہوئے چلا جاتا ہے اور وہ جو پیغام دینا چاہتا ہے وہ بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ کہہ لیجئے کہ لیوین کے کردار میں خود ناولستانی ہے۔ اس کی فکر، اس کے خیالات، اس کی جدوجہد، اسکے تجربات سبھی کا کھل کر اظہار سامنے آتا ہے۔

ورونیکا نے میری باتوں سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔

”دراصل تو سارا کمال ہی مصنف کا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ اُس کی ناول نگاری نے روسی سوسائٹی کی کبھی پر توں کو جن میں وہ خود بھی رہ رہا تھا تہہ در تہہ کھول کر اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

اب کوساکز The Cossacks کو ہی دیکھیں۔ یہ ناول بھی بنیادی طور پر ٹالسٹائی کے تجربات پر ہی مبنی ہے۔ جب وہ کاکیشیا کے علاقوں میں رہا تھا۔

کہانی دیکھیں ذرا۔ اس کے ایک مرکزی کردار دمتری آ لینن Olenin جو روسی فوج کا کیڈٹ ہے۔ جس پر اُس علاقے کا فطری حُسن، انسانی نفسیات اور رویوں کی پیچیدگیاں، سچائی، انسان کے اندر نیکی کا حُسن اور کوساک معاشرہ اپنے تمام تر حُسن اور کجیوں کے ساتھ آشکارہ ہوا تھا۔ کوساک لڑکی کی مارینا کی سادگی، اُس کا کاکیشیائی حُسن، پہناوے اور لوکا Luka مارینا کے مگلیتر کی دلیری، شجاعت، کینڈہ نفرت جیسے جذبات کے ساتھ ناول ایک خوبصورت ادب پارہ بن گیا ہے۔

میں محسوس کر رہی تھی کہ دل کش خدو خال والی ”وشا کیلئے اب خاموشی سے اُسے مزید سُننا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے لب کھول لئے تھے۔

آپ کی رائے اپنی جگہ اہم ہے۔ اس پر بحث نہیں ہو سکتی۔ تحریر کو دیکھنے اور پرکھنے کے پیمانے ہر ایک کے اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ تاہم میری ناقص رائے میں ”جنگ اور امن“ کو عظیم ترین ناولوں میں سے ایک شاہکار خیال کیا گیا ہے۔ اس کے موضوع کی وسعت اور کرداروں کی اختتام تک جدات کمال کی ہے۔ ناول میں بکھرے ہوئے سینکڑوں کی تعداد میں کردار کہیں گھریلو زندگی، کہیں نیپولین کے ہیڈ کوارٹر، کہیں زار روس الیگزینڈر راول اور کہیں جنگ کے میدانوں کی کیا خوب عکاسی کرتے ہیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ ٹالسٹائی کا ناول کو لکھنے کا بنیادی مقصد تو صرف ڈیمبرسٹ بغاوت کی وجوہات کو کھوجنا اور انہیں فکشن کی صورت دینا تھا۔ دراصل ڈیمبرسٹ تحریک تاریخ روس میں بڑی انقلابی تحریک بن کر ظاہر ہوئی تھی۔ مگر ہوا کیا کہ وہ بہت سے دوسرے موضوعات میں اُلجھ گیا اور یہ صرف اختتامی باب تک ہی محدود ہو کر رہ گیا جہاں اُس نے اینڈ ریو بالکونسکی Bolkonsk کے بیٹے کو ایک ڈیمبری بنا کر قصہ پار کیا۔

ہاں درونیکارک گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ کی کلی کھلی۔ آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت کی لودکی اور انگلیوں کا چنگی کے سے انداز میں بجانے کی کھٹک فضا میں کوئچی۔ میں نے نگاہوں کا رخ پھیرا۔ ماحول میں تیرتی تبدیلی نے مجھے سمجھایا تھا کہ یارڈ کی دکان سے آتی گانے اور موسیقی کی آوازیں ورونیکا کے کسی پسندیدہ گیت میں ڈھل گئی ہیں۔ بات کے موڈ میں اس وقت آئی جب گانا ختم ہوا۔

عجیب سی بات ہے ٹالسٹائی تو اپنے اس ناول کو ناول نہیں بلکہ کچھ اور ہی خیال کرتا ہے۔ یہ بھی مزے کی بات ہے کہ اپنے وقت کے بڑے ناولوں اور ناول نگاروں کا اعتراف کرنے سے بھی وہ انکار کرتا ہے۔ تاہم اس کے اس خیال کی حیرت اس وقت کم ہو جاتی ہے جب آپ محسوس کرتے ہیں کہ ٹالسٹائی ایک حقیقت پسند ناول نگار ہے جس کے خیال میں انیسویں صدی کی زندگی کے سیاسی اور سماجی مسائل میں گھری اور اس کی حقیقی ترجمانی کرتی ہی کوئی تحریر ناول ہو سکتی ہے۔

میں ہنس پڑی تھی۔

اب دیکھ لو ورونیکا وہ تو خود کہتا ہے کہ اپنا کرہ نینا ہی میرا پہلا سچا اور کھرا ناول ہے۔ اسی طرح what is to be done میں کیسے وہ ملک میں پھیلی انارکی کی کیفیت سے امن پسندی کی خواہش میں عیسائیت کے فلسفے سے متاثر روسی آرٹھوڈوکس چرچ کی گود میں

چلا جاتا ہے۔

بلاشبہ بطور لکھاری وہ روسی ادب کا دیو ہے۔ اُس نے شاہکار تخلیقات دنیا کو دیں۔ مگر بطور شوہر ایک بیوی کی نظر میں وہ کیسا انسان ہے؟ یہ بھی دیکھنے والی بات ہے۔ یہ کس قدر رستم کی بات ہے کہ وہ آدمی جس کا دماغ عجیب و غریب سے مذہبی خیالات سے بھرا ہے۔ وہ جو روسی ارسٹو کرہیسی عورتوں کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہے اور وہ رائے بڑی منفی قسم کی ہے کہ وہ اچھے کردار کی مالک نہیں۔ اور یہ کہ اُسے شادی ہی نہیں کرنی۔

اب ہوتا کیا ہے۔ شادی ماسکو میں ہوتی ہے۔ 1862 میں ماسکو کے ایک ڈاکٹر اینڈریو کی تیسری بیٹی صوفیہ بہرز Behrs سے چونتیس سال کا آدمی عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تحریری خط کے ذریعے اُسے بتاتا ہے کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شادی کے فوراً بعد اُسے اپنی ڈائریاں دیتا ہے جن میں اُس کے عشق کی داستانیں ہیں۔ اس کے عجیب و غریب سے مذہبی خیالات ہیں جن میں وہ روسی ارسٹو کرہیسی کی عورتوں کو بہت اچھی طرح جاننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ان کے بارے میں اس کے خیالات بڑے منفی قسم کے ہیں۔ اس کا فیصلہ تھا کہ وہ شادی ہی نہیں کرے گا۔

ان ڈائریوں میں اس کے جنسی تعلقات کی بھی تفصیلات ہیں۔ زرعی کسان غلام جنہیں سرف کہتے ہیں کی ایک خوب و عورت سے جنسی تعلقات اور ایک بچے کا باپ ہونے کی نوید اپنی تحریر کے ذریعے اُس کی آنکھوں سے گزرا کر دل کو گھائل کرتا ہے۔

ذرا اپنے آپ کو اس کی جگہ رکھ کر تصور کریں کہ منگوں اور آرزوں سے بھری ایک دلکش لڑکی اپنی آنکھوں میں خواب سجائے یہ سب پڑھتے ہوئے کتنی دل برداشتہ ہوئی ہوگی۔ زمانہ بھی تقریباً سوا ڈیڑھ صدی پیچھے کا ہے جب روسی عورت اتنی آزاد بھی نہ تھی جتنی آج

ہے۔ پر حقیقت یہ ہے کہ آج کی ماڈرن عورت کو بھی اگر ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے تو وہ بھی صوفیہ نالسانی کی طرح روتی اور کر لاتی ہے۔

درو نیکا کھلکھلا کر ہنسی اس کے دانت کو سفید موتیوں جیسے نہ تھے مگر خفیف سی درزوں کے ساتھ ایک تناسب سے جڑے خوبصورت لگتے تھے۔

”من وعین یہی سین نالسانی اینا کر نینا میں دہراتا ہے۔ جب چونتیس سالہ کونستین Constantin اپنی انیس سالہ منگیتر کیٹی کو ڈائریاں دیتے ہوئے کہتا ہے۔

”انہیں پڑھ لینا میرے ماضی سے واقف ہو جاؤ گی۔“

اب دونوں میں ہلکی پھلکی سی نوک جھونک کا منظر پیدا ہو گیا تھا۔

”ایک نوخیز دلہن کے جذبات کا ذرا سوچو تو یہ کتنا سفاکانہ پہلو تھا کیا تم اسے سراہو

گی۔“

دانشانے قدرے نرمٹھے پن سے درو نیکا کو گھورا اور بولی۔

صوفیہ اپنی ڈائری میں کیسے یاں بھرے انداز میں لکھتی ہے۔

”مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرے اوپر کوئی بم پھٹا ہو۔ ایک خوف میری رکوں

میں سرایت کرنے لگا تھا کہ وہ کہیں دوبارہ اس کے پاس نہ چلا جائے۔

شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے جو لکھا اُسے ذرا سنو۔

شادی جو جوانی کے خوبصورت اور محبت بھرے رومانس سے شروع ہوئی

تھی۔ سمیں کچھ خوشی بھرے لمحے بھی آئے۔ مگر ان کی مدت کتنی تھوڑی تھی۔ جھگڑے بہت

جلد شروع ہو گئے تھے۔

”وہ بہت سرد مہری کا سلوک کرتا تھا۔ گھر سے نکلتا تو گھنٹوں واپس آنے کا نام نہ

لیتا۔ میں صبح، دوپہر اور شاموں میں اکیلی ہوتی۔ مجھے محسوس ہوتا میں اس کے بچے کی نرس

ہوں، گھر میں رکھے فرنیچر کا ایک ٹکڑا ہوں۔ سٹور میں پڑے سامان کا ایک حصہ ہوں۔ میں بے حد ماکارہ اور کوئی فالتو چیز ہوں۔ میں کتنی تنہا ہوں۔“

یہ تو پاگلوں جیسی باتیں کرتی ہے۔ عورتیں تو سدا ہی شوہروں سے شاکی رہتی ہیں۔ جس سے پوچھ لو وہ سو کیڑے نکالے گی اُن میں۔ زمانہ جس کی عظمتوں کا کوہ ہوا۔ میرا وہ پیر و مرشد، میرا راہبر، میرا محبوب لینن کلاسیک لٹریچر کا دیوانہ۔ کیا بتاؤں کہ وہ نالسانی کا کتنا بڑا مداح تھا؟ اُسے بار بار پڑھتا۔ لطف اٹھاتا اور اپنی نصف بہتر سے کہتا۔

”کربسکا یورپ میں نالسانی کا مقابلہ کس سے کرو گی؟“
اپنے ہاتھوں کو خوشی و مسرت سے مسلتے ہوئے وہ اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتا۔
”کسی سے بھی نہیں۔ ارے کربسکا یا کوئی بھی اُس جیسا نہیں۔“
داشا کی آواز بھرا سی گئی تھی۔

وہ مزید اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہے۔
”میں ہمہ وقت حاملہ ہی رہتی تھی۔ زندگی کتنی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ میں اکثر اپنے دل کو ٹوٹتی اور خود سے پوچھتی ہوں۔ میں کیا چاہتی ہوں؟ اور جو جواب آتا ہے وہ مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ میرا اندر رنگ رلیوں سے بھری زندگی کا متنی ہے۔ میں سمارٹ رہنا چاہتی ہوں۔ لوگوں سے سُنا چاہتی ہوں کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ پھر جیسے میں جھٹکا جاتی ہوں اور کہتی ہوں کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟“

ورونیکا کچھ بولنا چاہتی تھی۔ داشا نے اسے بھانپ لیا تھا۔ اُسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

”عورت کے نقطہ نظر سے ان جملوں میں چھپا درد دیکھو۔“
اس کی یادداشتوں کو لکھتے ہوئے میں ایک جملہ پڑھتی ہوں۔ ”دنیا میں محبت قسم کی

کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف جسمانی ضرورت ہے۔ جنسی تعلقات کیلئے ساتھی کی ضرورت بس۔ اگر میں یہ چیزیں شادی سے پہلے کہیں پڑھ لیتی تو کبھی اس سے شادی نہ کرتی۔“
 دوشا کو کیفے کے اندر سے کسی نے آواز دی تھی وہ ابھی آئی کہتی ہوئی چلی گئی۔
 ”چلو ورنیکا تم ٹالسٹائی کی زندگی کے بارے کچھ بتاؤ۔“

نومبر 1828ء میں روس کے صوبے طلا (Tula) میں اپنی ذاتی جاگیر یا سنایا پولیانہ میں پیدا ہونے والا یہ عظیم لکھاری چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ماں شہزادی نی (Nee) اُسے صرف دو سال کی عمر میں ہی چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی۔ ان بچوں کی پرورش کی پہلی ذمہ داری ان کے باپ کاؤنٹ نکولائی ٹالسٹائی کی کزن نے اٹھائی۔ جب وہ نو سال کا تھا تب باپ بھی رخصت ہوا۔ قانونی گارجین ان کی پھوپھی ٹھہری۔ مگر ابھی تھوڑا سا ہی وقت گزرا تھا کہ اُسے بھی موت چھین کر لے گئی۔ سارے بچوں کو کا زان ایک اور خالہ کے پاس جانا پڑا۔

بچپن میں ان انتہائی قریبی رشتوں کی پے در پے محرومیاں تھیں۔ اس کا اندازہ اس کی یادداشتوں سے ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ جرمن اور فرنچ استاد تھے۔ سکولنگ میں احساس ہوا کہ وہ اچھا طالب علم نہیں ہے۔ ہمیشہ معمولی نمبر لیتا۔ کا زان یونیورسٹی سے کوئی ڈگری یا ڈپلوما تک نہیں حاصل کر سکا۔ اب کرنے کو کیا کام تھا؟ باپ کی جاگیر پر آگیا۔ کھیتی باڑی میں مصروف ہوا۔

روس میں اُس زمانے میں زرعی غلامانہ نظام رائج تھا۔ اس نے کسان غلامی تحریک کو متحرک کیا اور اُس کا لیڈر بن گیا۔ مگر وہ اسے بھی زیادہ فعال نہ کر سکا کہ آئے دن تو وہ ماسکو اور ٹولا (Tula) بھاگا پھرتا۔ تاہم ایک کام کا اس نے باقاعدہ آغاز کیا اور وہ اُس میں کامیاب ہوا اور اسی نے اُسے ناول نویسی کی طرف متحرک کیا۔ یہ اُس کا روزنامہ لکھنے کی

عادت تھی۔

ابھی وہ اپنی جاگیر پر ہی تھا جب اُس کا بھائی نکولائی Nokoley اُسے ملنے آیا۔ وہ آرمی میں تھا۔ اُس نے اُسے بھی آرمی جوائن کرنے کو کہا۔ کاکیشیائی پہاڑوں کے قصے تفصیلات کے ساتھ اُسے سنائے۔

فوج میں اُس نے جنکمر کے طور پر شمولیت کی اور یہی وہ مقام تھا جہاں اُس کی زندگی نے راہ بدلی۔ وقت کی فراوانی تھی۔ اُس نے وقت گزاری کیلئے اپنے بچپن کی یادوں کو کہانی کے طور پر لکھنا شروع کیا۔ پھر یہ اُس وقت کے پسندیدہ اور مقبول ترین روزنامہ ”The Contemporary“ میں چھپنے کیلئے بھیج دیا۔ اور بس یہی مقام آغاز تھا کہ اسے پڑھنے والوں نے انتہائی پسندیدگی کا مرتبہ دیا تھا۔

یہ اہم بات تھی کہ یہ لکھنا جیسے عادت سی بن گئی۔ جنگ کریمین (Crimean) کے دوران اُس نے لڑکپن ”Boy hood“ لکھی۔ اور اُسی دوران اُس نے جنگ سے متعلق تضادات پر اپنے خیالات کا اظہار تین سریز پر مشتمل Seva stopl Tales کے عنوان سے کرتے ہوئے اُسے ایک نیا رنگ اور نیا اسلوب دیا۔

یہ سریز ایک سپاہی کے شعور و آگہی کی خوبصورت عکاس تھی۔ جنگ ختم ہوئی۔ اُس نے فوج کو خیر باد کہا اور روس آگیا۔

تیزی سے اُبھرتے مصنف کو پیٹرز برگ کے ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔ ضدی، ہٹیلے اور منہ زور سے نالستانی نے کسی بھی ادبی تنظیم سے وابستہ ہونے سے انکار کر دیا۔ بائگ دہل اُس نے خود کو انارکسٹ کہا اور پیرس آگیا۔ جو پیسہ ساتھ لایا تھا وہ جوئے کے شوق کی نظر ہوا۔ جب جیب میں پھوٹی کوڑی نہ رہی تب گھر لوٹا۔

"Youth" جوانی نے 1857 میں چھپ کر اس مثلث کو مکمل کر دیا جو اُس کے بچپن، لڑکپن اور جوانی پر پھیلی ہوئی تھی۔ وارا اینڈ بیس کے بعد 1873 میں ایٹا کرہ نینا اور 1986 میں The Death of ivan Ilyich چھپے۔ Resurrection اُس کا بے حد ضخیم ناول تھا۔ 1904 میں ہادی مراد لکھا گیا جو اس کی موت کے بعد چھپا۔

داشا واپس آئی۔ خوبصورت دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

”اس کے فن پر قصیدے ابھی جاری ہیں۔“

”ہم تو تمہارے انتظار میں تھے کہ کب آؤ اور صوفیہ کی ڈائری کے چند ورق اُلٹو۔ اور صوفیہ کی شان میں اس کی عظمتوں کے گیت گاؤ۔

”تو سنئے پھر۔ میں ورق پلٹی ہوں۔“

میں اپنے شوہر کے لڑیری کام میں کتنی بڑی معاون تھی۔ اُس کا شاید اُسے احساس ہی نہیں تھا۔ "وارا اینڈ بیس" کو میں نے دو تین بار نہیں سات بار لکھا۔ یہ نہیں کہ اس کا کوئی حصہ جس میں کہیں ترمیم یا کوئی اضافہ ہوا ہو۔ بلکہ اول سے آخر تک لکھا۔ اس کی تمام تر سفاکیوں کے باوجود، اُس کے رُلا دینے والے رویوں سے دل برداشتہ جہاں وہ مجھے مجبور کرتا کہ میں ہر بچے کو اپنا دودھ پلاؤں اس کیلئے سبزی کا سالن بھی خود بناؤں کیونکہ وہ دو بچہ ٹرین تھا۔ کام کے بوجھ نے مجھے بیمار کر ڈالا تھا۔ کمر کا درد مستقل رہنے لگا تھا۔ نکسیر اکثر پھوٹی رہتی۔ اور دانتوں کی تکالیف آئے دن مجھے رُلاتیں۔

مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان تکالیف کی شدت اس وقت بہت کم ہو جاتی ہے جب میں اُس کا لکھا ہوا پڑھتی اور اُسے لکھتی۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے کوئی بھی چیز اتنی متاثر نہیں کرتی تھی جتنے اس کے خیالات اور اس کی ذہانت۔ الفاظ جیسے کھلونوں کی طرح اُس کے ہاتھوں میں کھیلتے اور خیالات کسی آسمانی پھوار کی طرح اُس کے دماغ سے برستے۔

بہت سالوں بعد صوفیہ کی ایک اور تحریر ہماری آنکھوں کو بھگوتی ہے۔ درمیانی عمر کی وہ عورت ابھی بھی بہت پرکشش تھی۔ ڈھیروں بچوں کے باوجود اس عورت نے اپنی ذات کو خود اذیت پرستی میں مبتلا کر لیا تھا۔ گندی اور بے ہودہ کتابیں ڈھنڈ ڈھنڈ کر لاتی اور انہیں پرہتھی۔ گھنٹوں پیانو بجاتی رہتی۔ ٹھنڈے پانیوں میں دیر تک پیرا کی کرتی اور نوجوان کمپوزر سرگئی تانیر Sergei Taneer سے کپ شپ کرتی۔

قدرتی بات تھی نالسانی کو شدید حسد محسوس ہوا تھا۔ اُس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔

”میں خودکشی کر لوں گا اگر تم باز نہ آئیں۔“

اور اُسے نہ چاہئے کے باوجود اپنی اُن تمام سرگرمیوں کو ختم کرنا پڑا جن سے وہ مسرت کشید کرنے لگی تھی۔

کاش اُسے نسائی نفسیات کی ذرہ سی بھی سوجھ بوجھ ہوتی تو وہ یقیناً میرے اندر پھیلے درد اور یاس بھرے جذبات کو سمجھتا۔

میں تو اپنے گھر میں ہی مہاجر ہو گئی تھی۔

ہم سب قدرے اُداس اور ملول سی فضا میں سانس لیتے تھے۔ داتا پھر صوفیہ کا روپ دھارے بولتی چلی جا رہی تھی۔

میں کھانا کھانے، سونے اور خاموش رہنے میں تو خود بخود تھی پر کسی ایسے کو پیار کرنے میں جس میں میری رضا اور خوشی شامل ہو آزاد نہیں تھی۔ کبھی کسی محفل میں جب لوگ یہ کہتے تم کتنی خوش قسمت عورت ہو۔ تمہارا شوہر جینٹل ہے۔ کیا تم خوش اور شکرگزار نہیں ہو؟ میرا اندر کبھی کبھی میرے چہرے پر رقم ہو جاتا تب میں حیرت بھرے جملے بھی سُنتی۔

”تم کتنی ناشکری عورت ہو۔“

اور جب میں بڑے بڑے لکھنے والوں کے تاثرات اور آراء پڑھتی جیسا کہ دوستوں کی نے کہا کہ یہ ایسا کمال کا کام ہے جس میں کوئی خلا نہیں، کوئی نقص نہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آرٹ کا شاہکار ہے۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار ولادی میر نیبو وکود Nabokov اور ولیم فوکلرز Faulkner نے کیا جن کے خیال میں وہ ایسا ناول ہے جو شاید ہی کبھی لکھا گیا ہو۔ جادوئی اثر والا۔

تب میں عجیب سے احساسات کا شکار ہو جاتی۔ بہت دیر ایک تاسف اور دکھ کی سی کیفیت میں گم رہتی۔ پھر جیسے میرا اندر بلبلانے لگتا۔ میں خود سے باتیں کرتی۔ یہ ناشکری عورت اس کی سکریزی تھی، پروف ریڈر، ایڈیٹر، ہاؤس کیپر، اس کی ایجنٹ اس کے سٹیٹ معاملات کی نگران، اُس کے تیرہ بچوں کو پیدا کرنے والی ماں اور ایک نرس۔

سچ تو یہ ہے کہ میں نے چالیس سال تک ایک جنیس کی خدمت کی۔ اپنی کتنی خواہشوں کا گلا گھونٹا اور اس نے کیا کیا؟ وہ اپنی پرسکون، آرام دہ اور پرسن گھریلو زندگی کو 82 سال کی عمر میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

صوفیہ اپنی ساٹھویں 60 کو مناتے ہوئے کہ جو عین اس دن تھی جب اُسے پروپوز کیا گیا تھا خود سے پوچھتی ہے کہ اُس نے اٹھارہ سالہ لڑکی کے ساتھ کیا کیا؟ جس نے اپنی ساری زندگی اُسے دے دی۔ اپنی محبت، اپنا اعتماد سبھی کچھ اسکے قدموں میں نچھاور کر دیا اور میں نے کیا حاصل کیا؟ اذیتیں، سر دھری، ظلم۔

زندگی کی آخری دو دہائیوں میں اُس نے ایک اور مصیبت اپنے گلے میں ڈال لی تھی۔ ایک کامیاب ناول نگار ہونے اور بے حد شہرت پانے کے باوجود وہ روحانیت کے جھنجھٹ میں پڑ گیا اور اکثر بہت ڈپرس رہنے لگا۔ "زندگی کیا ہے" اس کا مفہوم واضح کرنے

کیلے وہ آرتھوڈوکس گرجوں میں جانے لگا۔ اس کا یقین پختہ ہو گیا کہ یہ سب خرابیوں کے اڈے ہیں۔ اس نے اپنے خیالات اور عقائد کو لکھنا شروع کیا۔

1883 میں The Meditator چھپی اور ساتھ ہی اُس نے کورو کی سی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اُس کے مداحوں کے تانتے تو پہلے ہی تھے اب عقیدت مندوں اور پیروکاروں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس نئے مشغلے کی دیکھ بھال کا بوجھ بھی صوفیہ کو ہی اٹھانا پڑا۔

انہی دنوں میں وہ لکھتی ہے۔ میں خود سے پوچھتی ہوں کیا میں نے اپنے شوہر کو خوش نہیں کیا۔ کبھی کبھی میرا جی اُسے قتل کرنے کو چاہتا ہے۔ کبھی میں اپنے آپ کو قتل کرنے کا سوچتی ہوں۔

اس کی ایک اور بڑی ہی افسردہ تحریر دل کو طول کرتی ہے۔
انقلاب، ہاشویک انقلاب دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہونے جیسی سرکوشیوں نے واضح صورت اختیار کر لی ہے۔ آئے دن دھمکیاں ملنا معمول بن گیا ہے۔ تاریخ ہر چیز کو تباہ کرنے پر تلی نظر آتی ہے۔
آف میں اپنی چار ہزار 4000 ایکٹر کی اسٹیٹ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے خود سے کہتی ہوں۔

”ہمیں یہاں رہتے ہوئے ہمیں نصف صدی گزر گئی ہے۔ اس طرز زندگی کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ہر روز ہم اکٹھے ہوتے ہیں۔ میننگ ہونا معمول بن گیا ہے۔ اس میں سوچ بچار ہوتی ہے کہ ہمیں اس لوٹ مار سے خود کو کیسے محفوظ رکھنا ہے؟ میری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ ہمارے گھوڑے، پنجر، بتیل مزارعے سب طولاً کی ہائی وے پر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میری ہر وہ چیز لٹتی جا رہی ہے جس سے مجھے پیار ہے۔ جن کے ساتھ میرا وقت گزرا جو

میرے خوشی اور یاس کے دنوں کے ساتھی ہیں۔

موت بھی عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی۔

نمونینے کا پرانا مریض تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ و اشتعال، بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ خودکشی کرنے کی خواہش بھی اکثر اندر سر اٹھاتی تھی۔

ٹالسٹائی کا ایک بااعتماد پیرد کارولد دی میر chertkov سابق فوجی افسر ایک بڑا بیوروکریٹ اس کے ادبی معاملات کو ذیل بھی کرتا تھا۔ صوفیہ کی آنکھوں میں نیچے کی طرح کھٹکتا تھا۔ اس کے خیال میں وہ شیطان تھا۔ اُسے دونوں کے درمیان جنسی تعلقات کا بھی شبہ تھا۔

7 نومبر 1910 کی سرد ہڈیوں میں کودا جاتی رات تھی۔ جب بیاسی 82 سال کی عمر میں اُس نے ڈرامائی فیصلہ کیا۔ اُس نے اُس عورت کو جو اس کے ہر دکھ درد میں اس کی ساتھی تھی کو بتانے کی تکلیف بھی کواراندہ کی کہ اسے دل میں کیا ہے؟

آدھی رات کو اُس نے کسی کو بتائے بغیر اپنا آرام دہ گھر اپنی اسٹیٹ چھوڑی۔ چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد وہ شرماردینو Sharmardino پہنچا۔ یہاں اس کی بہن ماریا رہتی تھی۔ یہیں کوئی ہٹ کرائے پر لے کر وہ بقیہ زندگی گزارنے کا متنی تھا۔ لیکن اُسے وہاں ٹکنا نصیب نہ ہوا۔ اُسے مجبور کیا گیا کہ وہ کاکیشیا جانے کیلئے گاڑی میں سوار ہو۔ اس کی کمزور صحت اسے برداشت نہ کر سکی۔ Astaporo ایک بہت چھوٹے سے دور افتادہ سٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر نے اُس کیلئے اپنے گھر کے دروازے کھولے۔ یہ بیس 20

نمبر تھا اور وقت ساڑھے چھ کا جب اُس نے دنیا کو الوداع کہا۔
اور میری آنکھیں گیلی تھیں۔ دایا کی آنکھیں گیلی تھیں۔



دوستووسکی
روس کا عظیم کلاسیکل ناول نگار
اور
اینا دوستووسکی

- o دو گھنٹے سے زیادہ وقت میں نے ایسا دوستوں کی کے کمرے میں گزارا۔ میرے سارے جذبے اس عورت کو خراج تحسین پیش کرتے تھے جس نے ساری زندگی کرائے کے گھروں میں گزاری۔
- o میں اپنے بارے میں پر امید ہوں۔ انسان ایک سر بستہ راز ہے اور اسے کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
- o "Poor Folk" میں اس کا ہیرو کوئی رومانوی کردار نہیں تھا بلکہ معاشرے کا ستم رسیدہ غیر اہم شخص ایک کلرک تھا۔ انسان کے اندر کی چٹائی کی تلاش کو اس نے اپنی تحریر کا منہا ٹھہرایا۔

اومسک Omsk جیل میں چار سالہ مشقت بھری قید نے اسے اتنی تکلیف نہیں دی جتنی قلم کاغذ اس کے ہاتھ سے چھٹنے پر ہوئی۔ اسے اسی کا ڈر تھا اور یہی اُس نے کہا۔
 ”اگر مجھے لکھنے نہ دیا گیا تو میں مرجاؤں گا۔ کاغذ اور قلم کے ساتھ میں پندرہ برس کی سزا کو بھی بخوشی کاٹنے کے لئے تیار ہوں۔“

بیرکوں میں یہ چار سال چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ اُس نے گزارے۔ ان کرداروں میں جو گہرائی، توانائی اور خوبصورتی اس نے دیکھی وہ کہنے پر مجبور ہوا۔

”یہ تو بد صورت سیپیوں میں بند وہ سونا ہے جن کی دریافت میں نہ مجھے اپنے برسوں کے ضائع ہونے اور نہ کاغذ قلم نہ ہونے کا دکھ ہے۔ میں نے ان حیرت انگیز لوگوں کو باریک بینی اور سچائی سے پڑھنے اور ان کے کرداروں کی بے شمار جہتوں کو پرکھنے کی جو کوشش کی ہے وہ میرے لئے بہت بڑا اثاثہ ہے۔“

میں نے رُوس کو نہیں پر رُوسی لوگوں کو ضرور جانا اور سمجھا ہے۔“

دوستو و سکی اور اپنا دوستو و سکی

سچ تو یہی تھا کہ میں تو سینٹ پیٹرز برگ کے ریلوے سٹیشن سے ہی سیدھی اُس
عظیم مادل نگار کے گھر اور میوزیم جانے کی خواہش میں بے حال تھی۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ
صورت اس شعر کی غماز تھی۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار

اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ایک تو میری ساتھی محل میناروں کی شیدائی۔ ونٹر پیلز اور ہر میٹھیج کا سبق گھر
سے پڑھ کر چلی تھی۔ دوسرے میں خود بھی محلات اور چہ چوں کے طرز تعمیر کی فنکار یوں فنون
لطیفہ کی گھمبیر تاؤں اور ان کی بولمونیوں میں یوں اُلجھی کہ دوستو و سکی ذرا سادل سے اوجھل
ہو گیا۔

چوتھے دن سویرے سویرے مجھے اس کی ہوک انھی تھی۔ میں تک گائیڈ ہاتھ میں
پکڑے ریپشن پر چلی گئی۔ ریپشن پر ہر دوسرے دن ایک نئی لڑکی ہوتی۔

آج جو کھڑی تھی وہ پونے چھٹی سر د کے بونے جیسی قامت والی جس کی صراحی
دار گردن پر جو سر نکا تھا اُس پر ایک گلاب چہرہ سر دیوں کی چاندنی راتوں کی طرح سنجیدہ اور

اُداس سا جھلملاتا تھا۔ ایک تو مجھے ان روسی لڑکیوں کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ کمبختیوں مسکراہٹ کے لئے اتنی کمینی اور کنجوس کیوں ہیں؟ منحوس ماریاں کلیوں کے اِس چٹکاؤ کو سات تالوں میں کیوں قید رکھتی ہیں؟ بھلا اس پر کوئی زور خرچ ہوتا ہے۔ کوئی پیید لگتا ہے۔ کون انہیں سمجھائے کہ باجھوں کو ذرا سا کھول دینے سے ان کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

ہاتھ میں پکڑی گائیڈ بک میں نے کاؤنٹر پر رکھی اور اُسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے دوستو و سکی کی تصویر پر انگلی رکھی۔ ہاتھ فضا میں استفہامیہ تاثر دیتے ہوئے لہرایا۔
”جیکسی۔“ وہ بولی۔

”نیت۔ (نہیں) میٹر دیالز۔“ میں نے جواب دیا۔
یہ بھی مقام شکر تھا کہ وہ انگریزی کا وال دلیا کر لیتی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس نے مجھے بتانا چاہا کہ تم جیکسی کر لو ٹھیک رہو گی۔

”ارے مجھے سُنتے نے کا نا ہے جو جیکسی کر لوں۔ ایک دو کلو میٹر کا راستہ اُس نے گھما پھرا کر دس کا کر لیا ہے۔ اور پانچ سو چار سو روپے بل جھاڑ لینے ہیں۔ رُوس کے جیکسی ڈرائیور بھی اول درجے کے کامیاب ہیں۔ غیر ملکیوں کو لوٹنا جانتے ہیں۔ یوں بھی من موجدی اور ٹریفک قواعد و ضوابط میں لاپرواہ سے ہیں۔ ایسی ایسی پھرتیاں دکھاتے ہیں کہ مانو لگتا ہے جیسے سواری کو تو اُوپر پہنچا کر ہی دم لیں گے۔
لڑکی ہنس پڑی اور بولی۔

”آپ تو میرے سامنے زمین پر زندہ سلامت کھڑی ہیں۔ یہ بڑے ماہر ڈرائیور ہوتے ہیں۔ گھبرایا نہ کریں۔“

”بس تم مجھے سمجھا دو۔ میٹر دیالز کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں۔“

”میٹرو سے۔“ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

اس کی حیرت پر مجھے اچھنچا ہوا۔

”لو یہ ہمیں کیا گاؤ دی عورتیں سمجھ رہی ہے۔“ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

چلو خیر کچھ زبان اور کچھ چہرے نے سمجھا اور سمجھایا۔ اور ہم لوگ چلے۔ سادو وایا

Sadovya میٹرو سے دوستو و سکی سکایا میٹرو پر اترے۔ باہر آئے۔

گاڑیوں بسوں سے بھرا ہوا یہ چوک جس کے عین سامنے خوبصورت ولادی میر

چرچ تھا جس کے ساتھ ہی کزنچنی Kuznechny لین ہے۔ نقشے پاس ہونے کے

باوجود ہم لوگوں کو روک کر پوچھنے میں ذرا سانا مل نہیں کرتے تھے۔

مگر اس پریکٹس کے باوجود ہم پرانی یم سکایا سٹریٹ سے ذرا آگے نکل گئیں جواب

دوستو و سکی سٹریٹ کہلاتی ہے۔

جب واپس پلٹنے لگے تو فٹ پاتھ پر چار بوڑھی عورتوں کو تازہ سلاوا کی سُرُخ

مولیاں، ہرا پیاز، پودینہ اور گاجر میں بیچتے دیکھا۔ مولیوں اور گاجروں کی خوش رنگی اور تازگی

اپنی جگہ تھی۔ پر جو بوڑھیاں دوکاندار بنی وہاں کھڑی تھیں وہ اپنے پہناؤں کے ساتھ

پیئرز برگ کی قدیم تہذیب کی نمائندہ تھیں۔ موٹی چنٹوں والے لوگ سکرٹ، پوری

آستیموں والے لمبے بلاؤز اور سروں پر خاص قسم کی ٹوپیاں اوڑھے۔

مولیاں اتنی تازہ اور خوش رنگ تھیں کہ بے اختیار اُسی وقت جی چاہنے لگا کہ ابھی

پکڑیں اور کچر کچر کھانا شروع کر دیں۔ یقیناً ایسا کر بھی لیتے پر ایک تو ابھی سویر تھی۔ بھاری

بھر کم ناشتہ کیلج پر دھرا تھا۔ دوسرے گرو کے گھر جا رہی تھیں۔ طے کیا کہ خرید لیتے ہیں۔

بیگ میں رکھ لیں گے۔ سکتلف اور غلیب (براؤن بریڈ) کے ساتھ مزیدار ڈنر کا سامان ہو

جائے گا۔

اب قیمت کا پوچھا۔ انگلیوں سے ایک خوبصورت سمارٹ سی بائسکا نے چار کا اشارہ دیا۔ سات آٹھ بندھی مولیوں کا یہ گچھا ہم نے دو اور تین میں خریدنا چاہا پر وہ چار کے اشارے پر ڈٹی رہی۔

چلو خیر پانچ روبل کا سکھ دیا اور ایک روبل کی واپسی کیلئے ہاتھ کیا بڑھایا جیسے لگا کہ شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ بیٹھے ہیں۔ خوانخواہ چیلوں کے زرعے میں آگئے ہیں۔ خوفناک شکاری ٹٹوں کے گھیر میں پھنس گئے ہیں۔ اسکی ساتھی عورتوں نے فی الفور چار اور صفر کا اشارہ دیتے ہوئے غنصیلی نگاہوں سے یوں گھورا جس میں پیغام تھا فو رائیسیہ دو چالیس روبل۔

”چالیس روبل۔“

میری آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ ان پانچ چھ مولیوں کے گچھے کے چالیس روبل۔ ناممکن۔

میرا تو سانس لینا مشکل ہو گیا۔ پل بھر کیلئے سوچا۔ پھینک دیں انہیں اور بھاگ جائیں۔ کیا کر لیں گی؟ پر سوچ آئی تھی کہ اگر تعاقب ہو گیا تو مارے جائیں گے جو مرضی الزام لگا دیں۔ ہماری کس نے سننی ہے؟

قہر درویش بر جان درویش۔ چالیس روبل کے نوٹ دے کر جان کی خلاصی کروائی۔ تھوڑا سا آگے چلنے پر سبزی اور پھل مارکیٹ نظر آئی تو اندر جا گھسے۔ پختہ چبوتروں پر تازہ خوش رنگ پھلوں اور سبزی کے سلیقے سے لگے ڈھیروں پر قیمتوں کے کارڈ بھی دھرے تھے۔ پوری منڈی میں عورتوں کی حکمرانی تھی۔

”اوہو تو یہی بائسکا مارکیٹ ہے۔ ہر رُوسی کا مضافات میں چھوٹے ٹے یا بڑے گھر کا ہونا ضروری ہے جسے ڈاچا کہا جاتا ہے۔ اس کے باغیچے میں سبزیاں پھلدار درخت لگائے جاتے ہیں۔ اکثر بوڑھی عورتیں صبح سویرے اپنے ڈاچوں سے سلا داوڑ پھل لا کر فروخت

کرتی ہیں۔ کہیں یہ دکانداری منظم صورت میں کہیں فٹ پاتھوں اور چوراہوں پر بکھری ہوئی۔

جنہوں نے ہمیں لوٹا وہ ذرا مٹھی قسم کی بابشکا ہیں تھیں کہ جوتھوڑے سے مال متاع کے ساتھ سڑکوں پر ڈیہ لگاتی ہیں اور جہاں داؤ چلا مہنگے داموں بیچ کر اپنی دیہاڑی کے ساتھ گھروں کو لوٹ جاتی ہیں۔

مارکیٹ کی عورتیں تو سچی بات ہے بڑی مرد مار قسم کی تھیں۔ پکے پھیٹے بنیوں کی طرح اپنے اپنے اڈوں پر ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔ گاہکوں میں بھی قسم کھانے کو کوئی مرد نہ تھا۔ مولیوں کا گچھا پانچ روپل کا تھا۔

دل نے رنج کے اُن کھوسٹ بڈھیوں کو لعن طعن کیا۔

اب دل کو اس پینتیس روپل کے نقصان کی دل گرفتگی کے اثر سے نکالنے، اس سارے قضیے پر دو حرف لعنت کے بھیجنے اور دوستو و سکی سے ملاقات کی آتش عشق کو پھر سے تیلی دکھانے کی ضرورت تھی۔ سوہم نے پہلے لعنت بھیجی۔ پھر تیلی جلائی اور آگ بھڑکا دی۔

تو اب نظروں کے سامنے یہیں کونے پر وہ چار منزلہ عمارت کھڑی ہے جس کے ایک اپارٹمنٹ میں اکتوبر 1878ء میں وہ میرا محبوب لکھاری اپنی فیملی کے ساتھ شفٹ ہوا اور یہی وہ گھر تھا جہاں 1846ء میں بھی اس نے کچھ وقت کرایہ دار کی حیثیت سے گزارا تھا۔ کو یا یہ گھر اس کی تخلیقی زندگی کی ابتداء اور انتہا تھا۔

میں دروازہ بسمت کی چند سیڑھیاں اتر کر تھا۔ پہلے پوڈے پر قدم دھرنے سے قبل میرا جی چند لحوں کے لئے چبوترے پر بیٹھ جانے کو چاہا۔

میں اور مہر النساء بیٹھ گئیں۔ میں کچھ جذباتی ہو رہی تھی۔ نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میری پلکیں اظہار تشکر کے طور پر بھیگ سی گئی تھیں۔ بھلا میری اتنی

اوقات کہاں تھی کہ میں تاریخ و ثقافت سے لبالب بھرے اس شہر میں آنے اور اس عظیم مصنف کے در پر حاضری دینے کا سوچ سکتی۔ تیری عنایت ہی ہے نا۔

اور پھر میں بھاری بھر کم چوہنی دروازے کو دھکا دے کر فیدر دوستوؤسکی Fyodor Mikhail Dostovsky کے گھر میں داخل ہوتی ہوں۔ سو رد بل کا ٹکٹ خرید کر چھوٹی سی راہداری میں گری میز بچھائے ٹیبل لیپ کی روشنی میں کام کرتی خاتون کے گائیڈ کرنے پر سیڑھیاں چڑھتی ہوں اور جب ایک کے بعد ایک پوڈے پر قدم رکھتے ہوئے اوپر اٹھتی چلی جاتی ہوں تو لگتا ہے جیسے اس کے ناولوں کے کردار بھی میرے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔

بڑا کمرہ سامنے آتا ہے۔ یہ ہال کمرہ تھا جس میں رکھے ٹی وی کی سکرین پر اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ڈاکو میٹری چل رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھا ہوا، صوفے پر ہی آرام کرنا، کھانے کی میز پر، چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے، دریائے نیوا کے کنارے سیر کے لئے جانا، کینڈل پکڑے، برفباری کے دوران نیپلے سے برف ہٹاتے، پودوں کو پانی دیتے، کھانا کھاتے، چائے پیتے، لکھتے۔

اس کی زندگی کے بے شمار روپ ہم نے زہر مہرہ رنگے میٹ پر چوڑی مار کر بیٹھتے ہوئے دیکھے۔ اس کمرے میں ہمارے علاوہ ساؤتھ کوریا کے دو لڑکے اور گری پر براجمان موٹی نازی رُوی نگران خاتون تھی۔

فلم ختم ہونے کے بعد بھی میں ویسے ہی بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں میں محبت اور عقیدت کے دیئے جلتے تھے۔ بند کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھتی اور یہ سوچتی ہوئی کہ اس گھر میں اس کا دوبارہ آنا کس قدر شدید جذباتی صدمے کا نتیجہ تھا۔

میرے سامنے اس کی بیوی "اینا" "Anna" کی وہ تحریر تھی جس میں ممتا کا وہ

دُکھ جھلکتا تھا کہ جب اُن کا سب سے چھوٹا بیٹا لائیو شا Lyosha فوت ہوا۔ اُسے مرگی کی بیماری اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ دونوں میاں بیویں کو وہ گھر جس کے چٹے چٹے پر ان کے لاڈلے بیٹے کی یادیں بکھری ہوئی تھیں کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

بیٹے کے اِس دُکھ نے انہیں ایک نئے تجربے سے روشناس کیا۔ جہاں انہوں نے گھر بدلا وہیں وہ ولادی میر سلوویو Solovyov کے کہنے پر آپٹن مناسٹری زیارت کے لئے گئے جہاں ”ایلڈر“ نے اُن کی پریشان اور غم زدہ حالت پر انہیں اپنی محبت اور دعاؤں سے نوازا۔ دوستووسکی کا یہ روحانی تجربہ اور قلبی طمانیت اُس کے ناول The Brothers Karamazov میں نمایاں ہوئی۔

چھ کمروں کے اپارٹمنٹ میں یہی وہ ہال تھا جس کا ذکر اینا نے بہت تفصیل سے کیا تھا۔

میں اُنھی۔ سامنے دیوار پر پیٹرز برگ کی اٹھارویں صدی کی طبعی صورت کی بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی۔ جب گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ مردوں کے لمبے فرائم نما پہناوے اور عورتوں کی زمین بوس ہوتی فرائم نما میکیاں، سروں پر سکارف نمابڈ اور کوٹ نما گاؤں تھے۔

سینا سکوائر میں خرید و فروخت کا ایک منظر زندہ تھا۔ ہال نایاب تصویروں، خوبصورت سچے پینٹنگز جن میں لندن کا سینٹ پال کتھیڈرل، کرسٹل پیلس، روم کا پیٹرسکووائر اور میلان کے کتھیڈرل چرچ بہت نمایاں تھے۔

پھر یوں ہوا میں ٹھٹھک کر رُک گئی۔ ایک ایسی تصویر میرے سامنے تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

”یہ ہیمز ہولبین دی یونگر“ Hans Holbein the younger کی

”دی ڈیٹھ آف جیمز“ The death of jesus پر وہ شاہکار اور نایاب پینٹنگ تھی جس میں اس نے جیمز Jesus کے پورے وجود پر یکھری موت کی اذیت اور درد مایکیوں کو پینٹ کیا تھا۔ جیمز کے جسم کی اذیت کی عکاس ایک ایک ہڈی پسلی، زخمی ہاتھ پاؤں خوفناک کرب و درد سے متا چہرہ، ہر احساس سے بے نیاز نیم کھلی آنکھیں، ناک ٹھوڑی اور منہ نیلا ہٹوں میں ڈوبا ہوا۔

یہی وہ پینٹنگ تھی جسے دیکھنے کے لئے وہ خصوصی طور پر باسل (Basel) سویٹزرلینڈ گیا اور اسی کے بارے میں اس نے کہا تھا۔
 ”اس نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ پر ہولین ایک حیرت انگیز آرٹسٹ اور شاعر ہے۔“

انٹرنس ہال میں اس کی چھتیاں، ہیٹ اور صندوق دیکھتے ہوئے زمسری میں داخلہ ہوا۔ جب یہ خاندان یہاں شفٹ ہوا، اس وقت لیو بو Liubov بیٹی نو سال اور بیٹا فیودور سات سال کا تھا۔

کمرہ ایک خوبصورت گڑیا، رانگ ہارس، چند گرسیوں، بچوں کی رانگنگ ٹیبل اور میز پر رکھے بیٹے کی طرف سے باپ کو لکھے ہوئے لفافے سے سجا ہوا تھا۔

دوستو و سکی اپنے بچوں سے کس قدر پیار کرتا تھا اور ان کے بارے میں کتنا فکر مند رہتا تھا۔ اس کا اظہار اس تحریر سے ہوتا ہے جو ”اینا“ نے اپنی یادداشتوں میں لکھی۔ اگر وہ اپنے علاج یا کاروباری معاملات کے سلسلے میں ملک سے باہر ہوتا تو ”اینا“ کو ملنے والے خطوط اس کی اور بچوں کی محبت سے بھرپور ہوتے۔ وہ اپنے بچوں کو کم عمری سے ہی رُوسی اور یورپی ادب پڑھانے کا متمنی تھا۔ کوکول، پھلکن، ڈکنز Dickens اور وکٹر ہیوگو سے تو بچے چھوٹی عمر میں ہی مانوس ہو گئے تھے۔ وہ اکثر بچوں کو پاس بٹھا کر بائبل کو اُونچے اُونچے

پڑھتا۔ ایک بار بیٹے کی شکایت پر اس نے مجھے لکھا۔

”اینا تم فیو دور کے باہر جانے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے پر پریشان ہوتی ہو۔ دیکھو وہ بچپن سے بلوغت میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کی شخصیت کے بارے میں بہت سی گہری باتیں میرے مشاہدے میں آئی ہیں۔ گھبراؤ نہیں شاید تمہیں اس کا احساس نہ ہو کہ میں یہاں اس کے متعلق کتنا فکر مند رہتا ہوں؟ ہمیں ایک طویل مدت تک اس کے ہاتھوں میں کتابیں دے کر اسے پڑھانا ہے۔“

اور مہینہ یا سی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کی بیٹی لیو بونے بہت سی کتابیں جن میں "Sick Girl" ویمین لائزاور "دوستوں کی اپنی بیٹی کی نظر میں" بہت مشہور ہوئیں۔ فیو دور گھوڑوں میں دلچسپی کے باعث ایک کامیاب ٹریزر اور ماہر ہورس بریڈر بننے کے ساتھ ساتھ شاعر اور تنقید نگار بھی تھا۔

نرسری سے ہی میں اینا کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

اینا جریمکوریٹا Anna Grigorriena کے لئے میرے جذبات میں جو محبت، ستائش اور عقیدت کا دریا سامو جیس مارتا تھا۔ وہ جیسے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے قابو سا ہو گیا۔ کیا عورت تھی وفا کے شیرے میں لتھڑی ہوئی۔ کمرہ سادگی کا نمونہ تھا۔ کھڑکی کے پاس کونے میں رکھی رائٹنگ ٹیبل، ایک الماری، صوفہ نما ٹری میز۔ میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ سکھ کا لمبا سانس میرے اندر سے نکلا تھا۔ رُوس میں ہر تاریخی محل، میوزیم، پارکوں، شاہراہوں پر جا بجا صوفے آرام دہ کرسیاں اور بیچ رکھے ہوتے ہیں۔ سیاح پیدل چلتے چلتے تھک جائیں۔ بیٹھیں، سستائیں، سوچیں، خلقت کو دیکھیں، جو مرضی کریں۔ استنبول میں کہیں بیٹھنا تو دور کی بات کسی دیوار کے ساتھ لمحہ بھر کی ٹکی بھی ڈیوٹی پر حاضر پولیس والوں کی نگاہ میں فی الفور آ جاتی ہے اور وہ آپ پر کسی شکاری کی طرح حملہ آور ہو جاتا ہے۔

یہیٹنا میں وہاں بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے اس عورت کی قربت کی مہک محسوس کرنا چاہتی تھی جو صرف بیس سال کی عمر میں اپنے سے دو گنی عمر کے شخص کی زندگی میں ایک ایسے وقت داخل ہوئی جب وہ مصائب کے ہاتھوں حد درجہ پریشان تھا۔

دوستو و سکی کے لئے 1854ء کا سال بہت پُر آشوب تھا۔ اس کی بیوی ماریا بھائی میخائل اور گہرا دوست نامور محقق اور شاعر اپولون Apollon جو اس کے ذاتی اخبار ”دی ٹائم“ اور ”دی آپوچ The Apoch“ میں اس کا معاون تھا۔ یکے بعد دیگرے اسے تنہا چھوڑ گئے۔ انہی دنوں اس نے ایک جگہ لکھا۔

”میری زندگی ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔“

اپنے بھائی کے قرضے اُتارنے کے لئے وہ کمیشن پر لکھنے کے لئے مجبور ہوا۔ وقت کی ایسی ہی کڑی گھڑیوں میں اسے ایک ایسا ناول لکھنے کی پیشکش ہوئی جس کی مدت تکمیل صرف ایک ماہ تھی۔ معاہدے کی رُو سے ناکامی کی صورت میں وہ مستقبل میں اپنے کام کی رائٹلی سے محروم ہو جاتا۔

”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

اُس نے اپنے دوست سے مشورہ کیا۔

”ایک سٹیوگرافر رکھو۔“

دوست نے حل بتایا۔

تب چار اکتوبر 1866ء کی ایک آمد آلود و پہر کو کتابی چہرے پر سچے ستواں ناک اور خوبصورت آنکھوں والی دلکش لڑکی جس کے براؤن فراک کے گلے اور آستینوں پر لگی دیدہ زیب لیسیں لہراتی تھیں اس کے گھر میں سٹیوگرافر کی حیثیت سے داخل ہوئی اور ٹائپ رائٹر پر بیٹھی۔

”The Gambler“ چھپیس دنوں میں مکمل ہو گئی۔

کام کے اختتام پر اُسے احساس ہوا کہ وہ اس مہربان اور بہادر لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

”میں اُس سے کیسے بات کروں؟“ اُس کے باریک بھینچے ہوئے ہونٹوں سے تذبذب میں ڈوبا ہوا یہ سوال اُبھرا جو دل کی سرکوشی میں اپنے آپ سے تھا۔ وہ رڈ کئے جانے سے ڈرتا تھا۔ پھر اُس کا عندیہ لینے کے لئے اُس نے فرضی مادل کا پلاٹ گھڑا۔ ایک چوالیس (44) سالہ مرد جو مریض بھی ہے کا بیس (20) سال کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہونا اور ایسا سے یہ پوچھنا کہ ذرا سوچو تو کیا اُمٹگوں سے بھری ہوئی اُس نو جوان لڑکی کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایسے مرد کی محبت کا جواب محبت سے دے؟

”کیوں نہیں۔“ اینا نے نگاہیں اٹھائیں اور اُسے دیکھا۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر فکّر بھری لکیریں تھیں۔

”محبت تو ان سب باتوں سے بالا ہوتی ہے۔“

بس تو جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے۔ وہ بھی کھل اٹھا اور اپنا آپ کھول کر سامنے رکھ دیا۔

”اینا میں جانتا ہوں میری عمر کا ایک مرد تم جیسی نو جوان لڑکی کے لئے قطعی موزوں نہیں پر پتہ نہیں میرا دل کیوں کہتا ہے کہ تم مجھ جیسے بکھرے ہوئے انسان کو سمیٹ لو گی۔ مجھے پیار دو گی کہ تمہیں پیار دینا آتا ہے۔“

اور اینا نے اُس کے چہرے کو دیکھا جو اپنی چمکتی بھوری آنکھوں میں آرزوؤں کا ایک جہاں سمیٹے اُسے دیکھتا تھا۔

تب اُس نے خود سے کہا کہ اگر وہ نفی میں جواب دیتی ہے تو یہ اُس کی خودداری

اُس کے پندار اور اُس کی عظمت کے لئے کتنا بڑا دھچکا ہوگا۔

”نہیں۔ میں اسے افسردہ اور ملول نہیں دیکھ سکتی۔ یہ انسان مجھے بے حد عزیز ہو چکا ہے۔“

بیاباہ کا دن پندرہ فروری طے ہوا۔ اور رسم کی ادائیگی کے لئے ٹرنٹی کھیٹنڈل کا نام تجویز کیا گیا۔

یہ سب تو ہو گیا۔ پر کچھ گھمبیر سے مسائل ابھی بھی اُس کے سامنے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان میں سرفہرست اُس کا ویڈنگ ڈریس تھا۔ یہ کیسا ہو؟ اور اُس کی خریداری کہاں سے کی جائے؟ دوستوں کی کے لئے تو پیسے کی فراہمی بھی مسئلہ تھی۔

سمجھدار ذہین لڑکی نے اُن بہت سارے سوالوں کے جنہوں نے اُسے پریشان کر رکھا تھا کا جواب دے کر اُس کے تفکرات کو تحلیل کر دیا۔

”بھئی آخر میں سلائی کڑھائی کی اتنی ماہر ہوں۔ اپنا محروسی جوڑا خود ڈیزائن کروں گی اور اُسے سلمہ ستارے سے خود ہی سجالوں گی۔ تم کوئی چٹا مت کرو۔ رہا کپڑا تو وہ میرے پاس ہے۔“

شادی ہوئی اور مصائب کا آغاز بھی ہو گیا۔ ابھی استقبالیہ دعوت تھی۔ جب نئی نویلی دلہن کو دو لہا سنبھالنا پڑا کہ دوستوں کی نے شمشپین ضرورت سے زیادہ پی لی۔ مرگی جس کا وہ پرانا مریض تھا کا دورہ پڑ گیا۔ گھنٹوں وہ درد سے بے حال رہا اور دلہن اُسے اپنی بانہوں میں اور کبھی اُس کا سر اپنی گود میں رکھے اُسے سنبھالتی رہی۔ پہلے ہی دن سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹنے اور اُس کے ڈکھ کو بانٹنے کا یہ کام اُسے ساری زندگی کرنا پڑا۔

صحت کا مسئلہ تو ایک طرف۔ اس کے ساتھ معاشی مصائب بھی خون پُوسنے والی

جنکوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ قرض خواہوں کی خوفناک دھمکیاں، اُن کا آئے دن تنگ کرنا، اُس کی جائیداد تھہیانے کی سازشیں، بیس (20) سالہ لڑکی اُن سب کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے اپنی ذاتی چیزیں بیچیں اور کچھ سالوں کے لئے شوہر کو اُن کے پھنگل سے نکال کر باہر لے گئی۔

بیرون ملک یہ زندگی مُشکلات اور مصائب سے بھری ہوئی تھی۔ پیسے کی تنگی، مشرقی یورپ میں خانہ بدوشوں جیسی زندگی، بسا اوقات کمرے کا کرایہ ادا نہ کر سکنے پر لینڈ لارڈ کی صلواتیں، دوستوں کی خراب صحت، اکثر اُس کا جوا کھیلنا اور سب کچھ ہار جانا۔

ان کے پہلے بچے صوفیہ کی سویزر لینڈ میں پیدائش اور تین ماہ بعد اس کا مر جانا۔ سب وہ کڑی آزمائشیں تھیں جنہیں اگر اپنا نہ حوصلے اور محبت کے بل پر سہا تو ہیں اس نے Idiot تخلیق کی۔

مہر النساء کوئی دو بار سارے کمروں کا چکر لگا آئی تھی۔ اور میں ابھی تک وہیں بیٹھی تھی جب اُس نے کہا۔

”سارا دن یہیں گُل کرنے کا ارادہ ہے کیا؟“

میں پُچھ تھی۔ اس وقت میرے سارے جذبے اُس عورت کو خراج تحسین پیش کرتے تھے جس نے ساری زندگی کرائے کے گھروں میں گزاری۔ جس نے کسی مہربان اور مشفق ماں کی طرح اُس پر اپنی محبتوں کی بارش کی۔ جس نے اس کے مرنے کے بعد اپنے بقیہ سارے سال اس کے اڈھورے کاموں کو مکمل کرنے اور اپنی یادداشتوں کو مرتب کرنے میں گزار دیئے۔

میں خاموشی سے اُٹھ کر ملحقہ ڈائمنگ روم میں آ گئی۔ ڈائمنگ روم کی سجاوٹ پیئر زیگ کے روایتی گھروں جیسی تھی۔ دوستوں کی کے خاندان کا انداز زندگی سادگی سے

بھر پور تھا۔ میز پر کپ سجے تھے۔ کونے میں دھری چھوٹی میز پر پیتل کا وہ سماوار اور چائے دانیاں تھیں جس کا ذکر اپنا کی یادداشتوں میں ملتا ہے۔ الماری چینی کے نفیس برتنوں سے بھری تھی۔

خاندان رات کے کھانے پر ضرور اکٹھا ہوتا۔ اکثر عزیز دوست اور رشتہ دار بھی شامل ہوتے۔ اپنا کواپنے شوہر کا گھر واپسی پر رات کے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ لانا بہت پسند تھا۔ پر اُسے آئے دن دوستوں کی کابچوں کو ٹریٹ دے دے کر خراب کرنے پر بھی گلہ رہتا تھا۔

چائے اور اُس کا اہتمام دوستوں کی زندگی میں بہت اہم تھا۔ چمکتے پیتل کے سماوار کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے میرے سامنے اپنا کی تحریر تھی۔

اچھی چائے اس کی کمزوری تھی۔ سونے سے قبل میں سماوار کو ڈائننگ روم میں ضرور چیک کرتی۔ چائے بنانے کا اہتمام مخصوصی ہوتا۔ سب سے پہلے وہ اُلتے پانی سے کتلی کو کھنگالتا، اس کا چمچ مخصوص تھا جسے بچے پاپا کا چمچ کہتے تھے۔

میری نظروں کے عین سامنے وہ چمچ اور چائے دانی تھی۔ میں اسے ہاتھ لگا کر چھو نہیں سکتی تھی کہ آگے حد بندی تھی۔ وہ تین چمچ چائے ڈالتا اور چائے دانی کا 1/3 حصہ پانی سے بھر کر اُسے نیپکن سے ڈھانپ دیتا۔ پورے تین منٹ بعد وہ چائے دانی کے بقیہ کو کھولتے پانی سے بھرنا اور پھر اُسے کپڑے سے ڈھانپنا۔

اس کی بیٹی Liubov لیو بو کا کہنا تھا کہ پاپا ہمیشہ چائے کے رنگ کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔

”ہائے۔“ میں نے سرشاری کے سرور آگیاں احساس کے زیر خود سے کہا۔
چلو اور کچھ نہ سی پر یہ قدر تو مشترک ٹھہری کہ زندگی میں اچھی چائے کے سوا کوئی

دوسرا شوق نہیں رہا۔ چائے کارنگ کمزوری اور چائے بنانے اور پینے کا اہتمام خوشی۔
 گلاس ہاتھ میں تھا مے وہ سٹڈی روم میں آتا اور لکھنے میں محو ہو جاتا۔ چائے میں
 چینی کی ہمیشہ دو کیوبز ہی استعمال ہوتیں۔ چائے سے اس کی یہ محبت اس کے ناولوں کے
 اکثر کرداروں میں جھلکتی۔ ”The Devils“ کے کردار اسے زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔
 اس گھر میں سب سے اہم تاریخ ساز جگہ اُس کا سٹڈی روم تھا۔ نشست گاہ سے
 ملحقہ جو اس کی خواب گاہ بھی تھی۔ نشست گاہ میں دیوار گیر وال کلاک کے پاس کھڑے ہو کر اور
 گریسیوں پر بیٹھ کر تصویریں بنائیں۔ خوش ہوئے کہ ہم ایک ایسے کمرے کی فضا میں سانس
 لے رہے ہیں، جہاں روس کے نامور شاعر، فلاسفر، محقق اور حقوق خواتین کی تحریک کے
 علمبردار آتے اور بیٹھا کرتے۔

سٹڈی روم میں کچھ وقت گزارنے کی ضرورت تھی اور وہ میں نے گزارا۔ کمرے
 کی کھڑکیاں باہر Kuznechny Lane پر کھلتی تھیں۔ ولادی میر چہچ بھی سامنے تھا
 جہاں دوستوں کی اپنے آخری ایام میں عبادت کے لئے جایا کرتا۔

یہی وہ کمرہ تھا اور میرے سامنے ہشت پہلو میز پر دھرا وہ کلاک تھا جس کی سوئیاں
 28 جنوری 1881ء بروز بدھ کی شام آٹھ بج کر 36 منٹ پر اس کمرے کے لیکن کے ساتھ
 ہی ساکت ہو گئی تھیں۔

کمرہ سادگی کی تصویر تھا۔ عین وسط میں رائٹنگ ٹیبل اور دیوار کے ساتھ صوفہ تھا۔
 ملمع زدہ فریم میں اس کی تصویر کے عین نیچے لیئر بکس تھا۔ تین خانے والے ریک کے ہر حصے
 میں کتابیں تھیں۔ الماری میں بھی کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ اس سادہ سے کمرے میں اسی میز
 پر اس نے اپنا آخری شاہکار ناول برادرز کرامازو The Brothers Karamazov تخلیق کیا۔

پیدائش تو اس کی ماسکو کی تھی۔ 11 نومبر 1821ء۔ بچپن ہی سے اُسے قلم اور کاغذ سے دلچسپی تھی۔ سوچنے کا شوق تھا۔ ماں کے مرنے پر اس کے باپ نے جبراً اُسے ملٹری انجینئرنگ اکیڈمی پیٹرز برگ بھیج دیا اور کو یا اس کی قسمت پیٹرز برگ سے وابستہ ہو گئی۔ فوج میں اپنی نوکری سے بالآخر ایک دن اس نے یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہوں۔ رشتہ داروں کے اعتراضات پر اُس کا جواب تھا۔

”میں اپنے بارے میں پر امید ہوں۔ انسان ایک سر بستہ راز ہے اور اسے کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

آغاز کا کچھ وقت اُس نے فرانسیسی لکھاریوں کے ترجموں میں صرف کیا۔ یورپ اور روس کے رائٹرز کو پڑھا۔ پڑھنے سے اُس نے ہمیشہ ایک روحانی آسودگی محسوس کی۔ ابتداء میں اس کے محبوب ڈکنس، کوکول، ہملر اور پٹھکنس تھے۔ پر جلد ہی اُسے احساس ہو گیا کہ حقیقت بذاتِ خود بڑی خوبصورت شاندار اور حیرت انگیز ہے۔ آغاز کا لکھا ہوا سارا کام اس نے ضائع کر دیا اور نئے اعتماد اور چیلنج کے ساتھ "Poor Folk" میں ظاہر ہوا۔ اس کا ہیرو کوئی رومانوی کردار نہیں تھا بلکہ معاشرے کا ستم رسیدہ غیر اہم شخص ایک کلرک تھا۔ انسان کے اندر کی سچائی کی تلاش کو اس نے اپنی تحریر کا منہا ٹھہرایا۔

اور یہ یہی وہ دن تھے جب اس کا تعارف میخائل پیٹراسوشکائے Mikhail Petrashevsky اور اُس کی بنائی ہوئی سوسائٹی سے ہوا۔ میخائل پیٹرز برگ کا نوجوان ماہر قانون دان تھا۔ یہ تنظیم اُس نے سوشلسٹ نظریات اور انقلاب فرانس سے متاثر ہو کر تشکیل دی تھی۔ اس کے ممبران کی زیادہ تعداد بھی اُن نوجوان لوگوں کی ہی تھی جو روس کے بہتر مستقبل کے لئے درد رکھنے، انقلاب فرانس اور سوشلسٹ نظریات سے محبت کرنے والے تھے۔ وہ نوجوانوں کو اپنے گھر بلاتا اور روسی معاشرے اور اس کے موجودہ حالات پر

لمبی چوڑی بحثیں کروانا۔ انہی میں دوستووسکی اور اس کے کچھ دوست بھی تھے۔ وہ اس کے ہفتہ وار اجلاسوں میں نہ صرف روسی بلکہ یورپی لکھاریوں کے ساتھ ساتھ چارلس فوریر Fourier کی انسانیت کے سنہری دور کی تھیوری پر بھی اظہار خیال کرتے۔

1848ء میں یورپ میں انقلابی تحریک چلی تو نکولس اول نے خوف زدہ ہو کر روسی وزراتِ داخلہ کو ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں رپورٹ کے لئے کہا جو روس میں سرگرم عمل تھیں۔ اور نتیجتاً دوستووسکی سمیت میننگ کے تمام افراد 23 اپریل 1849 کو گرفتار ہوئے۔ چند ماہ پیٹر اینڈ پال قلعے میں گزارنے اور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ آنے پر منتقلی سائبیریا کے شہر اومسک Omsk کی سنٹرل جیل میں ہوئی۔

آٹھ ماہ بعد نکولس اول کا انہیں عبرت ماک سزا دینے کا فیصلہ منظرِ عام پر آ گیا۔ یہ بائیس (22) دسمبر 1849 کی سرد ترین صبح تھی۔ سمینو و سکائیر میں ایک بڑے شو کا اہتمام کیا گیا تھا جس کا سرپرٹ زار نے خود لکھا اور خود ترتیب دیا۔ سکوائیر کے ڈھلانی چھتوں والی عمارتیں برف باری سے سفید ہوئی پڑی تھیں۔ لوگوں کا ایک جم غفیر میدان میں موجود تھا۔ فوج اور پولیس کے دستے مستعد کھڑے تھے۔ پادری موجود اور جلا دیا تھا۔ نکولس اول بہ نفس نفیس یہاں تھا۔ اس شو کا ایک عبرت انگیز مثال بنانے کے لئے ریاستی فنڈ ز بھی بے دریغ استعمال ہوئے تھے۔

مجرموں کی لمبی قطار موت کے انتظار میں کھڑی تھی۔ کیسا دل دہلانے والا نظارہ تھا۔ پلیٹ فارم سے کوئی بیس قدم پرے تین پوٹیں بنائی گئیں۔ پہلے تین مجرموں کو پوسٹ پر لا کر گاؤں پہنائے جاتے جن کے ساتھ لمبے لمبے ہڈ ہوتے جو ان کی آنکھوں کو ڈھانپ لیتے۔ پادری کر اس کے ساتھ ہر ایک کے پاس جاتا۔ بازوؤں سے تھام کر پلیٹ فارم پر لائے جاتے۔ فردِ جرم اونچی آواز میں پڑھی جاتی۔ ڈرم بجتا اور ”موت فائرنگ سکواڈ کے

ساتھ۔“ الفاظ کو بچتے اور زندگی پل چھپکتے میں موت کے ہاتھوں جھول جاتی۔
اگلے مجرم نئی فرد جرم کے ساتھ۔

دو موتوں کے درمیان بیس منٹ کا وقفہ اور تیاری کے بعد پانچ منٹ کا۔ اُس پانچ منٹ کے جس تجربے سے دوستو و سکی گزرا وہ اُس کی زندگی کا ناقابل فراموش تھا۔
سمینو و سکائے سکوائے کے چرچ کی سنہری چھت اور گنبد، لوگ، دُھوپ، چمکتا سورج،
ہوائیں، آسمان اور میدان میں موت کے سچے بازار سے پھوٹی کہیں آس اور امید کی کوئی
موہوم سی کرن۔ نکولس اول موت سے خاصا محفوظ ہو چکا تھا۔ بقیہ کے لئے قید با مشقت کا
حکم دیتا اُٹھ گیا تھا۔

”ایڈیٹ Idiot میں پرنس ماشکن Myshkin کی زبان سے اُس نے
اپنے اسی تجربے کو دہرایا ہے۔ زندگی ہمارے اندر ہے۔ باہر نہیں۔“
Crime and Punishment اس کے بعد لکھی گئی۔

اور اگلے چھ سال اُس نے سائبیریا کے قصبے میں ڈرل اور مارچنگ کرتے ہوئے
گزارے، پر یہاں اسے لکھنے پڑھنے کی آزادی تھی۔ اپنے ہر خط میں وہ اپنے بھائی کو اپنی
پسندیدہ کتابوں اور رسالوں کے نام بھیجتا۔

اور سائبیریا میں اُس نے ”My Uncle's Dream“ اور The
”Village of Stepanchikovo“ لکھیں۔

نکولس اول کی موت نے مملکتی حالات کو تبدیل کر دیا۔ اور وہ اپنے پیئر زبرگ
کے دوستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہا ہو گیا۔ مئی 1854ء میں اُس نے ماریا سے شادی
کی جو بیوہ تھی۔ اپنے بھائی کو ماریا کے بارے میں بتاتے ہوئے اُس نے لکھا تھا۔
”وہ صرف اٹھائیس سال کی ہے۔ چھ سال کا بیٹا بھی اُس کے پاس ہے۔ وہ ایک

ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ اور میں نے اُسے مستقبل میں تحفظ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

زندگی کے آخری برسوں میں اس کے پڑھنے والوں کے سامنے اس کا ایک اور رُخ آیا تھا۔ ہمارے اشفاق احمد صاحب کی طرح اُس کا رُخ ان بھی رُوحانیت کی طرف ہو گیا تھا۔ لوگوں کے مسائل سننا، اپنی مشکلات سے بھرے ہوئے ان کے خط پڑھنا، ممکنہ حد تک ان کی پریشانیوں کو دور کرنے اور ان میں آسانیاں بانٹنے کی کوشش کرنا اس کا مطبع نظر ہو گیا تھا۔

اور پھر وہ دن آیا جب اُس نے کہا۔

”آج مجھے مر جانا ہے۔“

طبیعت تو دو تین دنوں سے خراب تھی۔ پھیپھڑوں کی بیماری تو بہت پرانی تھی۔ اینا نے ڈاکٹروں کو بلا دیا۔ دلا دی میر چرچ کے پاوری بھی آئے۔

اٹھائیس 28 جنوری کی صبح اس نے کہا۔

”اینا آج مجھے دنیا سے چلے جانا ہے۔ تم انجیل لاؤ۔“

اور اینا اُسی انجیل کی کاپی لے کر آئی جو سائبریا جاتے ہوئے راستے میں اُسے

فونوینا Fonvizina نے دی تھی جو 14 دسمبر کو زاروں کے خلاف انسانی حقوق کی

نا کام بغاوت کے باغیوں میں سے ایک کی بیوی تھی۔ جو دسمبر کی کہلاتے تھے۔

اس نے ہمیشہ اُسے سنبھال کر رکھا اور جب بھی وہ پریشان یا کسی مشکل میں ہوا

اس نے ہمیشہ اُسے کھولا اور پڑھا اور جب اینا پڑھتی تھی۔

”پس جیسر نے اُسے کہا۔ اب ایسا ہونے دو۔“

اور اُس نے آنکھیں کھول کر ایک لمحے کے لئے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”اینا تم سنتی ہو۔“ Let it be so now۔

”تم مجھتی ہو میں مر رہا ہوں۔“

اُس نے آنکھیں موند لیں۔

گھڑی کی سوئیاں ساکت کر دی گئی تھیں۔ یہ اٹھائیس جنوری 1881ء تھا اور

وقت آٹھ بج کر چھتیس منٹ کا تھا۔

اور ایک عظیم لکھنے والا دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔



ترکی کاہیرا

مولانا جلال الدین رومی

- 0۔ شمس تبریز جیسے مجذوب کا مولانا رومی کی زندگی میں داخل ہونا کو یا مثنوی معنوی کو وجود میں لانے کا ایک خدائی اکتبار تھا۔
- 0۔ رقص درویشاں دراصل اپنے ہر عمل، اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی حرکت سے خدائی محبت اور اس تک پہنچنے کے روحانی سفر کی ایک دلآویز تمثیل ہے۔
- 0۔ مولانا رومی نے تلاش کرنے والوں کو دل کی خوبصورتی، سچ کی خوبصورتی اور انسانیت کی خوبصورتی کی نوید دی۔

عشق تو یہی ہے کہ (دل) آسمان کی طرف پرواز کرے
 نفس کے سینکڑوں پردوں کو چاک کرے
 پہلے تو نفس سے رابطہ توڑتا ہے
 آخر میں بغیر قدموں کے سفر کرتا ہے
 اس دنیا کو ایک غیر مری شے جان
 جو کچھ خود پر گزرے اُسے نہ دیکھ
 نظر کی حدود سے کہیں آگے دیکھتا ہے
 آغوش محبوب کی لہروں میں ڈوب جاتا ہے

مولانا جلال الدین رومی

استنبول کے ایشیائی حصے کے سیر سپاٹے سے واپس ہوئے تو دیکھا بدوشر
ریسپشن پر پڑے تھے۔ آتے جاتے ہماری بھی عادت تھی لڑکے لڑکیوں سے گپ شپ
کرنے، معلومات لینے، کچھ اپنے تجربات سنانے، کچھ اُن کے سُننے، تھوڑا سا ہنسی
مُحَل، ترکوں اور استنبول کی تعریف میں تعریفی کلمات سے خوش کرنے کی کوششیں سب چل
رہا تھا۔

بدوشر ٹرکش میسک Mystic میوزک اور ڈانس کا تھا۔

”اچھا تو یہ وہ درویشوں کا رقص ہے۔ جسے سیماما Sema کہا جاتا ہے۔ دوسرے
لفظوں میں کہہ لیجئے کہ روحانیت کے سفر کا بیان ہے۔“ میں نے سیماما کو دیکھا۔ میری
آنکھوں نے اُسے یہ بھی کہا ہاں تو کیا کہتی ہو؟

”چلو تو یہ نہ جانا شاید مقدر میں نہیں پر اسے تو دیکھ لیں۔“

اُس کی آواز میں قونیہ نہ جاسکنے کا قلق بڑا نمایاں ہوا تھا۔

اتوار، بدھ اور جمعہ وقت دیکھا۔ جگہ پر نظر ڈالی۔ سر کیے۔ جی ٹرین اسٹیشن۔ یورپ کا پہلا ریلوے اسٹیشن۔

”لو بھئی یہ تو نرا کواڈ میں ہے۔ بیچ بیچ میں سے بھی چل کر وہاں جاسکتے ہیں۔ میٹرو سے تو پانچ منٹ کا فاصلہ ہے اور وقت بھی موزوں ہے۔

بس تو جہاں ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر نکل پڑے۔ بوڑھی ناگوں پر ترس کھایا اور میٹرو پر جا چڑھیں۔

ایونٹ ہال Event Hall میں پروگرام تھا۔ ہال بھی بڑا شاہانہ انداز کا تھا۔ دیواریں دیکھوں، دروازوں کو سراہوں۔ گردن کو عقبی سمت توڑے کے زاویے پر جھکا کر چھتوں کی مدح سرائی کروں۔ کوئی تو بتائے آخر کروں تو کروں کیا۔ آنکھوں نے کہا۔

عجب بوٹگیاں ہانک رہی ہو۔ معماروں کو سراہو۔ بس تو ڈھیر سارا خراج عقیدت انہیں پیش کر دیا۔

کرسیوں پر سارے غیر ملکی تھے سوائے ہم دو دیسی عورتوں کے۔ سازندوں کی پوری ٹیم بمعہ گانے والوں کے جنہیں مٹرپ Mutrip کہتے ہیں ساتھ ساتھ نشستوں پر بیٹھی حکم کی منتظر تھی۔ کچھ آلات موسیقی تو ہماری شناخت میں آئے۔ جن میں بنسری، رباب، ستار، دف، ڈرم، فلیوٹ وغیرہ تھے۔ کچھ سے ہماری شناسائی نہیں تھی۔ مٹرپ سے آگے درویشوں کی ٹولی بیٹھی تھی۔

اب تک کی زندگی میں دروہ شریف کوئی ہزار بار پڑھا ہوگا، ہزار بار سُنا ہوگا مگر اُس نے کبھی وہ تاثر نہیں چھوڑا تھا جو اُس لُحْن داؤدی رکھنے والے شخص نے اُس فضا میں پیدا کیا۔

"سبحان اللہ" کہتے زبان خشک ہوئی جاتی تھی۔

دفعۃً ڈرم کی آواز نے ایک ڈرامائی تاثر کی فضا کو جنم دیا، جیسے خدا نے کہا ہو، پس ہو جا۔

پھر فلیوٹ پر ایک مختصر سی نغمہ سرائی ہوئی۔ یہ نغمہ جس نے رُوح کو دنیا کے حوالے کرنے کا پیغام دیا۔ جونہی یہ نغمہ سرائی ختم ہوئی درویشوں نے اپنے سروں کو جھکا دیا اور اپنے چوغوں کو اتارتے، اپنی ایڑیوں پر گھومتے، نیم دانتکھوں سے دائرے میں داخل ہو کر شروع کیا۔

پہلا درویش جونہی اندر آ کر رقص میں خود کو گم کر لیتا۔ دوسرا رقص کرتا کرتا داخل ہوتا، تیسرا، پھر چوتھا۔ یہ قدم انسانیت کی پیدائش کا عکاس تھا۔

درویشوں کے بازو اُن کے سینوں پر بندھے تھے۔ رقص میں یہ گھسلتے گئے۔ دائیں ہاتھ اوپر اٹھتے گئے اور بائیں نیچے ہوتے گئے۔ یقیناً یہ اس خیال کا غماز تھا کہ ہم خدا سے لیتے ہیں اور انسانوں کو دیتے ہیں۔ ہمارے پاس کچھ نہیں۔

اور جب ہم اُس نیم روشن بلکی سی خنکی والے ماحول میں نوجوان لڑکوں کے سفید فراکوں کے پھولے ہوئے گھیروں کو سراہتے اور انہیں ایک وجد کی سی کیفیت میں والہانہ گھومتے دیکھتے اور نہ سمجھ آنے والی زبان میں ایک مترنم آواز کو سنتے اس سحر میں گم تھے۔

تب کہیں یادوں کے دریچوں میں مولانا رومی کی جھلکیوں کی قدیلیں سی جل اٹھیں تھیں۔ علامہ اقبال کی عقیدتوں کے قصبے تھے۔ ان کی شاعری میں اُن کا اثر، کہیں شمس تبریز کے حوالے، کہیں ان کی ذات سے وابستہ معجزے و ذہنی دنیا میں سب قطار در قطار چلے آ رہے تھے۔

سلیمانہ لائبریری استنبول کی نوجوان انچارج مسز ایمل چیتن جو مولانا جلال الدین رومی کے بارے میں بات کرتے ہوئے بڑی واضح تھیں۔ اُس کا کہنا تھا ہم اُن سے

صرف اُن تراجم کے ذریعے متعارف ہوئے ہیں جو ہماری مختلف یونیورسٹیوں اور ذاتی طور پر لوگوں نے کیے۔ اُن کا کام فارسی میں ہے جو عثمانی دور میں حکومت اور اشرافیہ کی زبان تھی۔ ترکی کے تمام دیہی علاقوں کے لوگوں کیلئے یہ زبان مشکل تھی اور وہ یہ زبان زیادہ بولتے بھی نہیں تھے۔

دراصل اُن کی بہت زیادہ ہر دل عزیز ی وسط ایشیا، ایران اور برصغیر کے علاقوں میں ہے۔ کواب وہ انگریزی، جرمن، فرانسیسی زبانوں میں تراجم کے ذریعے باہر کی دنیا میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔

تاہم ہم تو یہ دیکھ رہے تھے کہ ترکی کے شہروں میں مولانا رومی کا رقص درویشاں، خدائی محبت اور اُس تک پہنچنے کے روحانی سفر کی دلاویز تمثیل اور لُحْن داوودی جیسے آہنگ میں اُن کا کلام پڑھا جانا وہ خوبصورت چیز ہے جسکے لیے دُنیا بھر کے سیاحوں کے پُرے باقاعدہ بُلَنگ کے مرحلوں سے گزرتے ہیں اور جم کر شوق و ذوق سے سب کچھ دیکھتے ہیں۔ بلا سے کچھ سمجھ آئے یا نہ۔

ہاں البتہ مختلف بین الاقوامی زبانوں میں چھپے بروشرز اپنا کردار عمدگی سے ادا کر رہے ہیں۔

تو وہ شاعر کیسے بنے؟ اُنکی شاعری اور اُن کے کلام میں سوز و درد، جلنے، تر پنے اور آہ و نغاں کی کیفیات کیسے پیدا ہوئیں؟ وہ تو اِس منزل کے مسافر ہی نہیں تھے۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ شمس تبریز جیسے مجذوب کا ان کی زندگی میں داخل ہونا کو یا دیوانِ شمس تبریز اور مثنوی معنوی کو وجود میں لانے کا ایک خدائی اظہار تھا۔ وہ نہ ہوتے تو مولانا سب کچھ ہوتے جیسا کہ وہ تھے۔ قرآن کو سینے میں سمونے والے حافظ، فقہ و حدیث، شریعت، طریقت میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے۔ اور استاد ایسے کہ چلتے چلتے بھی

حکمت و دانائی کے موتی راستوں میں کھیرتے جائیں۔

پر شاعری کا تو کہیں دو درو رنگ سان و گمان تک نہ تھا۔

یقیناً وہ وقت کا منتخب لمحہ تھا جب قونیہ کی وہ عظیم صاحب علم ہستی جو اپنے آراستہ پیراستہ دیوان خانے میں شاہانہ کز و فر کے انداز میں اپنے طالب علموں کے ساتھ درس و تدریس میں لگن رہتی تھی۔ لمحے بھر میں ہی اُس پھٹے پرانے ملبوس میں وہ کہ جس کے گرد آلود پاؤں ننگے تھے۔ بالوں کی اُلجھی ہوئی لٹوں میں مٹی تھی۔ چہرے پر دھول تھی کے دام گرفت میں آگئی۔

وہ مجذوب کیا تھا؟ کیسے اُس نے انہیں اُس مند سے اٹھا کر ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو راگ و رنگ، مانج گانے اور موج و مستی والا تھا۔ قونیہ کے لوگ پہلے حیرت زدہ ہوئے پھر کراہت اور نفرت کا اظہار کرنے لگے۔ نہ صرف عام لوگ بلکہ عزیز رشتہ دار حتیٰ کہ سگی اولاد بھی۔

اب زندگی کا ایک بالکل نیا رخ جو معاشرے کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ تھا سامنے آیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہی مقصود خداوندی تھا۔ یہ شمس تمریز ہی تھے کہ جس نے اپنے مرید کو اسرار و رموز اور طریقت کی تعلیم دی۔ روحانیت کی سمسن گھیر یوں میں ہر طرح اُلجھا کر اس کی منزلیں طے کروائیں۔ عشق حقیقی کے آداب سکھائے۔ قرب الہی سے آشنا کیا۔ آزمائش کی کسوٹیوں پر پرکھا۔

ظاہرین لوگ جن کی ذہنی سطح بہت آگے کی چیزیں نہیں دیکھتی ہیں۔ وہ اس تعلق کو سفلی سطح پر دیکھنے لگے تھے۔ جب کہ یہ سب خدائی منشاء کے تابع ہو رہا تھا۔ اس کی وضاحت ان دو واقعات سے ہوتی ہے جو شمس تمریز اور مولانا رومی کو پیش آئے۔

پہلا واقعہ اُس برگزیدہ شخصیت شمس تمریزی کے حوالے سے ہے کہ جس نے خدا

کے حضور دعا کی۔

”اے میرے پروردگار عالم تو نے مجھے مسند ولایت دی۔ اب میں تیرے عطا کردہ علم کو کسی ایسے انسان کو دینا چاہتا ہوں جسے تو پسند کرتا ہے۔ یہ دعا قبول ہوئی اور غیب سے آواز آئی کہ ایسا شخص تجھے تیرے شہر میں نہیں قونیہ میں ملے گا۔ تجھے اس کے پاس جانا ہوگا۔“

اسی طرح مولانا روم کو بھی زمانوں پہلے ایک خواب میں ہی بشارت ہوئی کہ کوئی اُن سے کہتا ہے تم نے دینی اور دنیاوی علوم میں کمال حاصل کر لیا۔ تمہاری زندگی قابلِ تعریف ہے مگر تم معرفت اور طریقت کی منزل سے نا آشنا ہو۔ تمہاری روحانی تربیت کیلئے ایک ایسا آدمی تمہارے پاس آئے گا جو معرفت میں کمال کے درجے کو پہنچا ہوا ہے اور ہمارا بہت پسندیدہ ہے۔ نام شمس تبریزی ہے۔

بیدار ہونے کے بعد انہیں اطمینانِ قلب ہوا۔ کیونکہ وہ خود بھی اس راستے کے مسافر بننے کے متمنی تھے۔ فرید الدین عطار سے سرسری سی ملاقات اور ان کے "اسرارنامہ" نے ان کے اندر اس جذبے کو ابھارا تھا مگر پھر درس و تدریس کی دنیا میں مصروفیت نے وہ خواب ایک طرح بھلاسا دیا تھا۔

اور جب وہ تاریخی ملاقات ہوئی۔ اس وقت ایک دنیا دار صاحبِ علم انسان اپنے کروڑ فرشتا ہانہ کے ساتھ ایک دُفرب ماحول میں درس و تدریس میں مگھو تھا۔

تبھی ایک مجذوب نے قریب آ کر کتابوں کو چھوتے ہوئے کچھ پوچھا۔ آپ کو ایک خستہ حال انسان کا یوں آنا پسند نہ آیا۔ رکھائی سے۔ چیز بست کہ تو نئی دانی (یہ وہ چیز ہے جسے تو نہیں جانتا) کہا اور اندر چلے گئے۔

مجذوب نے کتابیں حوض کے پانی میں پھینک دیں۔ واپس آ کر دیکھا اور

مارا ننگی کا اظہار کیا۔ فقیر نے ہاتھ سے کتابیں نکال کر منڈیر پر رکھ دیں۔ خشک کتابیں دیکھ مولانا نے حیرت بھرے انداز میں استفسار کیا۔ مجذوب نے وہی جواب دہرایا۔ چیز یست کہ تو نمی دانی۔ (یہ وہ چیز ہے جسے تو نہیں جانتا)

خواب یاد آیا۔ پوچھا۔ شمس تبریزی ہیں آپ؟

اثبات میں جواب دیا۔ یہ وہ واقعہ تھا جسے کایا کلپ کی۔ یہ شمس تھے جنہوں نے انہیں سخن کا شہنشاہ بنادیا۔

یہ بھی خدائی منشا تھی کہ انہیں دنیاوی جاہ و حشمت سے نکال کر اُن میں عجز و فقر پیدا کیا جاتا اور ان کی ہستی کو اس مرکب میں کوندھا جاتا۔

ایک دن وہ غائب ہو گئے۔ یقیناً یہی وہ مقام تھا جو قدرت کے نزدیک منعہائے مقصود تھا۔ اس جدائی نے اُن کے اندر وہ آگ بھڑکائی کہ فریاد و مالہ شعروں میں ڈھل گئی۔ مولانا کی آفاقی شاعری کا آغاز ہو گیا تھا۔ دل کا درد شعروں کی صورت ڈھلنے لگا۔ مولانا روم شاعر بن گئے۔ انہوں نے خود اس کا اظہار کیا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم

تا غلام شمس و تبریزی نشد

مولوی یعنی میں ہرگز مولانا روم نہ بننا اگر مجھے شمس تبریزی کی غلامی نصیب نہ ہوتی۔

اب جب ہجر اور فراق کی آگ اندر جل اٹھی تھی۔ ضبط کا یا راندہ رہا تو زبان اس جلن کو اُگلنے لگی۔

میں نے سنا ہے آپ سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

بخدا یہ سفر نہ کریں

آپ میرے ایک رقیب سے محبت کرنے والے ہیں

بخدا ایسا نہ کریں
 آپ نے دنیا میں کبھی دکھ، تکلیف اور رنجش نہیں دیکھی
 پھر آپ دل کو تکلیف دینے والا عمل کیوں کرتے ہیں۔ ایسا نہ کریں
 ایسا نہ کریں

تصوف کی اس بلندی نے اُن میں عجز اور خاکساری پیدا کی کہ جلال والی کیفیت
 ہی نہ رہی۔ گالیوں، کوسنوں، لعن طعن سب چیزیں ان کے لیے بے معنی ہو گئیں۔
 دراصل مولانا رومی کے اندر شاعرانہ جذبات کی جو حس قدرت کی طرف سے
 عنایت تھی وہ مخفی تھی۔ تبریز کی جدائی نے گویا ان سر بند جذبات کا منہ کھول دیا اور لا وہ یوں
 پھٹ کر باہر آنے لگا کہ صدیاں گزر جانے پر بھی ان اشعار کا کوئی بدل نہیں۔
 ذرا دیکھیں ان اشعار کو۔

اے دوستو تم جاؤ اور میرے محبوب کو لے کر آؤ
 میرے بہانے باز محبوب کو ساتھ لے کر آؤ
 اگر وہ وعدہ کرے کہ وہ پھر کسی وقت آئے گا
 تو اس کے حیلے بہانوں پر مت جانا

یہ اشعار جن کی پور پور میں عشق مجازی کی جولانیاں نظر آتی ہیں۔ دراصل یہی عشق
 حقیقی کی حشر سامانیاں ہیں۔

شاعری ابتدائی شاعری کا آغاز جس دلاویز رنگ میں سامنے آیا۔ اُسے اُسے دنیا
 کی شاعری میں ایک منفرد انداز سے نمایاں کیا۔ غزل کی بنیاد ہی عشق و محبت پر اٹھائی گئی
 ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کا ہر شعر جذبات کی گہرائی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنے اندر
 معنویت لیے، صوتی اعتبار سے نغمہ لگی لیے، جس خیال کی فراوانی لیے اور فکر کی بلندی لیے اور

یہی وہ خوبیاں ہیں جنہوں نے تغزل کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔
ذرا دیکھیے

ماہستگانیم وتوی صدمر ہم بیمار ما

مالس خرا نیم وتوی صم از کرم معمار ما

ترجمہ: ہم تھک کر خستہ حال ہو گئے ہیں تو ہی ہماری بیماری کا علاج یا مرہم ہے

ہم شکستہ حال ہیں اور تو ہی ہمارا بنانے والا ہے

مولانا روم کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے۔ 1207 میں بلخ جیسی سرزمین جو علم و دانش، فکر و فن اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھی۔ جہاں خود ان کا خاندان ان کے والد بہاؤ الدین ولد علم و دانائی، زہد و پارسائی میں یکتا پورے علاقے میں معزز و محترم شمار ہوتے تھے۔ درس و تدریس جن کا اوڑھنا بگھونا تھا۔ وہ علم کا دریا تھے۔ اُن سے ملنے کیلئے دور دراز سے آنے والے بھانت بھانت کے لوگوں کا آنا اور اپنے مسائل پر راہنمائی چاہنا، چھپنے کے وہ تجربات تھے جنہوں نے لوگوں کے عمومی رویوں کی بہت سی تہیں اُن پر کھولی تھیں، کم سنی میں ہی سرفرد جیسے تاریخی شہر میں جانا اور وہاں قیام کرنا، اس قیام میں اُن کا وقت صاحب علم لوگوں کے ساتھ ہی نہیں گزارا بلکہ خوازم شاہ کو شہر تاراج کرتے دیکھنا، لوگوں کا خوف و ہراس، والہی کا سفر اور پھر اپنے شہر کے دیگر کون حالات۔

ہجرت ایک بار پھر مقدربنی تھی۔ نیشاپور، بغداد، شام اور مکہ جیسے شہروں کو قدموں نے چوما تھا۔ ان شہروں میں قیام کے ساتھ ساتھ یہاں کی مقتدر ہستیوں سے ملاقاتیں، باتیں بحث مباحثے یہ سب وہ تجربات تھے جن سے وہ اوائل عمری سے آشنا ہوئے۔ یہ اُن کی یادوں میں محفوظ ہوئے اور انہوں نے ان کی فکر کو جلا دی۔ یہ چیزیں ان کی شاعری کا حصہ بنیں تو لازمی بات ہے اظہار میں طغیانی جیسی شدت کا آنا عین فطری تھا۔

قونیہ آنا بھی زندگی کا ایک سنگ میل تھا۔

سلجوقی سلطنت کا پایہ تخت قونیہ جس نے اُن کا دواہنا استقبال کیا۔ والد کی وفات کے بعد آپ نے علم ہانٹنے کے عظیم سلسلے کو آگے بڑھایا۔ تاہم اُس وقت تک مولانا رومی شاہانہ انداز زندگی کے خوگر تھے۔ طلائی اور نقرئی تاروں سے کاڑھا گیا لباس پہنتے، بدن کو خوشبو میں بساتے، اونچی مسند پر بیٹھتے اور ماحول میں کروفر جیسے رچاؤ کا خصوصی اہتمام رکھتے۔ وہ وقت کے مفتی، شیخ اور مستند امام تھے۔

شمس تبریز جیسے مجذوب کا آپ کی زندگی میں آنا ایک ٹرنگ پوائنٹ تھا۔ یقیناً خدا اُن سے وہ عظیم کام لینا چاہتا تھا جو مشنوی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اُن کی قربت نے اُن میں صوفیانہ فکر کا وہ رنگ بھرا کہ وہ سب کروفر رخصت ہوئے۔ شب و روز رقص میں رہنے لگے۔ دنیا حیران تھی اور نہیں جانتی تھی کہ انہوں نے باطنی دنیا کے اوج کمال کی معراج پائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دیوان شمس تبریز غزلوں کا وہ خوب صورت مرقع ہے جسے فارسی ادب کا نگینہ کہنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے جو کہا وہ کو یا ان کے اندر کی کہیں گہرائیوں سے اٹھ کر سامنے آیا۔ اسمیں تصوف کا ایسا کونسا پہلو ہے جو زیرِ مشق نہیں آیا۔

حسن و عشق کے موضوع کو جیسی پذیرائی مولانا کے کلام نے دی ہے۔ اُس کی مثال ملنی بے حد مشکل ہے۔ ذرا دیکھیے تو۔

اے یار مار دلدار ما، اے عالم اسرار ما

اے یوسف دیدار ما، اے رونق بازار ما

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

اے شاد کہ ماہِ مستم اندر غم تو جاناں

ہم محرمِ عشق تو ہم محرم تو جاناں

ترجمہ: میں اس بات پر خوش ہوں کہ تیرے غم میں مبتلا ہوں

میں تیرے عشق کا راز دار ہوں اور میں اے میرے محبوب تیرا بھی راز دار ہوں

محبت و اخوت، امن و بھائی چارہ، صبر برداشت ان کی بنیادی تعلیمات تھیں۔ اُن کی ذات کے گرد سنہرا ہالہ بننے اور ان کی شاعری کو زمانوں کیلئے اثاثہ بنادینے والی خوبیاں۔

وہ کہتے ہیں محبت کرنے والے بن جاؤ۔ اپنی ذات کی نفی کر دو۔ دل کو تخلیق کرنے والے سے بھرو۔ بس یہی اُس تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ ہے۔ جس کسی نے اپنا دل خدا کو سونپ دیا۔ حقیقت میں اُس نے اپنی ذات کی مہار اُس کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔

ان کی باتوں میں، اُن کی مثنوی معنوی میں زندگی جو بذاتِ خود ایک متنوع اور لامحدود موضوع ہے۔ اُس کا ہر پہلو نہ صرف بولا بلکہ نمایاں ہوا۔ عشقِ حقیقی کی رومانیت نے شعروں میں گھل کر ان کا حُسن بڑھایا۔

تو برائے وصلِ کردن آمدی

نے برائے فصلِ کردن آمدی

خدا سے اٹوٹ تعلق کی شیرینی نے لوگوں میں مٹھاس بانٹی۔ وہ خدا کی آواز بنے اور انہوں نے تلاش کرنے والوں کو خوبصورتی تحفے میں دی۔ دل کی خوبصورتی، سچ کی خوبصورتی، انسانیت کی خوبصورتی۔

لڑکے اپنے اپنے مدار کے اندر بے خودی کی کیفیت میں مبتلا گھوم رہے تھے، گھوم رہے تھے اور لگتا تھا جیسے وہ ایسے ہی گھومتے گھومتے فضا میں تحلیل ہو جائیں گے اور ساتھ میں ہم لوگ بھی۔

انہوں نے دل مسخر کرنے کو کہا۔ انسان تو ساری تخلیق میں سب سے حسین اور

قابل فخر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ اگر تم سمندر سے ایک جگہ پانی کا بھرتے ہو تو جگہ کتنا پانی اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے۔ ایک دن کے گزارے کا تو جیسے سمندر جگہ کی گنجائش کے مطابق اُسے بھرتا ہے تو ہماری رسائی بھی اوپر والے تک ہماری استعداد کے مطابق ہی ہے۔

قص میں بے خودی اور مسلسل گھومنا بھی اُس حقیقت کی عکاسی ہے کہ جیسے چاند اور سیارے اپنے مدار پر گھومتے ہیں۔ اسی طرح چکروں میں خدائی تعلق کے احساس کا عنصر کارفرما ہے۔

درویشوں کا نگاہیں اور گردن اٹھا کر اُپر دیکھنا کو یا خدا کی کائنات اور اُس کی دنیاؤں کی عظمتوں اور بڑائیوں کا اعتراف ہے۔ قص کے چکروں میں تیزی اور دالہانہ پن اُس خدائے واحد کی لامتناہی کائنات کے درمیان اس کی ہستی میں خود کو گم کر دینے، مٹا دینے اور محبت کی معراج کو چھو لینے کا تصور ہے۔

اور پھر قرآن کی ایک سورت کے ساتھ یہ قص ختم ہو جاتا ہے۔

ہم ایک مادرائی دنیا میں سانس لے رہی تھیں۔ وہ دنیا جو زہدوں اور عابدوں کی ہے۔ خدا کی پسندیدہ ہستیوں کی ہے جس تک ہم گنہگاروں کی رسائی نہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ روحانی سفر میں ہستی کو فنا کر دینا ہی منہبائے مقصود ہے۔ اُن سب کیلئے جو محبت کے راستے کے راہی بنتے ہیں اور جو اپنے اندر خدا کی تلاش کرتے ہیں۔ خدا بھی انہیں نوازتا ہے۔ آج دنیا کی کم و بیش ہر بڑی زبان میں مثنوی معنوی ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس ترجمے نے لوگوں کو روشنی دکھائی ہے۔ اس کے بندوں کو بھٹکنے سے بچایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے۔

ایں جلالت و ردالالت صادق است

جملہ دراکات پس اوسابق است

ترجمہ: خدا کی بڑائی اور شان اس کے ہونے کی سچی گواہی ہے

ہر شعور اور ادراک پیچھے رہ جاتا ہے

ہم بے شک قونیہ نہ جاسکے مگر یہ وقت ہم نے مولانا رومی کے ساتھ گزارا۔

والیسی میں جب میٹرو پر چڑھے تو ایک دلچسپ سامنظر دیکھنے کو ملا۔ ایک نیا نوپلا جوڑا اگلے سٹاپ سے سوار ہوا۔ کیسی معصوم سی ڈلہن اور دلہا بھی ایسا ہی۔ ہمیں تو دیکھتے ہی کھد بُد ہونے لگی۔ جوڑا شادی کے روایتی لباس میں ملبوس تھا۔ کپارٹمنٹ میں خاصا رش تھا۔ ہم کھڑے تھے۔ لڑکی کو میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا۔ انگریزی تو بڑی بات اُسے تو اپنی زبان میں بولنے کی ہچکچاہٹ تھی۔

انا طولیہ کے ایک دور افتادہ قصبے سے اپنے عزیزوں کے پاس آئی تھی۔ ساتھ جو رشتہ دار عورتیں تھیں وہ کسی سٹوڈیو سے ان کی تصویر اُتروا کر آئی تھیں۔ انگریزی میں وہ بھی کوری تھیں۔ تاہم اُن میں سے ایک تھوڑا سادال دلیہ کر لیتی تھی۔

جھلمل جھلمل کرتا لباس جو ایک فراق اور تنگ پائینچوں کی پُھولی ہوئی بیگی نما شلوار کی صورت میں تھا۔ سر پر ریشمی سکارف سا۔ معلوم ہوا تھا کہ ترکی میں شادی کی تقریب پلاؤ زردے کی تقریب کہلاتی ہے۔ دیہی علاقوں کی شادی کا دیکھنے سے تعلق ہے۔ روایتی لباس، مانچ گانے اور روایتی کھانے جن میں ترکی پلاؤ کے ساتھ ساتھ زعفران ڈلا زردہ اس تقریب کی خاص ڈش ہے۔

ہمارا اسٹیشن آگیا تھا۔ اُترنا پڑا۔ جی چاہتا تھا اُس من موہنی سی لڑکی کو تھوڑا اور دیکھتے۔



یونس ایمرے Younus Emre

ترکوں کا محبوب و مقبول عوامی شاعر

- ہماری نئی نسلیں اُن عظیم شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہیں جنہیں ہم ترجمہ نہیں کر سکے۔
- یونس ایرے کے ہاں ذریعہ اظہار وہی علاقوں میں بولی جانے والی ترکی زبان تھی۔ شاید اسی لیے وہ ایک عوامی شاعر ہیں۔
- یونس ایرے کا کہنا ہے دین حق میں ہے۔ سر پر رکھی جانے والی پگڑیوں اور دستاروں میں نہیں۔

تم اگر دوسروں کو نفرت سے دیکھو گے
 بلندی سے نیچے گر جاؤ گے
 وہ کہ جس کی لمبی سفید داڑھی ہے
 اور جو خاصا معقول نظر آتا ہے
 اگر اُسے کسی ایک کی بھی دل شکنی کی
 تو بلا سے وہ مسمم جائے کچھ فائدہ نہیں
 اگر سب مذاہب مل کر ایک اکائی کا روپ دھار لیں
 تو اس امتزاج سے عشق حقیقی پیدا ہوگا
 خواہ کعبہ ہو، مسجد ہو یا کوئی اور عبادت گاہ
 ہر ایک اپنی اپنی بیماریاں اٹھائے ہوئے ہے

یونس ایرے

استنبول کی سلیمانیہ مسجد کا بھی دیکھنے سے تعلق تھا۔ پورے دو گھنٹے سیما اور میں نے وہاں گزارے۔ سلیمان ذی شان کا مقبرہ اس پرانے سلطان کا کلاؤ خسرانہ جیسے کہتا تھا۔

”یوں ہی پہلو میں بیٹھے رہو۔ چھوڑو سب۔ جانے کی ضد نہ کرو۔“

چچی بات ہے وہ کوئی عثمانیوں کا ہیرو ہی نہ تھا وہ تو ہماری بھی جان جگر تھا۔ ترجمانی تو ہمارے جذبات کی بھی ہو رہی تھی کہ دل ابھی بھرا نہیں۔

تاہم جانا ضروری تھا۔ سلیمانیہ لائبریری راہ دیکھتی تھی کہ ہم کتابوں کی رسیا کب اُن سے ملنے آتی ہیں؟ اب حقیقت یہی تھی کہ سلیمانیہ لائبریری میں جانا اور ایک ہزار سال سے زیادہ کے ترک اسلامی کچھر کے فکری و علمی خزانوں کے مخطوطوں اور مسودات کو دیکھنا گویا اپنے آپ کو اس ماحول میں تھوڑی دیر کے لئے محسوس کرنا ایک طرح خدا کا ایک تحفہ تھا۔ اس کی نظر عنایت تھی۔

یہاں وہ دنیا تھی جس میں ڈیرے ڈالنا لکھنے والوں کا دل پسند مشغلہ ہوتا ہے۔ یقیناً دل چاہتا تھا کہ بہت سادقت یہاں گزارا جائے۔ لائبریری کی انچارج مسز ایمل بہت سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ سکارف پہنے ہوئے تھیں۔ ہاتھیں ہونے لگیں تو احساس ہوا کہ سوچ اسلامی فکر میں گندھی ہوئی ہے۔

ان کے ہاں یہ تاسف بھرا اظہار تھا کہ ہماری نئی نسلیں اُن عظیم شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے بارے میں جانتی ہیں جنہیں ہم ترجمہ نہیں کر سکے۔ ہمارا شاندار ماضی تو جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے۔ بازاروں، محلوں، عجائب گھروں کو چھوڑیئے ہمارے تو قبرستان بھی ہمارا اثاثہ سنبھالے ہوئے ہیں مگر انہیں پڑھنے والے نہیں۔

وہ ہمارے جذبات کو زبان دے رہی تھیں۔ میں ناامید نہیں۔ ایک دن وہ وقت ضرور آئے گا جب ہمیں اپنی عثمانی ترکی زبان کی عظمت کا احساس ہوگا۔ جب یہ ایک مضمون کے طور پر سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جائے گی۔ ہمارے امام حاطب (مذہبی) سکولوں میں تو یہ نصاب کا ایک حصہ ہے۔ مگر اسے اسکا جائز حق ملنا چاہیے۔

ہمارے مابین کہنے میں ہماری دلی تمنائیں شامل تھیں۔

باتوں کی اس بحث میں اچانک یونس ایرے Yunus Emre کا ذکر آگیا۔ خاتون نے اناطولیہ کے اس درویش، صوفی اور خدا واد صلاحتوں کے حامل شاعر کا ذکر جس محبت اور شوق سے کیا نے آتش شوق کو کوہ بھڑکا سا دیا۔ اس کا یہ کہنا کہ قدیم اور جدید ترکی شاعری اور ادب نے یونس ایرے کے خیالات اور فکر سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ ہمیں اپنی کم علمی کا اعتراف ہے یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ ترکی کے کلاسیکل ادب کا کوئی اور بھی بڑا نام ہے۔ اس نے ان کی عوامی اور وحدت میں ڈوبی ہوئی شاعری کے چند ٹکڑے سنائے اور ایک

دلچسپ واقعہ بھی۔

زمانہ تو مولانا جلال الدین رومی کا ہی تھا۔ کہتے بھی انہیں رومی ثانی ہے مگر دونوں عظیم شاعروں میں فرق ذریعہ اظہار کا تھا۔

مولانا رومی کا کلام اُس وقت ترکی کی شہری اشرافیہ کی مریچہ ادبی زبان فارسی میں ہونے کی وجہ سے خاص الخاص تھا جبکہ یونس امیرے Emre کے ہاں ذریعہ اظہار اُن کی عام لوگوں کی یعنی دیہی علاقوں میں بولی جانے والی ترکی زبان میں ہی تھا۔ زبان سادہ، مفہوم واضح، تشبیہیں استعارے عام فہم اور محاورے، ضرب المثال، لوک داستانیں، لوک گیت سبھوں کو عام فہم اور مقامی لوگوں کی زبان میں ڈھال دیا۔ اُن کے کلام میں غنائیت اور نغمہ نگاری کا بہاؤ اس درجہ تھا کہ صوفیاء کی محفلوں میں جب گایا جاتا تھا تو لوگ وجد میں آجاتے تھے۔ یونس امیرے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت شریں گفتار اور لہجہ داؤدی کا سا کمال رکھتے تھے۔ کبھی اگر دریا کے کنارے قرات سے قرآن پاک پڑھتے تو بہتا پانی رک جاتا تھا۔

بہت دلچسپ ایک واقعہ بھی سُن لیجیے۔ یونس اُمرے کے قونیہ سفر کے دوران کہیں مولانا رومی سے ملاقات ہوئی تو مولانا نے اُن سے اپنی مثنوی کے بارے میں دریافت کیا۔ یونس امیرے نے کہا۔

”بہت خوبصورت، بہت عظیم، بہت اعلیٰ شاہکار۔ تاہم اگر مجھے اُسے لکھنا پڑتا تو میں ذرا مختلف طریقے سے لکھتا۔“

مولانا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”بتاؤ ذرا کیسے؟“

یونس بولے۔

”میں آسمان سے زمین پر آیا۔ گوشت پوست کا لباس پہنا اور خود کو یونس امیرے کا نام دیا۔“

یونس امیرے کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت ہے کہ آپ اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی تعلیمات کے نزدیک بھی لائے۔

ترکی کے اس مقبول اور اہم ترین شاعر کا زمانہ لگ بھگ 1238 تا 1320 کا ہے۔ مقام پیدائش صاری کوئے نامی گاؤں میں ہوئی۔ انتقال کہیں اکبر 71 سال کی عمر میں ہوا۔ اور کہیں بیاسی 82 درج ہے۔ مانیسا میں وفات ہوئی۔

اس زمانے میں قونیہ پر سلجوق ترکوں کی حکومت تھی۔ یہ زمانہ ہنگاموں، شورشوں، بغاوتوں اور مایوسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سلجوقوں پر زوال کا وقت تھا۔ سلطنت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ حکومتی معاملات ہاتھوں سے نکل رہے تھے۔ منگول ایک مہیب طوفان کی طرح اٹھے تھے۔ مقامی امراء بغاوتوں پر مائل تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب اُس کی شاعری نے مایوس اور ناامید لوگوں کو امید کی ایک کرن دکھائی۔

مولانا رومی شمس تبریز سے متاثر تھے۔ ایسے ہی یونس امیرے نے چالیس سال اپنے استاد شیخ تاپدوک امیرے Tapduk Emre کے قدموں میں گزاردیئے۔ اُن کی زیر نگرانی انہوں نے قرآن و حدیث کے علم میں کمال حاصل کیا۔ طریقت کے اسرار و رموز سے شناسا ہوئے۔ اُن کے کلام میں رباعی، گیت، نظمیں، غزلیں سبھی نظر آتی ہیں۔ ذرا دیکھئے کلام کی سادگی اور حسن۔

ایک لفظ ہی چہرے کو روشن بنا سکتا ہے
اُس شخص کیلئے جو لفظوں کی قدر و منزلت جانتا ہے
جان لو کہ لفظ کب بولنا ہے اور کب نہیں

ایک ایسا لفظ دنیا کی دوزخ کو آٹھ ہشتوں میں بدل سکتا ہے

یونس ایمرے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان کو زندگی محبت و پیار کے اصولوں پر گزارنی چاہیے۔ ان کی فلاسفی میں اُونچ نیچ اور تفریق کہیں نہیں۔ یہ صرف انسانوں کے اعمال ہیں جو انہیں اچھا یا بُرا بناتے ہیں۔ زندگی عفو و درگزر، حلیم اور رواداری جیسے جذبات کے تابع ہونی چاہیے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا تک پہنچنے اور بخشش کا راستہ اکابرین دین، مختلف مذہبی اور مسلکی فرقوں کے اماموں کے ذریعے نہیں بلکہ یہ انسان دوستی اور احترام انسانیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ہر مذہب اور ہر مذہبی فرقے کا دوسرے کو جہنمی کہنا اور سمجھنا بہت غلط ہے۔ دنیا کا ہر مذہب انسانیت کی بھلائی کا درس دیتا ہے۔ ان مذاہب اور انسانوں کے احترام سے خدا سے سچا عشق پیدا ہوتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کتنا خوبصورت ہے۔ دین حق سر میں ہے سر پر رکھی جانے والی پگڑیوں اور دستاروں میں نہیں۔

زندگی کے کڑے حقائق، روایتی اور کھوکھلی مذہب پرستی اور اُس کی آڑ میں انسانوں کا استحصال۔ یونس نے اپنی ذات کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ خود اپنے آپ کو رگیدا۔ اپنے آپ پر ملامتوں کے کوڑے برسائے۔

یونس ایمرے عشق حقیقی کے پرستار اور اسیر تھے۔ شاعری میں صوفیانہ علم، عجز و انکسار اور انسانیت کا بے پناہ جذبہ نظر آتا ہے۔ آپ ہی کی وجہ سے ترکی ادب صوفیانہ خیالات سے آشنا ہوا۔ آپ کو ترکی صوفی ادب کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ حکومت نے اپنے اس شاعر کو اب قدر و منزلت کی اُس مسند پر بٹھا دیا ہے جن کا تقاضا ان کی شخصیت کرتی ہے۔ کچھ سالوں سے حکومت اور کچھ نجی ادارے باہمی تعاون سے ہر سال ان کے اعزاز میں کانفرنسیں اور خصوصی لکچرز کا اہتمام کرتے ہیں۔ 1971-1972 کو یونیسکو نے بین الاقوامی سطح پر یونس ایمرے کا سال قرار دیا۔

میں یہاں رہنے کیلئے نہیں آیا میں تو رخصت ہونے کیلئے آیا ہوں
میں مسائل پیدا کرنے کیلئے نہیں میں صرف محبت کیلئے آیا ہوں
ان کی شاعری میں جا بجا وحدت الوجود کا اظہار ملتا ہے۔

یہ خاک کا پیکر نہیں تھا
میرا نام تو یونس بھی نہیں تھا
میں وہ تھا اور وہ میں تھا
متاع عشق جب اُس نے عطا کی
تو اس لمحے میں اس کے پاس ہی تھا

یونس ایمرے ترکوں میں بہت ہر دل عزیز ہیں۔ دراصل اُن کی شاعری عام ترکوں کے قومی مزاج کی خوبصورت عکاس ہے۔ ترک قوم کی دلیری اور خودداری کا اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار خاص و عام کی زبانوں پر ہیں۔ بیرونی دنیا میں اب ان پہچان ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ دراصل اُن کا کلام اپنی مادری ترکی زبان میں ہے۔ ان کے ہم عصر مولانا رومی کا کلام فارسی میں ہونے کی وجہ سے وہ برصغیر اور وسط ایشیا کی ریاستوں میں بہت زیادہ ہر دل عزیز ہیں۔ تاہم اب انگریزی ترجمے کی وجہ سے یونس ایمرے کے قارئین ان کی خدا داد صلاحیتوں سے آگاہ ہو رہے ہیں۔ اُن کے فن اور کلام کی سادگی، برجستگی اور فلسفے سے واقف ہو رہے ہیں۔

ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی ضرورت ہے
ایک دوسرے کو جاننے کی ضرورت ہے
ایک دوسرے کو پہچاننے کی ضرورت ہے

ایک دوسرے کے لئے کیوں نہ آسانیاں پیدا کریں
آؤ ایک دوسرے سے محبت کریں
جان لو کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں ہے



رابندر ناتھ ٹیگور

برصغیر کا نوبل ایوارڈ یافتہ عظیم شاعر

- ایک عظیم اور لافانی شخصیت جن کی شاعری، مصوری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، موسیقی، مقالہ نویسی غرض کہ کون سی صنف ایسی تھی جس کے وہ شہسوار نہ تھے۔
- اپنے والد کی طرح وہ بھی حافظ شیرازی اور مولانا رومی سے بہت متاثر تھے۔ ان کی شاعری میں اس کا اظہار ہوا۔
- ٹیگور کی ذات مذہب فرقد بندی، قوم و ملت کی بندشوں کو توڑتی اور انسان کو انسان سے جوڑنے کی ترغیب دیتی ہے۔

میرا دل جب سکڑ جائے
 اور وہ سخت ہو جائے
 تب لطف و عنایت کی گھٹا بن کر
 تیز بارش کی صورت میرے اوپر برس جانا
 جب زندگی سے خیر و بد کت اٹھ جائے
 تب گیتوں کی صورت بو چھاڑ بن کر آنا
 جب میرا پریشان دل ایک کونے میں پڑا ہو
 تب دروازہ توڑ کر اندر آنا
 جب آرزوئیں دل و دماغ کو
 لالچ و طمع کے حصار میں لے لیں
 اے ہمیشہ بیدار رہنے والے
 میرے پاس آنا
 اپنی روشنیوں کی چمک دمک کے ساتھ

رابندا تھ ٹیگور

رابندا تھ ٹیگور سے میرا پہلا تعارف پانچ جولائی 1969 کی اُس شب ہوا جس کی دوپہر کو میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے گرلز ہوسٹل رقیہ ہال میں بورڈ رہوئی تھی۔ آڈیٹوریم میں اُن کا ڈرامہ پترا گلداسٹیج ہو رہا تھا۔ رم جھم بدستی بارش میں رقص اور ان کی شاعری کے سنگت ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس کی یہ پیش کش حد درجہ کمال کی تھی۔

بنگالی زبان سے اُسے میں نے اُردو میں جیسور کی اُردو اسپیکنگ فاخرہ آصف سے سمجھا جو پانچ چھ گھنٹوں میں میری دوست بن گئی تھی۔ فاخرہ انگریزی میں ایک ایم اے کرنے کے بعد اب بنگالی میں دوسرے ایم اے کے فائیل ایئر میں تھی۔

رات کو جب میں چوبی بیڈ پر لیٹی پہلی بار گھر سے دور قد رے افسردہ سی سونے کی

کوشش میں تھی کہ محسوس ہوا جیسے وہ چھوٹا سا کمرہ ایک مدہم سے سردی نغے کے سر میں پہنے لگا ہے۔ پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ میری روم میٹ حبیبہ فاطمہ جو فینی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر چھوٹا سا ٹرانسٹر رکھے اس میں سے نکلتے بولوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر جانا کہ ڈیگور کی نظم ہے۔ گانے والی ملکیت کی کوئی گلوکار ہے۔ تھوڑا سا مطلب بھی جانی تھی۔

آسمان کے سوا تمہیں اے سورج

اور کون اپنا سکتا ہے

میں تو تمہارا پسند کیا کرتی ہوں

خدمت نہیں کر سکتی

فینی بیس اکیس سال کی انتہائی شوخ و شنگ، لا اُبالا سی، ہنسوز لڑکی جو فاطمہ کی

طرح بنگالی ادب میں ایم کے فائنل میں تھی۔ دونوں کلاس فیلو تھیں۔

پھر گا ہے گا ہے کبھی زبانی کلامی، اکثر و بیشتر تو فینی کے ہونٹوں سے جو کمرے میں

چلتے پھرتے

بانگلا ماٹی

بانگلا جل

امار سونا رینگلا

امی تائی بھالو باشی

یعنی بنگال کی مٹی، بنگال کا پانی، میرا سنہرا بنگال، مجھے تجھ سے محبت ہے جیسے کئی اور

گیت مثلاً

زندگی ہر لمحہ نئے رنگ میں آ

نت نئے روپ میں آ
 خوشبو میں آ، نئے ڈھب میں آ
 بادشاہ کے فرصت آ گئیں جھوٹوں میں آ
 دل میں لطف و شادمانی کی صورت آ
 آمیری نیم باز آنکھوں میں آ
 ہر لمحہ نئے رنگ میں نئے ڈھنگ میں آ
 اے مرکز لطف و عنایت
 اے حسن پر نور
 زندگی کے ہر عمل میں
 زندگی کے ہر لمحہ جان فزا میں آ
 اپنے چہرے سے نقاب اٹھا
 دید سے نواز دے
 ہر لمحہ نئے رنگ میں آ
 ہر پل نئے ڈھنگ میں آ

لبوں پر پھر کتے رہتے۔ مجھ جیسی مطلب جان جان کر محظوظ ہوتی رہتی۔ یوں کبھی ریڈیو، کبھی
 ٹی وی پر بھی ایسے نغمے جنہیں رابندر و شنیت کہا جاتا ہے سننے کو ملتے۔ یہ دل کے ساتھ ساتھ
 روح کو بھی مسرور کر دیتے۔ تاہم اس پیاس کو اس واقعے نے بڑھا دیا تھا جو مجھے آخر اکتوبر
 کے ایک دن پیش آیا۔

اس فسون خیزی و صلتی شام کے منظر نے میرے قدموں کو ساکت کر دیا تھا کہ میں
 اتفاقاً قریہ ہال کی مرکزی عمارت کے عقبی لان میں بنے پوکھر (تالاب) کی جانب نکل آئی

تھی۔ تقریباً تین ماہ سے امد آلود آسمان اور دھواں دھار قسم کی بارشوں کے نظاروں کی عادی آنکھوں کو اب ڈھاکہ کے آسمان کو نگھرا ہوا دیکھنا جہاں ایک جانب پھولتی شفق کے لال گلال رنگوں نے آگ سی سلگا دی تھی۔ ڈوبتی طلائی کرنوں کی دم توڑتی فضاؤں میں نہاتے، ہنستے، مسکراتے سانولے سلونے چہروں والی لڑکیاں جن کے گھٹاؤں جیسے کھلے آوارہ بال، کہیں اُن کے سینوں، کہیں بازوؤں اور کہیں پشت پر بکھرے جیسے شیش ناکوں کا سا تاثر اُبھارتے تھے۔ آدھی آستینوں والے بلاؤز میں پھنسے بازو چپو ہاتھوں میں تھامے نوکا (کشتی) کھیتے تھے۔ مترنم آوازیں گیتوں کی صورت فضاؤں میں سُروں کے راز کھولتی تھیں۔

مجھے محسوس ہوا تھا پوکھر (تالاب) کا ہلکورے لینا پانی جیسے ہواؤں میں بکھرے مترنم گیت کی نغمگی پر دھیرے دھیرے رقص کرتا ہو۔ کیسا مودہ لینے والا منظر تھا جو بندے کو پل بھر میں تھسیٹ کر کسی طلسمی دنیا میں لے جاتا ہے۔ بنگال کو حسن فطرت کی سرزمین، گیتوں کی دھرتی، سُروں کی دنیا ایسے تو نہیں کہا گیا۔ یہی جادوئے بنگال ہے۔ سارے میں بکھرے گیت کے بول، اس کی غنائیت، آواز کا لوچ اور رس جیسے میرے اندر اتر کر میرے سر پر کے ریشے ریشے میں گھل سا گیا۔

مجھ تو صرف اتنی سی مہربانی چاہیے
ایک لمبے کے لئے تیرے پاس بیٹھ جاؤں
اور کام جو مجھے کرنے ہیں
انہیں تو میں بعد میں بھی کر ہی لوں گا
تیری صورت سے ابھل ہو کر
میرا دل سکون و آتش سے دور ہو جاتا ہے

آج موسم گرما اپنی آہوں اور سرکوشیوں کے ساتھ
 میرے درتپے کے پاس آگیا ہے
 اور گفتہ کنج کے صحن میں شہد کی مکھیوں نے
 اپنا ساز چھیڑ دیا ہے
 وقت آگیا ہے اب کہ
 خاموش تیرے چہرے کے سامنے بیٹھ جاؤں
 اور پرسکون سی فرصت میں
 نغمہ حیات گاؤں

سلہٹ کی خود بصورت مستورہ جو ایک تلے والے میرے فلور پر روم نمبر 28 میں
 رہتی تھی۔ کشتی سے اتر کر میرے پاس آئی۔ آتے جاتے میری اُس سے اچھی ہیلو ہائے رتی
 تھی۔ بنگالی گیت میں میری اتنی دلچسپی اور انہماک دیکھ کر اس نے پہلے انگریزی میں مجھے اس
 کا ترجمہ بتایا۔ بتایا کیا اچھی طرح سمجھایا پھر لکھتے ہوئے ایک اور گیت گایا۔
 جو دی تو رڈاک سنے کیونہ آئے

تو بے ایک کلا چولو ایک کلا چولو ایک کلا چولو
 اس کا بھی مطلب سمجھا اور ساتھ ہی میں نے جانا کہ یہ ٹیگور کے گیت ہیں۔ یوں
 ان تین ماہ میں مجھے بنگالی کی کچھ شد بدھ ہوئی گئی تھی۔

اب میری شامیں اکثر و بیشتر پوکھر کنارے گزرنے لگیں۔ لڑکیوں سے ٹیگور اور
 نذزل اسلام کے گیتوں کو سنتے، بحث مباحثے کرتے، اپنے کمرے میں ٹرانسمیٹر پر کبھی کبھی
 مدہم آواز میں ان گیتوں سے محفوظ ہوتے اور کائن روم میں ٹی وی پر پرکشش چہروں کو ان
 شاعروں کے منتخب کلام کو سناتے دیکھتے میں دونوں شاعروں میں فرق سمجھنے لگی تھی۔ ٹیگور کی

شاعری میں موسیقیت کے جو دریا سے رواں رہتے تھے وہ اپنے سامع کو اپنے ساتھ بہانے پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔

ٹیگور سے محبت، اس کے بارے میں جاننے اور اس کی شاعری سے واقف ہونے، اس کے ڈراموں اور رقص ڈراموں کا شوق بھی مجھے اُسی زمانے میں ہوا۔ فینی اور فاخرہ دونوں نے اس شوق کو ہمیز دی۔

فاخرہ ڈراموں کی بھوک تھی۔ جونہی بلبل اکیڈمی یا کہیں اوپن میں ٹیگور کا کوئی ڈرامہ سٹیج ہونے کی بھٹک اس کے کانوں میں پڑ جاتی۔ بس لٹنی (بے چینی) لگ جاتی۔ اب کوئی ٹیسٹ ہے۔ کوئی آسانٹ دینی ہے۔ وقت کم ہے۔ کوئی فکر فاقہ نہیں۔ لٹنی تھی پوری۔ میں اس سے بھی بڑی لٹنی کہ دیندار گھر سے تعلق کے باوجود لاہور سینما میں چلنے والی ہر فلم کے پہلے شو میں سہیلیوں کے ساتھ گھر میں میلا دی کسی محفل، قرآن خوانی کی کسی تقریب میں شرکت کے بہانے بلانے میں مشہور۔ نتیجتاً کبھی بال بچتے اور کبھی برقعے کا اپر سر سے اتر کر گلے میں جھولتا۔

تو اب جب روک ٹوک ہی کوئی نہ تھی تو فاخرہ سے چار قدم آگے ہی چلنا تھا۔ تھی تو فینی بھی ایسی ہی پروہ پڑھائی پر سمجھوتا نہیں کرتی تھی۔

”چنڈ الیکا“ وہ ڈرامہ تھا جس کا شمار پورے دو دن کسی تیز نشے کی صورت میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔

”میری بات سنو“

کچھڑ میں اُگے کنول کی کوئی ذات نہیں ہوتی ہے۔ بیک گراؤنڈ میں ٹیگور کی ایک نظم کے مصرعے سے شروع ہونے والے ڈرامے کا مرکزی خیال چھوٹ چھات کے نظریے کی مذمت اور پیار و محبت آفاقی جذبہ ہے جیسے پیغام کا علمبردار تھا۔ کمال کی پیشکش تھی۔

”کال مر گیا۔“ ڈرامے کی پیشکش جگن ماتھ ہال کے سٹوڈنٹس کی طرف سے اوپن میں ہوئی تھی۔ ”ڈاک گھر“ اور ”مکنا دھارا“ دونوں بلبل اکیڈمی میں دیکھے۔ رابندر وشنیکٹ کے مقابلے جب جب ہوتے۔ فیٹی بتاتی اور چل پڑتی۔ بلبل اکیڈمی میں ہی میری ملاقاتیں ڈاکٹر لطف النساء سے بھی ہوئیں جس نے ٹیگور پر ڈاکٹر بیٹ کی تھی اور جو یہاں ڈاکٹر میکرتھی۔

ٹیگور بارے میں نے کسی ایک سے کسی ایک وقت میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے مختلف ٹکڑوں میں سنا۔ میں انہیں لکھ لیتی تھی۔ یہی لکھے ہوئے کاغذ ڈھاکہ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد میرے ساتھ لاہور چلے آئے تھے۔ انہی سنبھالے ہوئے ٹکڑوں کو میں نے کھولا ہے۔

7 نومبر 1969ء

ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی کا دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا ہے۔ اوپر تلے کی کلاسوں نے تھکا دیا ہے۔ میں نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے چادر کو اپنے اوپر ڈال لیا اور آنکھیں ذرا آرام کی غرض سے موند لی ہیں۔

تبھی فیٹی کی ”باپ رے باپ“ کی آواز نے چونکا دیا ہے۔ کیا ہوا؟ میری آنکھوں میں استفہامی سی علامات محسوس کرتے ہوئے وہ بولی۔

”رابندر ماتھ ٹیگور چودہ بہن بھائی تھے اور وہ ٹھاکر گھرانے کا آخری بچہ تھا۔“

فیٹی اپنے سامنے ایک موٹا سا رسالہ کھولے پڑھتے ہوئے چوکی تھی۔

”تو اس میں کوئی تعجب کی بات ہے؟ میری مانی کے گیارہ بچے تھے۔ پرانے

وقتوں میں بچوں کا یہی حساب کتاب ہوتا تھا۔ ہاں تم ٹیگور کو پڑھ رہی ہو۔“

”ہاں آسامنٹس بتاتی ہے۔“

میری دلچسپی دیکھتے ہوئے اُس نے بلند آواز میں پڑھنا اور بتانا شروع کر دیا تھا۔
 مہینہ مئی کا تھا۔ تاریخ سات اور سال 1861ء۔ کلکتہ شدید گرمی اور جس کی لپیٹ میں
 ہے۔ شہر کے قدیمی علاقے جوڑا ساگو کی ایک معزز شخصیت رہند رما تھ شاکر کے گھر
 چودہواں بچہ پیدا ہوا ہے۔ اس نے رسالے کا ایک صفحہ کھولتے ہوئے میری آنکھوں کے
 سامنے کیا۔

”یہ ہے وہ گھر۔“

ایک عظیم الشان دو منزلہ کلاسیکل طرز تعمیر کی حامل عمارت جس کی بلند و بالا
 کھڑکیوں کی لمبی آہنی سلاخوں اور چوبی پٹوں نے بڑی انفرادیت دے رکھی تھی۔ درختوں
 اور پھول بوٹوں سے گھری کشادہ انگنائی والی تھا کرباڑی۔

ٹوپی اور کد ارپٹی والا گھیر دار مغلیہ سٹائل کا فراک پہنے چودہ سالہ خوبصورت لڑکا
 بھی فیٹی نے دکھا دیا تھا۔

گھر میں رہند رما تھ کی بجائے رابی کے نام سے پکارا جانے والا یہ بچہ اپنے بچپن
 ہی سے بڑا منفرد اور عجیب سی عادات کا حامل تھا۔ بچے کی حرکات و سکنات بتاتی تھیں کہ
 ذہانت و فطانت میں غیر معمولی ہے۔ روایتی تعلیم سے اُسے کوئی رغبت نہ تھی۔ اسکول داخل
 کروایا تو بھاگ کر گھر آ گیا۔ سرے سے ہی منکر ہو گیا کہ اسکول تو جانا ہی نہیں۔ میرا تو وہاں
 دم گھٹتا ہے۔ مجھے تو مٹی ہوتی ہے۔ اور نیٹل سمیناری کے بعد بنگال اکیڈمی اور پھر مشہور زمانہ
 سینٹ زیورس میں بھیجا گیا مگر کسی جگہ بھی یہ فطین بچہ نکلنے کا نام نہ لے رہا تھا۔

کیسا بچپن تھا جو کھلونوں سے محروم تھا۔ کھلونوں سے کھیلنے ہی نہیں دیا گیا۔ سارا
 دن گھر کی چار دیواری میں رہتا۔ باہر نکلنے کا تب نہ رواج تھا اور نہ اجازت ملتی تھی۔ ٹیگور
 گھرانے کے اصول بڑے پختہ اور سخت تھے۔

فینی نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”کیا یہ غیر فطری نہیں کہ آپ ایک بچے سے اُس کا بچپن ہی چھین لیں؟“

میں چپ تھی۔ کہیں خیالوں میں ڈوبی کچھ سوچتی تھی۔

فینی نے سلسلہ گفتگو پھر جوڑ دیا۔

اس بچے کے لئے باہر کی دنیا سے کٹاؤ کیسا محسوس ہوتا ہوگا۔ بڑے کمرے کی کھڑکی سے باہر راگبیروں کو چلتے پھرتے، پھیری والوں کو سودے کے لئے ہانکیں لگاتے دیکھتے اور سنتے، گاڑیوں کو دوڑتے بھاگتے، آسمان پر اڑتے پرندوں، بادلوں کو جھومتے، راتوں کو گھر کی چھت پر چاند اور ستاروں کو دیکھتے، اُن سے باتیں کرتے وہ سوچ و فکر کی کن دنیاؤں میں رہتا تھا۔ اُس کا احساس صرف اُسے تھا۔

یقیناً یہ اس کے احساسات ہی تھے کہ جب اس نے بچوں کے لئے نظمیں لکھیں تو بی چتر سادھ Bichitr saadh جیسی نظم میں ایک چھوٹے سے طالب علم کے جذبات و احساسات میں اُن کا بچپن ہی تو بولا ہے کہ جہاں بچہ کہیں پھیری والا، کہیں باغ کا مالی اور کہیں پہرے دار بننے پر مچلتا ہے کہ یہ سب کردار اپنی مرضی کے مالک اور کسی کے پابند نہ تھے۔ ذرا ایک بند دیکھیے۔

ایک پھیری والا سر پر اپنی ٹوکری لئے

دیتا ہے صدائیں چوڑیاں لینا

اس کا دل جہاں جانا چاہے جاتا ہے وہ

لوٹ کر بھی اپنی مرضی سے گھراتا ہے وہ

اس کو کیا پروا گھڑی میں دس بجیں یا ساڑھے دس

اس کو جلد و دیر سے کیا، اس کو کیسی پیش و پس

ایسے میں دل چاہتا ہے سلیٹ اپنی پھینک دوں
 پھیری والا بن کے گلیوں میں یونہی پھرتا رہوں
 ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ سچ تو تھا کہ ایک عظیم انسان کے بچپن کے
 اس پہلو نے کتنا مسرور کیا تھا؟

فینی ابھی کچھ اور پڑھنے، مجھے سنانے اور نوٹس کرنے کے موڈ میں تھی۔ مگر باہر
 اُس کے نام کی پکارت تھی۔ دربان لڑکا کہتا تھا۔ ”آپ آپ کا وزیئر۔“ وہ ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتی
 اور چپل گھسیٹتی باہر نکل گئی۔

15 نومبر 1969ء

اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ ڈپارٹمنٹ سے واپس آ کر ابھی میں نے کمرے میں
 آ کر کتابیں اپنی منی سی میز پر رکھی ہیں کہ جب فائزرہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کوریڈور میں ہی
 کھڑے کھڑے اُس نے دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پوچھا ہے کہ
 مجھے کھانے کے لئے جانا ہے کیا؟

میں نے ساڑھی بدلنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے کو ترجیح دی
 ہے۔ لے کر کوریڈور میں چلتے ہوئے اس نے بتایا ہے کہ آج ٹیگور کے بچپن پر ایک کتاب اُسے
 لائبریری سے ملی ہے۔ اتنی دلچسپ ہے کہ لائبریری میں بیٹھے بیٹھے اُس نے آدھی سے زیادہ
 پڑھ بھی لی ہے اور اُسے ایشو کروا کے لے بھی آئی ہے، کمال کی کی لکھی گئی ہے۔

اور جب ہم دونوں بھات ماچھ کھاتی تھیں۔ وہ بولی تھی۔ گہرا دکھ اور تاسف اس
 کے لہجے میں گھل گھل کر باہر نکلتا تھا۔

”اب کون آج کی اندھا تعصب رکھنے والی اس بنگالی نسل کو سمجھائے کہ وہ جو
 بنگالی ادب کا باپ ہے۔ جس کی عالمانہ عظمت اور شاعری کا اعتراف ایک دنیا نے کیا۔ اُسے

عربی فارسی پر کتنی دسترس تھی اور وہ حافظ کا کتنا بڑا عاشق تھا؟ نہ صرف وہ بلکہ اُس کا باپ دیببند ر ماتھ بھی۔ اپنی مادری زبان بنگالی کے علاوہ، انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت میں غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔ حافظ شیرازی کے دلدادہ تھے۔ ان کی بنگالی سوانح عمری میں حافظ کا شعارجا بجا موتیوں اور نگینوں کی طرح بچے نظر آتے تھے۔

یوں بھی ٹیگور خاندان لباس، آداب، نشست و برخاست اور بود و باش میں مسلمانوں، اُن کی تہذیب، اُن کے فنون لطیفہ سے متاثر اور بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خصوصی نسبت اور تعلق رکھتا تھا۔ اِس گھرانے کی ایسی ہی وجوہات پر ہندوان کو ”دھریوں“ اور ہندو نما مسلمان سمجھتے اور کہتے تھے۔

باپ نے اپنا کمال فن بیٹے کو چھوٹی سی عمر میں ہی دینا اور اُسے مشرقی علوم میں طاق کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ بلوغت تک آتے آتے اُسے اِن زبانوں پر دسترس حاصل ہو چکی تھی۔

پتلی مسور کی دال والی پلیٹ اٹھا کر فاخرہ نے منہ سے لگائی۔ دو تین گھونٹ بھرے اور دیکھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اب ذرا تقابلی جائزہ تو لو۔ تب اور اب کا وہ اگر انقلاب کا زمانہ تھا تو یہ وقت کیا نئے رجحانات کو اپنے اندر سمیٹنے اور وسعتیں دینے کا نہیں؟ وہ کیا بنگالی نہیں تھے؟ تھے مگر صاحبِ ظرف تھے اور یہ بنگلہ کے پرستار جو اُردو کا گلا گھونٹ دینے کے متمنی ہیں۔ Son of the Soil کے نعرے لگانا ہی بس اُن کا مقصد رہ گیا ہے۔

شام کو پوکھر کنارے میں اُس سے ”میرا بچپن“ بارے سن رہی تھی۔

پہلی بھر پور یاد جس رُخ سے سامنے آتی ہے وہ شہر ہے ملکیت شہر کا وہ قدیم ترین حصہ جہاں شاعر نے جنم لیا تھا۔ جہاں بس، موٹر گاڑی، ٹرام کچھ بھی نہ تھا۔ چھکڑے سارا دن

گردوغبار اڑاتے اور گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر کوچوان تابڑ توڑ چا بکوں سے حملے کرتے تھے۔ عورتوں کا اندر باہر جانا دم گھٹا دینے والی پالکیوں میں ہوتا۔ اگر کوئی عورت اچانک غیر مرد کے سامنے آ جاتی تو اس کا گھونگھٹ فوراً آدھ گز نیچے آ جاتا۔ گھر کی ڈیوڑھی پر بیٹھا دربان پورے گھر کی نگہبانی کرتا۔ ان کرداروں کی تفصیل بڑی دلچسپ تھی۔

شہر میں نہ گیس تھی نہ بجلی۔ جب مٹی کے تیل سے روشنی ہوئی تو پہلے پہل اسے بھی دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ تب گھروں میں نوکرارمڑی کے تیل کے دیئے جلاتے۔ جس کمرے میں ہم پڑھتے وہاں دو بتیوں کا ایک دیا دیوٹ پر جلتا۔

ماسٹر صاحب ٹھمناتی روشنی میں "پہلی کتاب" کھولنے کا کہتے۔ پہلے تو میری جمائیاں شروع ہوتیں۔ پھر آنکھیں کبھی بند ہوتیں اور کبھی کھلتیں۔ اب ماسٹر صاحب کی پھٹکار دے دے لفظوں میں اس کا فلاں شاگرد پڑھائی میں اتنا ہوشیار، فلاں لکھنے میں اتنا تیز، فلاں کو تیار پڑھنے میں سونا۔ ایسی سب باتیں میرے سر پر سے ہوا کے کسی جھونکے کی طرح گزر جاتیں۔

ان یادوں کا ایک اہم کردار بر جوشیور بڑے دلچسپ انداز میں سامنے آتا ہے۔ ٹیگور کی زبان میں کہ وہ ہم نظر انداز بچوں کی دیکھ بھال یعنی کھانے، نہلانے اور ہمارے دیگر جملہ امور کی نگرانی کے لئے لایا گیا تھا۔ طبیعت بڑی لالچی تھی۔ ہماری تھالیوں میں کبھی کھانا پروس کر نہ رکھتا۔ جب کھانے کو بیٹھتے تو ایک ایک پوری کو دور سے ہاتھ میں گھماتا ہوا دیتا اور پوچھتا کہ "اور چاہیے"۔

یہ "اور چاہیے" جس لب و لہجے میں کہتا اُس کا ایک ہی مطلب ہوتا۔ بس کرو اب۔

میں تو بالعموم یہی کہتا۔ "نہیں اور نہیں چاہیے۔"

میرے دودھ کے کٹورے پر بھی اس کی حریصانہ نظریں منڈلاتی ہی رہتیں۔
یہ کم کھانا بھی کچھ گھاٹے کا سودا نہ رہا کہ زیادہ کھانے والوں سے مقابلے میں
توانائی میں کمزور نہ تھا۔

اس طاقت اور توانائی کا ثبوت اس بات سے ملتا تھا کہ جب جب سکول سے
بھاگنے کو جی چاہتا۔ منصوبہ بندی میں کوئی بھی بیماری مثلاً نزلہ، زکام، کھانسی، بخار وغیرہ سبھی
ماٹھے پر آنکھیں رکھ لیتیں۔ ٹھینکا دکھاتیں۔ اب انہیں بلانے کے لئے میرے طرے ملتے،
کہیں پانی میں بھگوایا ہوا جوتا پہن کر دن بھر گھومنا، کاتک کے مہینے میں کھلی چھت پر سونا۔ مجال
جو اُسے مجھ پر ذرا سا بھی رحم آجائے۔ مجال تھا جو کچھ ہو جائے۔

کہانیوں کے سننے کا چسکہ اُن کی طلسماتی دنیا، میرے خواب اور سوچیں۔ پہلی
بیٹھک بر جوشیور کے پاس جمتی۔ رامائن سنتے سنتے کشوری چاٹو جے آجاتا۔ اُس سے رامائن
کتھا نظم کی صورت سنی جاتی۔ اس کے گلے سے سخن کی لڑیاں جھرنوں کی سی اٹھکیلیاں
اور کلیں کرتی بہتیں۔ یہ محفل جب ختم ہوتی میں ماں کے کمرے میں جاتا۔ ماں اُس وقت
اپنی کاکی کے ساتھ تاش کھیل رہی ہوتی۔ میں جاتے ہی شور مچانا شروع کر دیتا۔ فو رہا تھ
کے پتوں کو پھینکتے ہوئی کاکی سے مخاطب ہوتی۔

”لے جاؤ اور کہانی سناؤ اُسے۔ جب تک یہ سوئیں جائے گا اس کا یہ غل غپاڑہ
ایسے ہی رہے گا۔“

ہم لوگ برآمدے میں رکھے لوٹے کے پانی سے پاؤں دھو کر نانی کو بستر پر گھسیٹ
لاتے۔ اب دیووں کی کہانی، راجکماری کی کہانی کب تک یہ چلتی۔ میں تو کہیں خوابوں کی دنیا
میں چلا جاتا۔ کہانی ہمیشہ میری کمزوری رہی۔ یہ دن میں بھی جب میں اکیلا ہوتا میرے
ساتھ رہتی۔ کبھی پاکی میں، کبھی پیدل، کبھی کسی اڑن کٹھولے پر، کبھی جنگلوں میں، کبھی

دریاؤں پر۔

سچ تو یہ ہے کہ بچپن کی یہ تصوراتی سیر بڑے ہو کر دنیا کے اسفار کی صورت میں مجھے نصیب ہوئی۔ گھر سے باہر نکلنے کی پابندی نے سفر کرنے کی خواہش کو ایڑ لگائی تھی۔ بچپن کی تنہائی، جوانی اور اُدھڑ عمری میں دوستوں کی معیت میں نئی دنیا میں دیکھنے کی متمنی تھی جس کی تکمیل بہت احسن طریق سے ہوئی۔

کہانیوں کی دنیا میں کھونا مجھے بہت پسند تھا۔ شاید نہیں۔ شاید کہانیاں افسانے اور ناول اُسی شوق اور تجسس نے لکھوائے۔

فاخرہ سے میں نے کسی ناول بارے پوچھا جو اس نے پڑھا ہو۔

”ارے ایک دو۔ میں نے تو کئی پڑھے ہیں۔ افسانے بھی بہترے۔ ناولوں میں مجھے گھورے بائیرے، جوگا جوگ، دوئی بون اور کورا بہت پسند ہیں۔“
کہیں کا بلی والے کا ذکر آیا تو مجھے یاد آیا۔ یہ افسانہ میں نے پڑھا ہے۔ ذہن میں جزئیات بھی ابھر آئی تھیں۔

”چلو اب سنو۔“ فاخرہ نے پھر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

کہانی کے جلد ختم ہونے پر بھی مجھے ہمیشہ اعتراض ہوتا۔

خوف، ڈر، بے قراریاں، اضطراب سب میرے اندر سے نکل کر ہونٹوں پر سوال جواب کی صورت پھدکتے۔ جہاں کہیں کہانی میں سنسنی خیز موڑ آتا۔ اضطراب میں ڈوبا ہوا جملہ ”پھر کیا ہوا“ فوراً بھونپ کر آ جاتا۔

ایک اور کام کرنا بھی میرا معمول تھا۔ وہ تھا میری ماسٹری، میری اُستادی۔ گھر کے سارے ستون کھجے میرے شاگرد ہوتے۔ میں انہیں خوب لاتا دیتا، خوب مارتا۔ نہیں پڑھو گے تو بالآخر بڑے ہو کر قلی بنو گے۔ ان کی خوب خوب پٹائی کرتا۔

یہ منظر بھی میرے پسندیدہ منظروں میں سے ایک تھا کہ جب گھر میں مہمان آتے۔ گھر کی ڈیوڑھی کے سامنے بڑی بڑی کھیاں آکر رکتیں۔ مرکزی دروازے پر بڑے بھائیوں میں کوئی ایک مہمانوں کے استقبال کے لئے ضرور موجود ہوتا۔ نوکران پر گلاب دانیوں سے گلاب پاشی کرتے۔ ہاتھوں میں پھولوں کے دستے تھماتے۔ بھائی بصد عزت و احترام انہیں اوپر لے جاتے۔ خاطر مدارات کا سلسلہ، روشنیوں سے چمکتے کمرے اور گھر سب مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

گھر دار عورتوں کے سچے سنورنے کے طور طریقے سنتے ہوئے بھی لطف آیا تھا۔ میں تو ہنستی چلی جاتی تھی۔

گلی میں "بیل پھول، بیل پھول" کی صدا بھی بڑی اچھی لگتی تھی۔ موسم بہار کیا آتا یہ پھول ڈالیاں اور ان کی خوشبوئیں گلیوں کو مہکا دیتیں۔ گھر والیوں کے لابنے بالوں کے بھاری جوڑے اُن کے شانوں پر پڑے۔ بیلے ہاروں سے سج جاتے۔ جدھر سے گزرتیں خوشبوئیں بکھیرتی چلی جاتیں۔ ہاتھ منہ دھونے سے پہلے آئینہ ہاتھ میں پکڑ کر بالوں کو سنوارا جاتا۔ گھر میں خود سے بنائی ڈوری سے جوڑا باندھا جاتا۔ سائن کا گھروں میں آنے کا بھی بڑا رواج تھا۔ یہ بھی ایک کردار تھا۔

میرے بچپن میں چاکلیٹ نہیں ہوتی تھی۔ گلابی ریوڑیاں، خوشبو میں بے تل سے لدے پھندے چینی کے ڈھیلے سے کس مزے کے ہوتے۔ بجھنے ہوئے مسالے والے ٹھونگے، وہ سستا سا تل والا گجا۔ برف کی ہاڈی میں لگی کلفیاں۔ جب پھیری والا آواز لگاتا۔ ہائے دل کیسا اُتھل پھٹھل ہونے لگتا۔

”ہائے ٹیگور کے بچپن کی کچھ چیزیں تو معاشرت کے فرق کے باوجود ہمارے بچپن جیسی بھی تھیں۔“ بچوں جیسی خوشی نے میری آنکھوں سے جھانکتے ہوئے کو کیا کہا تھا۔

انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں کے ہندوستانی بنگال کی تہذیبی معاشرت کی جھلکیوں کی خوبصورت اور دلکش تصویر نے دل شاد کیا تھا۔ شام بہت مزے کی گزری تھی۔ کیسا مزے کا پچپن۔

27 نومبر 1969ء

آج رقیہ ہال میں پندرہواڑہ فیٹ Feast ڈے تھا۔ لڑکیوں نے سرشام ہی ڈاننگ روم کے گرد منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ کامن روم میں بھی رش تھا۔ فاخرہ اور میں بھی انہی لڑکیوں میں شامل تھیں۔ ٹی وی پر گیتوں کا پروگرام چل رہا تھا۔ دفعتاً ایک دلکش چہرہ اپنی دلکش آواز کے ساتھ نمودار ہوا۔ یہ فردوسی بیگم تھیں۔ پوربو پاکستان یا پوربو بنگال کی مترنم آواز گیت جو وہ جو گا رہی تھی وہ ٹیگور گیت تھا۔

اُف ایسا لگا تھا جیسے سارا ماحول ایک انوکھے سے سُر میں بہنا شروع ہو گیا ہے۔ فاخرہ گیت کا ساتھ ساتھ ترجمہ کئے جاتی تھی۔

اے دنیا میں نے صبح کے ہنگاموں میں

تیرے باغ سے ایک پھول توڑا

اُسے اپنے سینے پر رکھا

اس کا کاٹا دل میں پھجھ گیا

شام ڈھلی تو میں نے دیکھا

پھول مڑھال تھا پر درہاقتی تھا

ایک سے ایک بڑھ کر حسن اور خوشبو میں

تجھ میں پھول تو بہت پیدا ہوں گے

مگر میری گل چینی کا وقت

بہت عرصہ ہوا کہ ختم ہوا
اور اب جب کہ رات طاری ہے
گل نہیں پاس مگر درد باقی ہے

10 دسمبر 1969ء

ڈاکٹر لطف النساء سے تعارف فیمنی کے توسط سے ہوا تھا جس کے ساتھ میں اکثر ڈرامے دیکھنا اور گیت سننے آتی تھی۔ اس وقت دسمبر کی اُداس سی شام میں بلبل اکیڈمی کے ٹھنڈے ٹھار بھائیں بھائیں کرتے کمرے ایک عجیب سا یاس فضا میں پھیلا رہے تھے۔ دو کمروں میں کچھ لوگ نظر آئے تھے۔ ایک میں شاید کوئی ڈرامہ ورامہ کا سلسلہ تھا اور دوسرے میں سرنگیت کی محفل برپا تھی۔

خوش قسمتی ہی تھی کہ لطف النساء سے ملاقات ہو گئی۔ دراصل یہاں آنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ پرانے ڈھاکہ مشہور مصور زین العابدین سے ملنے اور اُن کا انٹرویو کرنے گئی تھی۔ واپسی پر یونہی ٹیگور کی ہڑک سی اٹھی تھی اور اکیڈمی چلی آئی۔

لطف النساء محبت کے شیرے سے کوندھی ہوئی عورت ہے۔ اس کے اندر ویسٹ پاکستانیوں کے لئے کوئی بغض اور تعصب ہو تو ہو مگر اس کا چہرہ جیسے متانت کی لطافت اور پیار کی نرم پھوار میں بھیگا بھیگا سا رہتا ہے۔ جب جب بھی ملاقات ہو۔ گندوراج کے پھول کی طرح کھلی نظر آتی ہے۔

آج بھی چھٹی ڈال کر ملی۔ زین العابدین سے ملنے کا سن کر خوش اور ٹیگور کے بارے میں میری کچھ جاننے کی خواہش پر مزید خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔

رمضان میں یونیورسٹی بند ہونے اور عید پر گھر جانے کا پوچھنے پر میں نے فوراً کہا

تھا۔

”ارے نہیں آپا رمضان تو یہیں ہوٹل میں اور عید اپنی کلاس فیلو کے ساتھ
باریال منانے جاؤں گی۔ اپنے دیس کے اس حصے کے رمضان کی رونقیں اور عید کو بھی تو
دیکھوں۔“

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

عظیم اور لافانی شخصیت جن کی شاعری، مصوری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، موسیقی،
مقالہ نویسی غرض کہ کون سی صنف ایسی تھی جس کے وہ شہسوار نہ تھے۔ قلم اُن کا وہ ساتھی تھا جو
کبھی اُن سے جدا نہ ہوا اور زندگی کا وہ کون سا ایسا گوشہ تھا جس پر انہوں نے نہ لکھا۔ ادب،
فلسفہ، تاریخ، تصوف، مذہب، سیاست، اخلاقیات، سماجیات جسے پکڑا اُس کے اندریوں
اُترے کہ وہ تحریر جاوداں ہو گئی۔ جو لفظ چنا اُسے معتبر کر دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی شاعری کی بنیاد شدید قسم کی جذباتیت اور تیز حسیات کی
مرہون منت ہوتی ہے۔ تخیل کی رنگینی اور زبان کی سادگی جس شاعر کے ہاں ملے گی وہی
حقیقی اور سچا شاعر کہلائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں ٹیگور کے ہاں خیالات کی جدت ہے۔ تیز رفتار
تخیل کی جولانیاں ہیں۔ رنگینی ہے، جذبات کی شدت اور احساسات کا تیز بہاؤ
ہے۔ خیالات میں گہرائی اور گنگنائی ہوئی سادہ زبان۔ اُس کے انہی اوصاف نے اُسے
ایک عظیم شاعر بنا دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب اُن کی شہرہ آفاق تصنیف گیتا نجلی کا انگریزی ترجمہ یورپ
میں پڑھا گیا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ دنیا نے اُسے کس کس انداز میں تعظیم دی۔ کسی نے
کہا۔ ٹیگور شاعر کائنات ہے۔ کسی نے کہا وہ بیسویں صدی کے عظیم ترین شعرا کی قطار میں
سب سے آگے ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی شاعری نے نئی نئی جہتوں کو نئے نئے انداز میں دریافت کیا

اور وہ سننے سننے راستوں پر چلی۔ شاعری کی مروجہ پرانی ریت و روایتیں اور تنگ راستے سمجھوں سے اُس نے اپنا تعلق واسطہ نہ رکھا۔

الیکزینڈر سرگیوویچ پشکن (Alexander Sergeyvich Pushkin) کی طرح جس نے روسی زبان کو اپنی بے مثال شاعری سے مالا مال کیا اور یورپی زبانوں کے مقابل لاکھڑا کیا۔ ٹیگور نے بنگلہ زبان کو وہی درجہ دیا کہ وہ ٹیگور کی شاعری کی بدولت ارتقا کی بلند یوں کو چھونے لگی۔

انگریزی ترجمے نے اُس کی شہرت چاروا نگ پہنچا د تھی۔

”آپا یہ ترجمہ کس نے کیا تھا؟“

”ارے کسی نے بھی نہیں اُس نے خود کیا تھا۔ دیکھو تو ذرا پتہ نہیں وہ کیوں اس احساس کمتری میں مبتلا تھا کہ اُس کی انگریزی اچھی نہیں۔ ہمت ہی نہیں کرتا تھا۔ ایک دن عجیب سی بات ہوئی۔“

یہ چیت کے دن تھے۔ آموں کے بور کی خوشبوئیں نقضوں میں گھس گھس کر عجیب سی کیف اور مستی کے جذبات پیدا کر رہی تھیں۔ عطریز ہوائیں دل کے تار جھنجھوڑے جاری تھیں۔ جب اُس نے گیتا نجلی (بہار کا گیت) اٹھائی۔ کا پی قلم پکڑا اور ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ کا پی ختم ہو گئی تو اُسے جیب میں ڈالی اور لندن جانے کے لئے بحری جہاز میں سوار ہو گیا۔ جہاز میں دوسری کا پی بھی بھر گئی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ جہاز میں روٹن سائین بھی سوار تھا۔ اس نے بعد اصرار ترجمہ دیکھنے کی خواہش کی۔ پڑھ کر تو وہ حیران رہ گیا۔ یہی کا پیاں اس نے ایٹس yeats کو کھجوا دیں۔ وہ بھی پڑھ کر گنگ سارہ گیا۔

ایٹس نے گیتا نجلی کا پیش لفظ لکھا اور کہیں چھوٹی موٹی اصلاح کی۔

”گیتا نجلی اُس کی لافانی شاہکار تخلیق ہے۔ ایٹس yeats لکھتا ہے۔“

یہ ترجمہ ہر جگہ میرے ساتھ جاتا۔ بسوں، بڑیوں، ریسٹورنٹوں میں۔ میں ہر جگہ اس کا تذکرہ کرتا اور اسے سراہتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب راستہ چلنے والے انہیں راہ میں گنگنا نہیں گے۔ کشتیوں پر ملاح انہیں گائیں گے۔ عاشق اپنے معشوق کے انتظار میں، محبوبہ اپنے چاہنے والے کے انتظار میں، خدا سے محبت کرنے والے اس کے حوالے دیں گے۔“

ڈبلیو بی اینٹنس جیسے انگریزی ادب کے عظیم شاعر کا یہ خراج تحسین یقیناً نیگور کے لئے بڑا امتیاز تھا۔ نیگور کی یہی سحر کاری اُسے ممتاز کرتی ہے۔ مترنم سادہ سا اسلوب منفرد کرتا ہے۔ سندھانگیت (شام کا نغمہ) سے اس کی غنائی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ آغاز میں یاسیت کا بھی غلبہ رہا۔ مگر یہ وقت جلد گزر گیا۔ پر بھات سنگیت (صبح کا نغمہ) میں ذرا دکھینے صبح کی رو پہلی دھوپ میں پھیلی ہوئی زندگی اس کیلئے کتنی دلا آویز ہے۔

میں اور کچھ نہیں چاہتا

بس اگر چاہتا ہوں تو اتنا سا

اسے دیکھتا رہوں

مسحور رہوں

ہر چیز بھول جاؤں

گم سم رہوں

مانسی (محبوبہ) کو پڑھیں تو شاعر کی فنی چٹنگی کا نقطہ کمال محسوس ہوتا ہے۔

”اے بار پھر اوسورے“ (اس بار مجھے لوٹا دو) اُس کی ایسی ہی ایک شاہکار نظم

ہے۔ اسی طرح ”لامتناہی راستہ“ کا گیت ہے۔ اُس بچی کا گیت جو چھوٹی سی ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

میں اٹک باؤس لڑکی کو دیکھتا ہوں

محبت سے لبریز آنکھوں والی بچی

میری کشتی سفر پر چل پڑے گی

اور بچی بھی اپنا کام پورا کرے گی

وہ مجھے نہیں جانتی

میں اُسے نہیں جانتا

مگر میں سوچتا ہوں

وہ کسی نامعلوم بہتی اور نامعلوم اجنبی گھر میں دلہن بن کر جائے گی

پھر ماں بنے گی

اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا

ٹیگور کا یہ گیت کتنی سچائی اور کڑی حقیقت پر ہے۔

ٹیگور کے نزدیک انسان خدا کا پرتو ہے۔ ہر ایماندار، نیک اور جفاکش انسان میں

خدا پنہاں ہوتا ہے۔ اسے خانقاہوں، مسجدوں اور مندروں میں محسوس کرنے والوں سے وہ

کہتا ہے۔

یہ عبادت (بھجن) یہ تسبیح خوانی چھوڑ

دروازہ بند کر کے خانقاہ کے دیوان اُجڑے کوشے میں تو کس کی پوجا کر رہا ہے؟

آنکھیں کھول اور دیکھ خدا تیرے سامنے ہے

وہ کہاں ہے؟

وہاں جہاں کسان سخت زمین میں بل چلاتا ہے

جہاں سڑک کی تعمیر کرنے والے پتھر کوٹتے ہیں

دھوپ اور بارش میں کام کرتے ہیں
 خدا تو اُن کے پاس ہے
 گیتا نجلی کی زیادہ نظمیں اور گیت حمدیہ اور مناجاتی ہیں۔ اپنی عبادت اور سپردگی
 کے باعث اس کے ہاں یہ پختہ یقین ہے کہ موت کے بعد جو زندگی ملے گی وہ بہتر اور اچھی ہو
 گی سزا دیکھیے۔

اے موت تو میری آخری جائے پناہ ہے
 آ مجھ سے سرکوشیاں کر
 میں تیرا منتظر ہوں
 زندگی کے دلولے اور خوشیاں صرف تیری وجہ سے ہیں
 پھول کوندھے جا چکے ہیں
 دُلہا کے لئے ہار تیار ہے
 شادی کے بعد دلہن اپنے گھر جائے گی
 رات کی تنہائی میں اپنے خدائے حقیقی سے ملے گی
 ایک اور نظم دیکھیے۔

میرا وقت ختم ہوا
 مجھے رخصت کرو
 اپنا سر جھکا تا اور الوداع کہتا ہوں
 میں اپنے دروازے کی کنجی تمہارے حوالے کر رہا ہوں
 اپنی تمام چیزوں سے دست بردار ہوتا ہوں
 دن ڈھل چکا شمع حیات کی لودھم پڑی

بلاوا آگیا اور میں سفر کے لئے تیار ہوں
 حسن فطرت سے اُسے عشق ہے۔ یہ صبح شام موسموں کے بدلتے رنگوں کے ساتھ
 کیسے پرانے پیرھن اُتار کر نئے پہنتی ہے۔ اُن پرانے اور نئے رنگوں میں حُسن و رعنائیوں
 کے جلوے اس کے دل کی دنیا تہہ بالا کرتے ہیں۔ اس کا اظہار بھی کیا خوب ہے۔

آسمان بادلوں سے بھرا ہوا ہے

بارش بند نہیں ہوتی

میں نہیں جانتا

میرے اندر کون سی بیتابی ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

طلوع آفتاب زمین کو

زریں تاج پہنانے آیا

اُن کی ازدواجی زندگی بارے کچھ سننے اور کچھ جاننے کی بھی بڑی خواہش تھی۔ یہ
 تمنائیں نے ہی پوری کی کہ اس کا تھیس تھا ہی ٹیگور پر۔ یوں بھی وہ بہت پڑھا کلوڑ کی تھی۔
 جھٹ سے اعتراض پھٹ سے نقطہ چینی کر دینا بھی اُس کے لئے کھیل تھا جیسی ہی بات
 تھی۔ باتیں کرتے کرتے چٹکے چھوڑنا بھی اُسے بہت پسند تھا۔ وہ بنگالی وغیرہ بنگالی تعصب
 سے بالابڑی خاص قسم کی چیز تھی۔ فنی جیسی لڑکیاں ہزار لڑکیوں کے ہوشل میں بس دو تین ہی
 ہوں گی شاید۔

10 فروری 1970ء

جنوری بڑا مصروف مہینہ تھا۔ عید کے بعد سکیڈ ٹرم شروع ہونے والی تھی۔ نپٹے
 نپٹا تے فردری آگیا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ہم کمرے میں اکٹھی تھیں۔ اُس نے ٹرانسٹر کی

نوب بند کرتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ آج نوبکے نہ سو جائیں تو باتیں ہو سکتی ہیں۔“

”فیئی، ٹیگور پر بات کرنے کے لئے نیند جیسی چیز کی قربانی کی کیا حیثیت ہے؟“

چلیئے اس عظیم شخصیت کی ازدواجی زندگی کا بھی رخ دیکھ لیں۔ لہن کا نام بھبوتا ریٹی۔ تیرہ سالہ کم پڑھی لکھی عام سی لڑکی تھی یہ۔ بنی مادھوپ رائے چودھری کی بیٹی تھی۔ لہا اس وقت کوئی تیس برس کا تھا۔ عمر میں دس سال چھوٹی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ دنیا کے جینس انسان کی بیوی بن رہی ہے۔ لیکن وقت نے بتایا کہ اس نے خود کو اس اعزاز کا اہل ثابت کیا۔

ٹیگور نے جوانی کا کچھ حصہ شیلائی داہ اور شہزاد پورا اپنی زمینداری پر اور کچھ وقت بیرون ملک کے دوروں اور سیر سپاٹوں میں گزارا۔ یہ وہ وقت تھا جب اپنی بیوی کے ساتھ ان کی ملاقاتیں کم رہیں۔ مگر دونوں کے درمیان خطوط کا تبادلہ ضرور رہا۔ فیئی کی جملہ بازی اس موقع پر بھی ہوئی۔ تاہم یہ ہندوستانی معاشرت کا ایک حصہ تھا اور زمانہ کافی آگے بڑھ جانے کے باوجود آج بھی ایسی ہی صورت حال کسی حد تک ہے۔ میرے رد عمل اور جواب نے اُس نٹ کھٹ کو چپ کر دیا تھا۔

شوہر نے جو نام دیا وہ مرینا لانی دیوی تھا۔ اس نام کا بھرم رکھنے کیلئے اُس کم عمر لڑکی نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی ماں بننے کے باوجود دوسری زبانیں سیکھیں۔ ادب، موسیقی اور آرٹ کی باریکیاں جانیں۔ اپنے شوہر کے مقام اور مرتبے سے آگاہ ہوئی۔

رابندر ماتھ کو اس منزل تک پہنچانے میں مرینا کے ہاتھ کو نظر انداز نہیں کیا جا

سکتا۔

کبھی شوہر کے کاموں میں مداخلت نہیں کی۔ کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں۔ شافی فکیتن میں جب کھلے آسمان تلے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو کہیں سے مدد نہ ملی۔ ایسے میں وفا شعار بیوی نے سب زیورات قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ ٹیگور نے اسے پسند نہ کیا۔ لیکن جب دھو بھارتی (یونیورسٹی) قائم کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی کے ہنہم اصرار پر یہ بددق بولنے پر راضی ہو گئے۔

تاہم یہ بات فینی کے لئے خاموشی سے بتانے پر مرکوز نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کے تبصرے نما اعتراض بھی تھے۔

آخر مرینا لانی کا ذکر ٹیگور کی کسی تحریر میں کیوں نہیں ملتا؟ کبھی کوئی چیز اُس کے نام سے منسوب کیوں نہ ہوئی؟ کیوں آخر؟ اُس نے آنکھیں میرے چہرے پر جمادیں۔ اور تیکھے لہجے میں بولی۔

”ایسی وفا شعار بیوی۔ ٹیگور جب کبھی باہر سے آتے تو وہ اُن کے لئے بہت اہتمام سے کھانا بنواتی۔ ٹیگور بہت سادہ سے کھانے کو ترجیح دیتے۔ مسالوں اور تیل کی زیادتی پسند نہ کرتے۔ مرینا ان سب باتوں کا دھیان کرتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ بہت چاؤ سے دسترخوان سجاتی۔ انہیں کھانے کے لئے آنے کا کہتی۔ اب انتظار میں دیدہ دل بچھائے بیٹھی ہے اور ٹیگور پر تخلیقی آمد کا نزول ہو گیا اور وہ آنے کی بجائے مہا کوئی تخلیقی عمل میں مصروف ہو گئے۔ کیسی صابر شا کر عورت تھی کہ پیشانی پر خفیف سی سلوٹ لائے بغیر ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ ان کے کاموں میں مداخلت کرنا اس کے لئے گناہ کے برابر تھا۔ کھانا تب پروتی جب وہ اس کا اذن دیتے۔ رات اکثر دیر تک کام میں مصروف رہتے۔ صبح دم بھی جلد اٹھتے۔ غسل، عبادت، ناشتہ، لکھنے کی میز، اُس کی صفائی ستھرائی۔ سردیوں گرمیوں کے کپڑے سب کا دھیان رکھنا نوکر کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ذمہ داری بھی

سمجھتی۔

ٹیگور فطرتاً لاپرواہ تھے۔ تخلیقی عمل سے فارغ ہوتے تو سارے سریر میں کاہلی اور سستی درآتی۔ بھول جاتے کہ جو کچھ تخلیق ہوا اور لکھا گیا ہے اُسے سنبھالنا بھی ہے۔ تاہم یہ مرینا دیوی تھی کہ جو اُن کی چھوٹی سے چھوٹی تحریر کو طریتے سلیتے سے سنبھالتی۔

ٹیگور نے مرینا کو جتنے خط لکھے۔ اس نے اُن کی جی جان سے حفاظت کی۔ ایک خوبصورت منقش صندوقچے میں محفوظ کرتی۔ شوہر کو اُسکے اپنے لکھے ہوئے خطوط کا شمار اب ادبی نقطہ نظر سے ہو رہا ہے۔ ہاں البتہ کہا جاتا ہے کہ رابندر کی مشہور کہانی استری پتر میں مرینا کی ذات کے کچھ عکس ملتے ہیں۔ آخری عمر میں زبان بند ہو گئی تو رابندر نے لکھا۔

اتنی فرصت نہ ملی

یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ تم

دل کی آخری باتیں کہہ جاتیں

خاموش رخصت

ہجر کا درد لئے

میں چاروں اور فضول تسکین کی تلاش کرتا رہا

ایک جگہ اور دیکھیں وہ مرینا کے ہجر میں کیا کہتے ہیں؟

تم اپنا وہ اچھا لگنا میری آنکھوں میں نقش کر کے

میری آنکھوں میں اپنی نگاہ رکھ گئی ہو

آج میں اکیلے ہی دونوں کا دیکھنا دیکھ رہا ہوں

تم میرے سن میں مدج رہی ہو

میری آنکھوں کی پتلیوں میں اپنی نگاہ شوق کی لکیر بنا کر

میرے زندگی میں تم جئے جاؤ جئے جاؤ
میرے دل کے ذریعے سے اپنی مراد مانگو
تاکہ میں دل میں سمجھوں کہ نہایت پوشیدہ طور سے
تم آج مجھ میں ’بن‘ کر بس رہی ہو
میری زندگی میں جئے جاؤ جئے جاؤ

15 مارچ 1970ء

اس ضمن میں جس اور نمایاں شخصیت سے میری بھرپور بات چیت رہی وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ابوسعید چوہدری تھے جو بعد میں بنگلہ دیش بن جانے پر ملک کے صدر بھی بنے۔ اُن کے ساتھ ملاقات بڑی دلچسپی کی حامل تھی۔

اُن دنوں ہاتھ کی لکیروں سے میرا عشق جنون کی حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وی سی ہمارے ڈپارٹمنٹ کی ایک تقریب میں آئے۔ فیکلٹی ممبران کے ساتھ کھڑے تھے جب میں ان کے پاس گئی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور بنگلہ میں کہا۔
”سر مجھے آپ کا ہاتھ دیکھنا ہے۔ وقت آپ نے بتانا ہے کہ کب آپ کے پاس آؤں؟“

انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

”سر میں بہت اچھا ہاتھ دیکھتی ہوں۔ حینہ واحد کا ہاتھ بھی میں نے دیکھا ہے۔
میرے پاس اس کے ہاتھ کے پرنٹ بھی ہیں۔ اُس وقت میرے تن پر آبی رنگی مینگا کی خوبصورت ساڑھی تھی۔ شانوں پر گھنے سیاہ بال لہراتے تھے۔ سانولی رنگت کے ساتھ میں مکمل طور پر ایک بنگالی لڑکی نظر آتی تھی۔“

میرے ہیڈسرنے مسکراتے ہوئے پہلے مجھے اور پھر انہیں دیکھا اور میرا تعارف ویسٹ پاکستانی سٹوڈنٹ کی حیثیت سے کروایا۔

یونیورسٹی لیول کے اساتذہ اور سٹوڈنٹس کے درمیان ہونے والی لطیف سی چھیڑ چھاڑ اور جملہ بازی والے ماحول کے درمیان بالآخر میں نے انہیں رضامند کر ہی لیا۔

ہاتھ دیکھنے، پرنٹ لینے اور اس کے نتائج کو ایک طرف کچپنے کہ اس خوبصورت سلسلے سے اس کا تعلق بس اتنا سا ہے کہ ان ملاقاتوں کے بعد میں نے انہیں اخبار خوانین کے لئے انٹرویو بھی کر لیا۔ انٹرویو میں ایک صاحب علم شخصیت میرے سامنے آئی تھی۔ جنہوں نے ٹیگور کی شاعری کے کئی اور نمایاں پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں پہلی چیز شاعری کا بے ساختہ پن ہے۔ آنکھ سے نکلنے والے کسی بے اختیار و بے تاب آنسو کی طرح، ہونٹوں پر اپنے آپ ہی بکھر جانے والی کسی مسکراہٹ کی طرح۔ ٹیگور کی شاعری، ان کے گیت، سریلے اور نغمہ بار ہیں، اپنے آپ میں مکمل، ان کی شخصیت کے عکاس، فکر و نظر میں آزاد۔

ٹیگور کی ذات مذہب، فرقہ بندی قوم و ملت کی بندشوں کو توڑتی ہے۔ انسان کو انسان سے جوڑنے کی ترغیب دیتی ہے کہ ٹیگور نے انسان میں انسانیت کے خدا کو دیکھا ہے۔ اسی لیے وہ اس کی توہین برداشت نہیں کرتا۔

ذرا غور کرو شاعر کے اس انداز پر۔

جب میں روشنی کی سنہری باتیں سنتا ہوں

میں محسوس کرتا ہوں

آسمانی فضا کا دل محبت سے بھر گیا ہے

تب میں اس جہان کے ہر ذرے میں

آگہی اور عرفان کا پیغام محسوس کرتا ہوں
 جب گیت کے اندر سے میں دنیا کو دیکھتا ہوں
 تب میں اُسے پہچانتا ہوں
 تب اُسے سمجھتا ہوں

ان کے یہاں کوئی مخصوص نظریہ یا نمایاں فلسفہ حیات نہیں ملتا۔ مذہب، ٹیگور کا تعلق
 برہموسماج سے تھا۔ یہ فرقہ صرف بنگال میں ہے۔ بنگال کی بیشتر عظیم ادبی و سیاسی شخصیات کا
 تعلق اسی طبقے سے تھا۔ برہموسماج صرف وحدانیت خداوندی کا قائل ہے۔ ٹیگور کی فنکارانہ
 زندگی کے تحت اشعار میں یہ تصور ہمیشہ قائم رہا کہ اُن کا مرکز مسرت بس تخلیق ہی ہے۔ وہ ہر
 ممکن طریقے سے اسی کا اظہار کریں۔

ایک بار انہوں نے کہا کہ میں اُن سب لوگوں سے جو مجھے مسند پر بٹھانا چاہتے
 ہیں کہتا ہوں کہ مجھے نیچے زمین پر ہی بیٹھنے دیں۔ وہ جو کھیل کے قواعد و ضوابط طے کرتا ہے
 اُس نے میرے لئے کوئی بڑا آمد برا نہ سا کردار نہیں چنا۔ میری زندگی کا رس جو قدرت نے
 مجھے بخشا ہے وہ اسی مٹی، اسی دھرتی اور اسی گھاس پر ہی ٹھہرنا چاہیے۔ وہ سب لوگ وہ جو
 دھرتی پر پہلا قدم اٹھاتے ہیں اور پھر اسی کی کود میں چلے جاتے ہیں۔ میں اُن کا دوست
 ہوں۔ میں شاعر ہوں۔ میں کوی ہوں۔

اُن کے ہاں مسائل حیات کے تعمیری پہلو، تہذیب نفس، کردار کی پاکیزگی، حق
 کوئی و جیا کی کیلئے ایک دائمی پکار ملتی ہے۔ اس کیلئے وہ اپنے ساتھیوں کو آواز دیتے ہیں۔ کوئی
 نہیں ملتا تو کہتے ہیں۔

جب تیری پکار پر کوئی نہ تیرا ساتھ دے
 تنہا ہی چل تو اکیلا ہی چل

گیتا نجلی زیادہ زیر بحث رہی۔ بہت زیادہ پڑھی گئی۔ انگریزی ترجمے نے دنیا میں گھمادی۔ نوبل انعام یافتہ ٹھہری۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ایک شاہکار ہے۔ مگر میرے نزدیک "بلا کا" اس سے بھی بڑا مجموعہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گیتا نجلی کے نیچے دب سی گئی اور یوں ابھر کر سامنے نہ آئی جیسے اُسے آنا چاہیے تھا۔

یہ شعری مجموعہ محبت، انسان، خدا اور انسانیت کے گرد گھومتا ہے۔ ٹیگور نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ دشمنوں کو دشمن اور برہمہ کو برہمنوں کے چنگل سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ مسیحیت کو سمجھو۔ اسلام کا مطالعہ کرو۔ محبت لافانی ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ہونی چاہیے۔

شبم سے بھیگا ہوا صبح کا یہ منظر کیسا حسین ہے
درخت سورج کی کرنوں میں جھلما سے رہے ہیں

اسی لئے میں سمجھتا ہوں

یہ دنیا عالم خیال کے بے کراں سمندر

کی موجوں پر مچتا ہوا ایک کنول ہے

میں سمجھتا ہوں

میں اسی کا پیغام ہوں

میں اس کے گیت کی تان ہوں

میں زندگی میں روح زندگی ہوں

میں ظلمت کے سینے کو چاک کر کے نکلنے والے اُسی

رقصاں نور کی درخشاں کرن ہوں

میرے لئے یہ امر بھی کچھ تعجب انگیز سا تھا کہ ابوسعید چوہدری اقبال، حافظ اور

مولانا رومی سے بھی بڑے متاثر تھے۔ اقبال کو ٹیگور کے پہلے کا شاعر مانتے تھے۔ ان کی گفتگو میں دو تین بار ٹیگور کا ان تین بڑی شخصیات کے ساتھ موازنہ بھی سامنے آیا۔ ٹیگور کے عاشق الیکس آرنسن کے بارے باتوں نے میرے اوپر فکر و آگہی کے نئے دروازے کھولے۔ آرنسن ایک بے چین، مضطرب، علم کی پیاسی روح، تلاش حق کے لئے بھٹکتی کبھی جرمنی کبھی فرانس ٹیگور کے ناول Home and the world سے متاثر شائقِ ملکیتن آ پہنچی تھی جہاں انہوں نے انگریزی ادب پر حاکمانہ شروع کیا تھا۔ یہاں آرنسن کی ایک تحریر ٹیگور کی شخصیت کے ایک اور پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری ملاقات جب بھی ٹیگور سے ہوتی۔ مجمع میں یا تنہائی میں، وہ باتیں کر رہے ہوں یا خاموش ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بنیادی طور پر وہ ایک تنہا آدمی ہیں جو اپنے خیالوں میں غرق رہتا ہے۔ گیتوں کو گانے والا۔ خوابوں کا بننے والا۔ وہ مجمع کے لئے کوئی پیغام رسان نہیں ہے۔ جس کی آس میں مجمع اکٹھا ہوتا تھا۔

کیسا شاعر تھا جسے رکشہ چلانے والا اور پتھر کو مٹنے والا اگر گاتا تھا تو وہیں حکمرانوں کی آنکھوں کا بھی تارہ تھا۔ دلی کی سیاحت کے دوران اندرا گاندھی میموریل کو دیکھنے گئی تو ان کی سٹڈی میں جو نظم موجود تھی وہ ٹیگور کی ہی تھی۔

جہاں ذہن میں ڈراور خوف نہ ہو

جہاں انسان سر بلند ہو کر شیپماں علم کا حصول ہر خاص و عام کے لئے ہو

جہاں یہ ہماری دنیا ٹکڑوں میں بٹ کر تقسیم نہ ہو



کرونیترن ابی سکارا اور سنیل آریپارتن سنہالی اور تامل زبانوں کے خوبصورت اور ہر دل عزیز شاعر

- کرو شاعری نہیں۔ بہترین گلوکار، بہترین آناؤنسر، ڈیڈیٹیر، میوزک کمپوزر، کرکٹ کمنٹریٹر، ڈرامہ اور سنواری رائٹر کے طور پر بھی بہت کامیاب تھا۔
- سمنیل آرمیارتھن کو فطرت نے نغمہ نگاری کے ساتھ ساتھ دھن سازی کی بھی اعلیٰ خوبی سے نوازا تھا۔
- روی، سسپلا کورے اور چین فکری اور انقلابی سوچ کی جہ سے بہت مقبول ہیں۔

ہماری زندگی میں خوشی اور مسرت ہی نہیں
 غم، دکھ اور مصائب بھی بہت ہیں
 کہیں یہ ہمارے ماحول سے جڑے ہیں
 کہیں یہ لنکا کی روایات سے جڑے ہیں
 کہیں اُس ماحول سے جس میں ہم بڑھے پلے ہیں
 لیکن کیا ہمیں ان سے فرار ہے
 یا کہیں ان سے کچھ بہتر ہے
 شاید ہا ایک گیت
 جو ہمیں ہماری پرانی یادوں میں لے جائے
 پس تو آہیں انہی خیالوں میں کھو جائیں
 اکیلے گیت گاتے یا کہیں دوستوں کے ساتھ
 باہر اونچے اونچے گاتے

کرو نیرتن ابی سکارا

شومنی قسمت جانے کون سی گھڑی تھی جب کہیں ہم سے اپنے لکھاری ہونے کی ڈینگ ماری گئی۔ مسٹر جسٹمن تو شعر و شاعری کا شوقین بندہ تھا۔ یوں بھی بڑا محب وطن تھا۔ اب انہوں نے کیا سنہالی، کیا تامل شاعروں کے کہیں شوخ و چنچل، کہیں غم انگیز اور کہیں درد بھری شاعری اور گیت سُنوا سُنوا کر ایک طرف اگر ہمیں قدرت کی اس فیاضی کے اعتراف کو ایک بار پھر دہرانے اور سُرانے کا موقع فراہم کیا کہ ملک چھوٹے ہوں یا بڑے۔ جگہیں بہت ترقی یافتہ ہوں یا کم تر، لوگ دیہاتی ہوں یا پڑھ لکھے، قدرت اپنے ہونے کا ایک اظہار انہیں تخلیقی قوتیں دے کر کرتی ہے۔ اور ایسی ایسی خیال آفرینیاں سامنے آتی ہیں کہ بندہ حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے تو دوسری طرف ایک اجنبی زبان کے گیت اور شاعر سُنوا سُنوا کر ہماری مت مار دی۔

کبھی کبھی جب ہم بوریت محسوس کرتے۔ تب دو ایک بار کہا بھی کہ جناب ہمیں

اردو کے وہ پرانے گیت سُنو ادیس جنہیں ریڈیو سیلون سے سُنتے ہمارا بچپن گزرا تھا۔ مگر انہوں نے ہماری درخواست کو رتی برابر اہمیت نہ دی۔ اپنے ملک کی محبت میں ڈوبے، اپنے شاعروں کا دم بھرتے سری لنکا کا یہ چہرہ ہمیں دکھاتے رہے۔

یوں سچی بات ہے میں تو خود کرونیترن ابی سکارا Karunaratne، Ravi Sathasivam، سسلا، سنبیل، Aboysekera، روی سلتموم، Ariyaratne اور جین آہ۔ سنیام جیسے بے مثال شاعروں کے جن کی شاعری، آواز اور دیگر صلاحیتیں اتنی زیادہ اور ایسی بے پایاں تھیں کہ بے اختیار انہیں سراہنے اور اپنے اُردو دان لوگوں سے ملانے کو جی چاہتا تھا۔

ان سب کے ہاں فکر کی جو گہرائی نظر آتی تھی وہ بہت متاثر کن تھی۔ کچھ ایسا ہی حال بقیہ شاعروں کا تھا۔

تاہم کرو شاعر ہی نہیں تھا۔ بہترین گلوکار، بہترین آناؤنسر، ڈی۔ جی۔ ٹی۔، میوزک کمپوزر، کرکٹ کمنٹیٹر، ڈرامہ اور ستوری رائٹر کے طور پر بھی بہت کامیاب تھا۔ زمانوں اپنی شاعری، گلوکاری، کمپوزنگ اور کرکٹ کمنٹری جیسی صلاحیتوں کے ساتھ، سری لنکا کی ادبی اور ثقافتی زندگی کے آسمان کا روشن ستارہ بنا رہا کہ جس کی دھوم ملک میں ہی نہیں ہندوستان تک میں بھی رہی۔

1930 کے لگ بھگ جنوبی سری لنکا کے ایک چھوٹے سے گاؤں رتمالی Ratmale میں پیدا ہونے والا کرو اپنے ساتھ بے شمار میدانوں میں مہارت رکھنے کے گنوں کا وصف لے کر پیدا ہوا تھا۔

شاعری کب شروع کی اور گیت گانے کا آغاز کب سے ہوا؟ اور لکھاری کب بنا؟ وہ تو خود لاعلم رہا کہ یہ سب کیسے اسکی ذات میں داخل ہو کر اپنے آپ کا اظہار کرنے لگے

تھے۔ تاہم ان سب کاموں کا آغاز یکے بعد دیگرے ہو گیا تھا کہ ہر ایک میں وہ ایک کے بعد ایک اپنے جھنڈے گاڑتا گیا۔

اُس کے اندر ایک خدا داد شاعر تھا۔ اس کا علم محض نو سال کی عمر میں اُس وقت ہوا جب وہ اپنے والدین کے ساتھ کینڈی میں پیراہرا (Perahera) (بدھا کا مقدس دانت دکھانے کی سالانہ تقریب) میں گیا۔ ہاتھی کے ہودے میں بیٹھ کر اُس نے ترنم سے بدھالارڈ کے حضور منظوم کلام گا کر پیش کیا۔ اس کی آواز کا ترنم اور شاعری سبھوں نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ اتنا چھوٹا سا بچہ ایسا جاندار کلام اور ایسی موہ لینے والی آواز۔ تقریب بطور شاعر اور گلوکار اُس کا ابتدائی تعارف تھا۔

کرو کی سکینڈری تعلیم کولمبو میں ہوئی۔ حد درجہ مودب اور فرماہم دارشاگرد۔ چھوٹی سی جگہ سے ایک بڑے شہر میں آ کر اُسے ایڈجسٹ ہونے میں ذرا وقت نہیں ہوئی۔ کالج کے تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا تو اپنے اشعار بیچ میں شامل کرتا اور تقریر کے دوران سامعین کو بتاتا کہ یہ اشعار اس کے اپنے تخلیق کردہ ہیں۔

اُس کی شاعری میں اداسی، دکھ اور غم کا عنصر کم عمری سے ہی تھا۔

وہ مذہباً بدھ تھا۔ نرم خو، نرم مزاج اور نرم دل رکھنے والا۔ ہونہار ہمدرد کے چپکنے چپکنے پات کی صداق اُس کی شہرت نے لوگوں کی توجہ کھینچ لی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اُسے ریڈیو سیلون پر بچوں کا پروگرام کرنے کی پیشکش ہوئی۔ وہ اس عمارت میں داخل ہوا تھا جس نے آنے والے وقتوں میں اس کے اوپر شہرت، عزت، دولت سبھی دروازے کھول دیئے تھے۔

2000 سے زیادہ گیتوں اور شاعری کا خالق۔ جس میں تنوع تھا۔ موضوعات

کے اعتبار سے انفرادیت تھی۔

ایک خدا داد صلاحیت رکھنے والا شاعر کم عمری سے نئی جدتوں کے ساتھ میدان میں

اُترنے والا شاعر، نغمہ نگار، بڑا ڈکشنر خاص طور پر کرکٹ کی کمٹری اور اس فیلڈ میں نئی نئی اصطلاحیں ایجاد کرنے والا بن گیا تھا۔ سنہالی زبان کو اُس نے کرکٹ کمٹری کرتے ہوئے جس طرح وسعت اور مانوسیت دی وہ اس کا بڑا کارنامہ ہے۔ نئے الفاظ، نئے انداز، بولتے ہیں زبان سے حرکات کا بھرپور تاثر، آسٹریلیا، انڈیا، ساؤتھ افریقہ، انگلینڈ اور پاکستان کے ساتھ میچوں میں ہمیشہ لوگوں کی خواہش اُسے سننے اور دیکھنے کی ہوتی۔ ڈائلاگ، رائٹنگ اور ڈرامے لکھنے میں بھی اُسے کمال حاصل تھا۔ نغمہ نگار تو تھا۔ کمپوزنگ بھی کرنے لگا۔ تب اس میں بھی بڑا نام پیدا کیا اور بہترین کمپوزر مشہور ہوا۔

ذرا دیکھیے اُس کی شاعری کا ایک نمونہ۔

ہماری زندگی میں خوشی اور مسرت ہی نہیں

غم، دکھ اور مصائب بھی بہت ہیں

کہیں یہ ہمارے ماحول سے جڑے ہیں

کہیں یہ لنکا کی روایات سے جڑے ہیں

کہیں اُس ماحول سے جس میں ہم بڑھے پلے ہیں

لیکن کیا ہمیں ان سے فرار ہے

یا کہیں ان سے کچھ بہتر ہے

شاید وہ ایک گیت

جو ہمیں ہماری پرانی یادوں میں لے جائے

پس تو آہیں انہی خیالوں میں کھوجائیں

اکیلے گیت گاتے یا کہیں دوستوں کے ساتھ

باہر اونچے اونچے گاتے

اناؤں سمیت شروع کی تو آسمیں اپنی صلاحیتوں سے وہ اضافے کیلئے کہ سری لنکن لوگوں کو کہنا پڑا کیسا فنکار انسان ہے؟ ہمارے دلدار پرویز بھٹی کی طرح کا کہ بات سے بات نکالتا، مزاح پیدا کرتا بات بھی بڑی معنی خیز ہوتی۔

ایک عوامی شاعر جس کے گیت ہر روز گائے جاتے ہیں۔ سُنے جاتے ہیں۔ دکانوں پر، شاہراؤں پر، بٹی آوازوں میں ڈب کر کے سننے رنگ و آہنگ کے سامان کے ساتھ وہ آج بھی اتنا ہی ہر دلعزیز ہے جتنا ماضی میں تھا۔ بوڑھے، جوانوں کو آج بھی اس کے گیت ترپاتے ہیں۔

سری لنکا کی حکومت نے کولمبو کی ایک اہم شاہراہ اس کے نام پر کی ہے۔ بے شمار تمغات اور انعامات سے اُسے نوازا گیا ہے۔ مگر اس کا سب سے بڑا انعام اس کی شاعری اور آواز ہے۔ زندہ رہنے والی جو ہمیشہ نہ صرف اپنے لوگوں کو بلکہ دور دیس کے لوگوں کو بھی کہیں نہ کہیں اُداس کرتی ہے اور کوئی میرے جیسی اُس پر چند لفظ لکھنے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔

روی سائوم بھی کمال کا شاعر ہے۔ سری لنکا اس کی زندگی ہے۔ اپنی بیوی تارہ اور بچوں سنجے اور سریش سے بھی زیادہ محبوب۔ کمال کا شاعر۔

Sicila Gooray سسیلا گورے جدید شاعری کی بے مثال شاعرہ ہے۔ کالج میں پڑھاتی ہے۔ سوچ میں بڑی انقلابی، عملی زندگی میں روایتی، شوہر اور بچی کی ممنون کہ ان کی حوصلہ افزائی نے اُسے شاعری پر آمادہ کیا۔ اپنے بارے میں کہتی ہے کہ موڈی ہوں۔ اُس وقت لکھتی ہوں جب تحریک پیدا ہوتی ہے۔

سینیل کوفطرت نے نغمہ سازی کے ساتھ ساتھ دھن سازی کی وہ خوبی عنایت کی ہے کہ اُس نے سری لنکا کے فلمی گانوں پر زمانوں کے چھائے ہوئے نامل اثر کو ختم کرتے

ہوئے سنہالی کلچر میں ڈوبی ہوئی دھنوں کو فروغ دیتے ہوئے سنہالی موسیقی کی اہمیت کو بڑھا دیا۔

مسٹر جشٹن کینڈی کی انگریزی زبان کی شاعرہ جین آرسنیا گم Arasanaygam کی شاعری کے بھی بہت مداح تھے۔ جس وقت ہم کینڈی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے محبت اور سرشاری میں ڈوبے لہجے میں کہا تھا۔

”کینڈی میری محبوب شاعرہ کا شہر ہے۔ یہاں وہ پیدا ہوئی۔ کیا شاعری ہے اس کی۔ ایک مصور کی طرح وہ چہرے، آوازیں، فضا، ثقافتی رنگ، ڈھنگ، دکھ، حادثات، سماجی اور سیاسی تنازعات کو کس کمال فنکاری سے لفظوں میں پینٹ کرتی ہے۔

وہ ڈچ برگر کلاس سے تعلق رکھنے والی ہے۔ جس کے آبا کی کسی دلکش عورت کو ایک ڈچ افسر نے پسند کیا اور بیاہ کر لیا تھا۔ جین نے خود ایک تامل سے شادی کی۔ مگر قدامت پرست روایتی گھرانہ جنہیں وہ قبول ہی نہیں تھی۔ دو بیٹیوں کی ماں جس کی زندگی کو اجیرن بنا دیا گیا۔

ذرا سنیے۔

کسی نے دروازے کو توڑ دیا تھا

اور جیسے مجھے آزاد کر دیا

کہ میں دنیا میں گھوموں پھروں

آزاد اپنی ذات کے خول سے باہر آزاد

1983 میں جب تامل اقلیت اور سنہالی اکثریت میں خون ریز جھڑپیں ہو رہی

تھیں۔ وہ بھی اس زد میں آئی اور گھر سے بے گھر اس کا مقدّر بھی بنی۔ مہاجر کمپ میں

ڈر خوف، گھر بدری کا ڈکھ، اپنی پہچان اور شناخت کا گم ہو جانا یہ سب وہ احساسات تھے
جنہوں نے اس کی شاعری کو درد سے بھر دیا۔ اس کی اسی زمانے کی شاعری پر میٹنل ایور ڈیا
گیا۔



سعدی یوسف

عراق کا مایہ ناز انقلابی شاعر

- سعدی یوسف کی شاعری عراق کی سیاسی و آمرانہ چٹائی اور عالمی طاقتوں کے
مکارانہ اور جاہلانہ رویوں کی بے باکی سے عکاسی کرتی ہے۔
- میں دنیا کا شہری ہوں مگر میری اپنی کوئی سر زمین نہیں۔
- ہمیں کاغذ دے دو کہ ہم تقسیم لکھیں جو تمہارے (امریکہ کے) چہرے کو داغ دار
کریں۔
- ہم اہل عراق جو اس دھرتی کی تاریخ کے وارث ہیں۔ ہمیں اپنی بانس کی معمولی
چھت پر فخر ہے۔

وہ ملک جو ہمارا تھا
 وہ ختم ہو گیا
 اپنی پیدائش سے پہلے ہی
 وہ ملک جسے ہم پسند نہیں کرتے
 اس کا دعویٰ ہے
 کہ خون ابھی بھی ہماری رگوں میں باقی ہے
 یہ عراق اب قبرستان کے کناروں پر ہی پہنچے گا
 یہ اپنے بیٹوں کی قبروں سے ملک بھر دے گا
 نسلوں کے بعد
 نسلیں
 شاید اپنے جاہد حکمران کو معاف کر دیں
 مگر یہ وہ عراق تو نہیں ہوگا
 کہ جس کا نام کبھی عراق تھا

سعدی یوسف

سعدی یوسف سے میرا بھرپور تعارف کروانے میں ایک کردار قدیم بغداد کے اُن قہوہ کیفوں میں منعقدہ ادبی محفلوں اور شاعروں کا بھی ہے جو میرے لاہور کی ہی طرح ادبی بیٹھکوں، گھروں اور کیفوں میں ادبی نشستوں اور مشاعروں کی صورت بنے اور پرانے شعرا کے اوپر بحث و مباحثے کیلئے اور کبھی اُن کا کلام اور مفہوم سمجھنے کیلئے منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

بغداد میں میری بھی چند شا میں اسی سرگرمی کی نذر ہوئیں۔ بلا سے مجھے سمجھ نہ آتی مگر میرا فیکسی ڈرائیور انگریزی میں مجھے بتاتا اور سمجھاتا۔ بہت ساری مدد انگریزی جاننے والے ادیبوں نے بھی کی۔

مگر ہاں رُکیے ذرا۔ چند اہم یادیں بھی یادداشتوں کی گٹھڑی سے باہر نکل آئی ہیں۔ واقعات کے تناظر میں اگر دیکھوں تو کہہ لیجیے کہ یہی پہلی پہلی ملاقات تھی اور تب ہوئی تھی جب ذہنی بلوغت ابھی غیر ملکی کلاسیکل اور جدید ادب کی رنگا رنگیوں کی دنیا میں داخلے سے گھبراتی تھی۔ ماحول اور ناموں کی نامانوسیت ہی مطالعے کے تسلسل میں روڑے اٹکاتی

تھی۔ میری توجہ اور یکسوئی بہت جلد اس کی نئی نئی جہتوں کے کشادہ میدانوں میں گھومنے پھرنے اور لطف اٹھانے سے اُکتا جاتی تھی۔

یہ بیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی کے درمیانی سال تھے۔ اور میں کچے کچے پکے سے دو ماہ لکھ چکی تھی۔

یہی وہ دن تھے جب میرا وہ رشتے کا ماموں ہم سے ملنے آیا۔ میں نے شوق و اشتیاق کی بلند یوں سے اس بے حد دلچسپ کردار کو دیکھا تھا جو کبھی کبھار گھر کی بزرگ عورتوں کا موضوع بنا رہتا تھا، جو بڑے شاعرانہ سے مزاج کا آوارہ گرد اور من موجی سا بندہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اپنی مرضی سے فوج میں بھرتی ہو کر مصر کے محاذ پر جا پہنچا۔ مدتوں تو کچھ پتہ ہی نہ چلا تھا کہ زندوں میں بھی ہے یا مارا گیا۔

درمیان میں ہوا کے کسی معطر جھونکے کی مانند آیا اور بس اپنی باتوں کی خوشبو کہیں مصر، کہیں شام اور کہیں عراق کے حوالوں سے ادھر ادھر بکھیر کر چلا گیا۔ چاہتے ہوئے بھی میں نے کچھ زیادہ باتیں نہ کیں کہ تہی دامنی کا احساس تھا۔ یوں میری بڑی آئینہ دل شخصیت تھی۔ رشتہ سے سوچتی۔

”ہائے کتنا خوش قسمت ہے۔ کسی پنچھی، کسی پکھیر، کسی بنجارے کی طرح زندگی گزارنے والا۔ گھومنے پھرنے کے جراثیم تو میرے اندر بھی بڑی وافر مقدار میں تھے۔ پھر کچھ سالوں کے بعد اُن کی مستقل واپسی کا سُن کر میں خود اُنہیں ملنے لگی۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے میری دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔ سعدی یوسف سے میرا پہلا کچھ گیلا، کچھ سوکھا تعارف اُنہی کے توسط سے ہوا۔

چھوٹے ہی جو بات زبان سے نکلی وہ تھی کہ سیرنا اتنا پیارا انسان کہ جتنا جھوٹ بول لو۔ ہاں صورت کا بھی بڑا وجہ یہ ہے۔ شاعر بھی کمال کا، اپنے نظریات میں پختا بھی بڑا اور

جیالا، جی دار بھی انتہا کا۔ پھر بہت سی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بیان ہونے لگیں۔ جانا کہ
 Without an alphabet. Without a face
 اُن کی منتخب نظموں کا مجموعہ ہے۔ اسی میں سے ایک نظم انہوں نے پڑھی۔

بہت سادہ گزرا تو معلوم ہوا

ابن تیمیہ

جیلوں کے تاریک چنگیل کا نگران بن گیا ہے

اور وہ الموافق

غلاموں کی بغاوت کچلنے میں مصروف ہے

دمشق کی پولیس

عراقی پولیس

عرب امریکی پولیس

ایرانی اور عثمانی پولیس

ہم پر کتنا ظلم کرتی ہے

ہمارے معصوم اور بے ضرر سے لوگ

اُن کی خطا

تو آؤ وہ کریں جو کرنے کو

ہمارا دل چاہے

ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جانتی ہو نظم میں یہ دو حوالے ابن تیمیہ اور

الموافق کون ہیں؟

کوپلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ میں پڑھنے کی شوقین اب دنیا

کے ادب کو پڑھنے اور اس سے لطف اٹھانے لگی تھی اور خود کو خیر سے خاصی عالم فاضل چیز سمجھتے ہوئے پُر اعتماد بھی تھی۔ مگر اُن کے سوال پر قیہ ہو گئی تھی۔ ہنستے ہوئے انہوں نے بتایا۔ ابن تیمیہ حنبلی فقہ کا ایک بڑا پیروکار تھا۔ امام حنبل چاروں فقہی اماموں میں سے سب سے زیادہ سخت اور مقتصد نظریات کے حامل تھے۔ اور الموفق خلیفہ المتوکل کا بیٹا جو بڑا ہی ظالم اور جامد سپہ سالار تھا۔ جس نے جنوبی عراق کے دلدلی علاقوں جو آہواز Al-Ahwaz ضلع کے قصبات تھے میں زنجی قبائل کے غلام لوگوں کی بغاوت کو بڑی سختی سے کچلا تھا۔ یہ زمانہ کوئی نویں صدی کا اختتامی تھی۔ یعنی 869 سے 881 تک کا وقت۔

اور وہ سعدی یوسف کیا بات ہے اُس جوان کی۔

میں نے محسوس کیا تھا میرے رشید ماموں کے اندر سے جیسے محبت کے سوتے اُبل پڑے ہوں۔

”اس کے اندر تو کویا کوئی پارہ بھرا ہوا ہے۔ چھوٹی سی عمر سے ہی شاعری، سیاست اور سامراجی رویوں کی مخالفت اس نے اپنا نصب العین بنالیا ہے۔“

اب خلیفہ اور سیدون سٹریٹ کے قہوہ خانوں میں ان انقلابی شاعروں کی میٹھک کی جو تفصیلات تھیں انہوں نے تو مجھ جیسی سیلانی عورت کے اندر طوفان اٹھا دیئے۔

میرے اشتیاق بھرے سوالات کی ماموں سے ایک لام ڈورتھی کہ وہ بھی وہاں جلیا کرتے تھے۔

”ارے وہ سب میرے لہنگو ڈھیرے یا رتھے۔ سعدی یوسف تو میرا بڑا دلارا سا دوست ہے۔ میں تو خود عربی میں شاعری کرتا ہوں۔

اب جو منظر کشی کی تفصیل بیان ہوئی اس نے کیا لطف دیا؟ قہوے کی چسکیاں،

سگریٹ کے مرغولے کے دھوئیں میں سعدی یوسف کی شعلہ بارنظم۔ واہ واہ کا سماں ابھی بندھا ہی ہے کہ پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔ اب بغداد کے پرانے محلوں کی پیچ در پیچ گلیوں میں بھاگتے پھرتے۔ کہیں پولیس سے دو دو ہاتھ کرتے۔ کہیں اس کی مار پیٹ کا نشانہ بنتے۔

وہ جمال عبدالناصر کا عاشق تھا۔ ارے وہ کیا ہم تو سبھی اس کے دیوانے تھے۔ پرانے بغداد کی گلیوں میں بھاگتے تو اس کے نام کے نعروں سے گلی کو چپے کوخٹھتے۔ وہ ہمارا محبوب جو تھا۔ سعدی حکام کی نظروں میں بہت کٹھنہ کھنسنے لگا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھی کیا شے تھے۔ بھاگتے پھرتے کبھی دمشق، کبھی قاہرہ۔

عراق جمہوریہ بنا۔ پر کہاں استقامت تھی اس ملک کے مقدر میں؟ عبدالکریم قاسمی کا زمانہ، بغاوتوں سازشوں کے وار کیمنسٹ پارٹی میں شامل دھواں دھار تقریریں کرتے اور لوگوں کو اُکساتے۔ شاعر نوجوانوں کا کام انقلابی نظمیں پڑھنا اور چھپتے بھاگتے پھرنا تھا۔ وہ بہت چھوٹی عمر سے ہی سامراجی رویوں کا مخالف اور ترقی پسند نظریات کا پیروکار ہو کر سیاست کی وادی پُر خار میں الجھ گیا تھا۔

عراق داخلی کشمکش کا خونین انداز میں اظہار کر رہا تھا۔ صدام بائیں بازو کے ترقی پسندوں کا بیچ مار دینا چاہتا تھا۔ ترقی پسند بھی سرکشی اور بغاوت کی انتہاؤں پر پہنچے ہوئے تھے۔ عراق کے شاعروں اور ادیبوں نے جھکنے اور منہا ہمت کے الفاظ اپنی لغت سے خارج کر دیئے تھے۔ اقتدار پر قابض ہونے کے بعد صدام کا فیصلہ تھا کہ وہ وہ بائیں بازو کی قیادت کا خاتمہ کر دے گا۔

سعدی یوسف تو بڑی انقلابی نظمیں لکھ رہا تھا وہ راستہ کیسے بدل سکتا تھا؟ بغداد کو خیر باد کہا۔ اور پھر اُسے دوبارہ بغداد اور لیرہ آنا نصیب نہ ہوا۔ اپنے بارے میں اُس نے ایک بار لکھا تھا کہ میں دنیا کا شہری ہوں مگر میری کوئی سر زمین نہیں۔

پھر ان کا لہجہ افسردگی کی تہوں میں جیسے دھنس گیا تھا جب انہوں نے کہا۔
 سعدی تو اب بیروت میں ہے۔ وہ بغداد سے عراق سے چلا گیا۔ اس کے ساتھی
 کچھ بھاگ گئے اور کچھ مارے گئے۔ اچھا ہوا وہ بھی چلا گیا نہ جاتا تو صدام کے ہاتھوں
 مارا جاتا۔

انہوں نے اُن کی ایک اور نظم گنگنائی۔ یہ عربی میں تھی جس کا مطلب انہوں نے
 سمجھایا۔ عنوان تھا۔ ”پرندے کی آخری پرواز“

اگر تم چاہتے ہو

تو یاد رکھو

کہ میرے پر پانی میں ہیں

پر کہیں لہروں کے بغیر پانی ہوتا ہے

اور ساحل کے بغیر لہریں کب ہوتی ہیں

میں یہاں آرام کرتا ہوں

مطمئن سا

خوش و ہر مسما

میں آخری ساحل پر پہنچ چکا ہوں

چلاؤ نہیں

میری تو سانسوں کی آواز بھی مجھ تک نہیں پہنچتی

وہ دن میرے چند خوبصورت دنوں میں سے ایک تھا کہ میرے سامنے میری

خوابوں کی دنیا کے کچھ منظر آئے تھے۔ شام اور بغداد میرے خوابوں کی سرزمین ہی تو تھی۔

سعدی یوسف وقت کی تیز رفتاری، غم روزگار کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو کر

یادوں کے اُس صندوقے میں بند ہو گیا تھا۔ جو کبھی کبھی ہی کھلتا ہے۔

سالوں کے بعد ایک جھٹکے سے گھسلا۔ یہ تو بے کی دہائی کا آغاز تھا۔ ایک خاتون دو چھوٹی بچیوں کے ساتھ میرے اسکول آفس میں داخل ہوئی۔ تعارف نے بتایا کہ چھٹی قامت کو چھوٹی خاتون کویت پر صدام کے حملے سے متاثر لوگوں کی طرح بھاگی ہے۔ خود وہ سکھ، شوہر پاکستانی۔ جائے پناہ سُسرال تھی جو اعوان ٹاؤن میں ہی رہائش پذیر تھی۔ وہ اپنی دو بچیوں کے داخلے کے لیے آئی تھی۔

ایک کرہناک داستان سُننے کو ملی تھی۔ بستے رستے خوش و مزم لوگ کیسے اچانک گھر بار چھوڑ کر بھاگے۔ پناہ گزینی کا دکھ جیسے پور پور سے عیاں ہوتا تھا۔

زہرت الظہر خاتون نے اپنا اسلامی نام بھی بتایا تھا کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے جنہیں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد صاف کرتی۔ کویت کے محکمہ صحت میں اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں اچھی ملازمت پر تھی۔ عربی پر بہت عبور تھا۔ انگریزی میں شاعری بھی کرتی تھی۔

اُس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک مشرق وسطیٰ کی سیاست کے اس اُتار چڑھاؤ کے پیچ و خم میں الجھی رہی۔ ماموں رشید یاد آئے تھے۔ عراق کی سیاست پر اُن کی باتیں اور تجزیے یاد آئے تھے۔ بڑے دو ٹوک لہجے میں انہوں نے کہا تھا۔

”دیکھنا صدام ایک دن کویت پر قبضہ کر لے گا۔ کویت کی ایک آزاد خود مختار ملک کے طور پر موجودگی عراق کے کسی بھی حکمران سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ کویت تو سو فیصد عراقی شہر بصرے کا حصہ ہے۔ ہر عراقی کی یہی سوچ ہے۔ دراصل کویت تو ان بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں بنا۔ کویتی شیخوں کی دولت سے برطانیہ کے بینک کالے ہوئے پڑے ہیں۔ ایک دن کوئی نہ کوئی دھماکہ ضرور ہوگا دیکھ لیتا۔

اور وہ دھماکہ تو ہو گیا تھا۔

زہرت کے لیے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ خود مختار عورت روایتی سرال کی سختیوں،
 زمیوں کے مزے چکھ رہی تھی۔ کچھ وقت بعد کوہیت کو آزاد کرالیا گیا۔ زہرت کا شوہر چلا
 گیا اور وہ انتظار میں دن کاٹنے لگی کہ کب وہ اُسے آنے کا اذن دے۔ ایک طویل انتظار بعد
 اس کے اس دکھ بھرے دورانیے کا وقت تمام ہوا اور وہ واپس جانے کے لیے بچیوں کے
 سرٹیفیکیٹ لینے آئی۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ایک کیسٹ دی یہ بتاتے ہوئے کہ یہ عراق کے
 ایک بڑے انقلابی شاعر کا کلام ہے جو صدام کے خوف سے جلاوطن ہے۔ اس کے کلام کی یہ
 کیسٹ اظہر کے ایک گہرے عربی دوست نے دی تھی جو اس شاعر کا بڑا عاشق ہے۔ اظہر
 اسے پھینک دینا چاہتا تھا مگر اتفاقاً وہ ان کے سامان میں آ گئی۔ میں اسے آپ کو دینے کے
 لیے لے آئی ہوں۔ سچی بات ہے ہمیں تو عراق سے رتی برابر ہمدردی نہیں۔

اور یہ جلاوطن شاعر سعدی یوسف تھا۔ اور یہ اس کی شہرہ آفاق نظم ”امریکہ امریکہ“

تھی۔

خدا امریکہ کو محفوظ رکھے

میرا گھر، میری جنت

جینز، جاز، غزانوں کے جزیرے

جان سلور کے طوطے اور نیو اورلینز New or Leans کی بالکونیاں

اُن سے بے پایاں محبت مجھے بھی ہے

مارک ٹوئن، مسیسیپی Mississippi کی دفانی کشتیوں

ابراہم لنکن کے کتوں اور درجینا تمباکو

اُن سے بڑا ہی پیارا ہے مجھے

لیکن میں امریکی نہیں

ہینڈم Phantom پائلٹ کے لیے اتنا ہی کافی ہے
 کہ دھکیل دے پتھر کے زمانوں میں مجھے
 تیل کی ضرورت نہیں، نہ ہی امریکہ کی
 نہ ہاتھیوں اور نہ ہی گھوڑے گدھوں کی
 پائلٹ! میرے گھاس پھوس کی چھت والے گھر
 چوبی پل اور مجھ سمیت سب کو چھوڑ دو
 تمہارے کولڈن گیٹ اور تمہاری فلک بوس عمارتیں
 اُن کی ضرورت کب ہے مجھے
 اپنا گاؤں چاہیے، تمہارا نیویارک نہیں
 تم مسلح سپاہی اپنے نوید اصحرا سے کیوں آئے
 تم لوگ اتنی دور سے لصرہ کیا کرنے آئے
 ہمارے گھر دروازوں پر مچھلیاں تیرتی ہیں
 یہاں سورچارے کی تلاش میں نہیں پھرتے ہیں
 میری بید کی چھڑی، جھونپڑی اور ڈوری کاٹنا
 چھوڑو سب اور چھوڑو مجھے بھی
 اپنے سمگل شدہ سگرٹ لے لو
 ہمارے آلو ہمیں واپس کر دو
 اپنی مشنری کی کتابیں لے لو
 اور اپنے کاغذ ہمیں دے دو
 کہ ہم تمہیں بدنام کرنے کے لیے نظمیں لکھیں

اپنے جھنڈے کی پٹیاں لے لو
 اور ہمیں ستارے دے دو
 افغان مجاہدین کی داڑھیاں لے لو
 اور ہمیں والٹ وٹ مین کی
 تتلیوں سے بھری داڑھی دے دو
 صدام حسین کو لے لو
 اور ہمیں ابراہم لنکن دے دو
 اُسے نہیں دینا چاہتے
 تو پھر کچھ بھی نہ دو
 امریکہ ہم پر غالی تو نہیں
 اور

تمہارے سپاہی کوئی خدائی خدمتگار نہیں
 ہم غریب ہیں مگر ہماری
 دھرتی غرقاب دیوتاؤں کی ہے
 مڈر سائڈ دیوتاؤں کی
 آگ دیوتاؤں کی
 غم کے دیوتاؤں کی
 جو خون اور مٹی کے ملاپ سے
 نئے تخلیق کرتے ہیں
 ہم غریب ہیں

ہمارا خدا بھی غریبوں کا خدا ہے

یہ نظم نمائندہ تھی اُن مظلوم، لاچار اور بے بس عراقی لوگوں کے جذبات و احساسات کی۔ جن پر امریکہ اور اس کی لوٹڑی اقوام متحدہ نے زندگی کی بنیادی سہولتوں کی کھلی فراہمی پر پابندیاں لگا دی تھیں۔

یہ بہت لمبی نظم تھی۔ میں تو دم بخود تھی۔ ساکت تھی۔ شاعر کی جی داری اور حیرت رندانہ پر حیران تھی۔ امریکہ تو پھیلتی پھیلتی ہو کے فضا میں بکھرا پڑا تھا۔ شاعر نے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔ اپنے دل و جگر کا سارا درد باہر انڈیل دیا تھا۔ قاری کو آنسو بہانے پر نہیں اُسے بھی اسی درد میں مبتلا کر دیا تھا۔

اور یہی وہ شناسائیاں تھیں۔ دل میں اُترنے کی کاوشیں جنہیں میرے دل و دماغ کے ایک ایک خلیے نے محبت بھری پذیرائی دے کر اُس کی میزبانی قبول کی تھی۔

پھر ایک تعلق استوار ہو گیا۔ محبت کا، پیار اور احترام کا۔ جلا وطنی کا کرب کو یا ذاتی کرب سا محسوس ہوتا تھا۔ ایک بار کسی ادبی پرچے میں ایک نظم پڑھنے کو ملی۔ اُسے پڑھ کر لطف اٹھایا۔ محبت کی تجدید ہوئی اور اُسے میں نے کسی اٹا شے کی طرح سنبھال بھی لی۔ آپ بھی ذرا لطف اٹھائیں۔ "عورت" کے عنوان سے لکھی ہوئی یہ نظم جذبات کی کیسی عکاس ہے۔

اس کی یادوں سے میں خود کو کیسے نکالوں گا

میں اُسے کس زمین پر دیکھوں گا

اور کس شہر کی کس گلی میں

کیا میں کسی سے اُس کے بارے پوچھوں گا

اور اگر

کہیں مجھے اُس کا گھر مل جائے

کیا میں اطلاعی گھنٹی بجاؤں گا

کون ہے؟

میں کیا جواب دوں گا

اس کا چہرہ میں کیسے دیکھوں گا

اس کی انگلیوں کے درمیان سے

رستے ہوئے واؤن جیسے لطیف سرور سے سرشار

کیسے اُسے جیلو کہوں گا

اور کیسے اُن سب سالوں کا

دکھ برداشت کروں گا

ایک بار

بیس سال پہلے

ایک انٹرنیشنل گاڑی میں

میں نے اُسے رات بھر چومنا تھا

بہتے وقت کا دھارا بھی کیسا ظالم ہے بہتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک دن فرخ

سہیل کوئندی اور اس کی لبنانی بیوی ریمہ کوئندی سے ملاقات ہوئی۔ فرخ سے میرا ممتا بھرا

رشتہ ہے۔ ریمہ کے پاس سعدی یوسف کی منتخب نظموں کا مجموعہ without an

alphabt, without a face انگریزی میں ترجمہ شدہ دیکھی تو ایک دن کے وعدہ پر

لی اور اس کے کچھ حصے فوٹو کاپی کر دئے۔

تعارف میں بھی کچھ کردار اس کتاب نے اور کچھ ماموں رشید کی باتوں نے ادا

کیا۔

عرب دنیا کا چنیدہ اور جدید لہجے میں بات کرنے والا شاعر جس نے کبھی خود کو بڑا نہیں سمجھا ہمیشہ ہی نزار قبانی کی شاعرانہ عظمت کا مداح رہا۔ 1934 میں بصرے کے قریب ابوالخصیب نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں بصرے سے حاصل کی۔ عربی میں ڈگری بغداد یونیورسٹی سے لی۔ شاعری تو چھوٹی عمر سے شروع ہو گئی۔ آزاد نثر میں اظہار خیال جوئی نو جوان نسل کی ایک اپنی اختراع تھی اور جس نے مرجعہ روایاتی شاعری کو پیچھے دھکیل کر عربی شاعری میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا آغاز کیا تھا۔ سعدی نے بہت جلد اپنی انفرادیت قائم کر لی تھی۔

وہ ایک شاعر ہی نہیں تھا۔ بہت اچھا نثر نگار بھی تھا۔ جرنلسٹ رہا۔ پبلیشر بنا اور سیاسی کارکن کے طور پر بھی کام کیا۔ عراق ہمیشہ سے اپنے آپ پر نازاں ملک رہا ہے۔ عرب دنیا کے مشہور شہروں کے بارے میں ایک روایت ہے۔ Cairo writes, Beirut publishes and Baghdad reads۔ اور واقعی بغداد اس پر پورا اترتا ہے۔ پڑھنے کا شوقین، کتابوں کا شیدائی اور یہی احساس فخر اس کے شاعروں، ادیبوں اور آرٹسٹوں میں نظر آتا ہے۔ آغاز میں سعدی بدرشا کرالیاب اور عبدالوہاب البیہی کی آزاد شاعری سے متاثر ہوا پھر آہستہ ان کے اثر سے نکلتا گیا۔

سعدی یوسف اُس ماڈرن عراقی شاعری کا ایک حصہ بنا جو اس وقت جماعت jam'a at al Ruwwad کے نام سے جانی جاتی تھی۔

سعدی یوسف کی شاعری اپنے ملک کی کہانی کو ناقابل یقین حد تک سچائی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ یہ شاعری اپنا تعلق قدیم میسوپوٹیمیا کی تہذیبی زندگی سے جوڑتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ اور عراق کے جدید نظریات سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اُسے اس

سرزمین پر پھیلی ہوئی غربت، شخصی حکومت اور جنگیں پریشان کرتی ہیں۔ یہاں اُس کی دو ایسی نظمیں ہیں پہلی ”ماپوسی“ اور دوسری ”وژن“ کہ جنہوں نے مجھے افسردہ نہیں حد درجہ ملول کیا۔ ان نظموں میں دلی جذبات نے جس انداز میں نوحہ گری کی وہ رلاتی ہے۔

وہ ملک جو ہمارا تھا

وہ ختم ہو گیا

اپنی پیدائش سے پہلے ہی

وہ ملک جسے ہم پسند نہیں کرتے

اس کا دعویٰ ہے

کہ خون ابھی بھی ہماری رکوں میں باقی ہے

یہ عراق اب قبرستان کے کناروں پر ہی پہنچے گا

یہ اپنے بیٹوں کی قبروں سے ملک بھر دے گا

نسلوں کے بعد

نسلیں

شاید اپنے جاہر حکمران کو معاف کر دیں

مگر یہ وہ عراق تو نہیں ہوگا

کہ جس کا نام کبھی عراق تھا

پھر وہ ہوا جو طاقت اور تکبر کے نشے میں مست قومیں ہمیشہ سے کرتی چلی آئی

ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے عراق پر حملہ کر دیا تھا۔

میرے شب و روز اس بربریت اور المناک سانحے پر ماتم کناں تھے۔ تو ایسے

میں رونے کیلئے کاندھا تو ہمدرد کا ہی ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے ماموں رشید کے پاس بھاگی

تھی۔ وہ لاہور میں تھے پر اُن کا دل جیسے بغداد کے گلی کوچوں میں بھٹکتا تھا۔ سعدی یوسف سے چند دن پہلے اُن کی بات ہوئی تھی وہ لندن کے مضافات اوکسمرج میں رہ رہے تھے۔ ہم نے کوئی ایک گھنٹہ بات کی اس کی قلبی کیفیات کا اظہار اس کے ضبط کے باوجود اس کے لب و لہجے سے چھلک چھلک پڑتا تھا۔

وہ جو امن کا بھوکا تھا۔ اپنے وطن کے لیے کسی مضطرب روح کی طرح تڑپتا تھا۔ ان قیامت خیز لمحوں میں کسی اسیر پرندے کی مانند پھڑکتا تھا۔ صدام کے تو خیر وہ روز اول سے ہی مخالف تھا۔ مگر اس سانحے کی تو اُسے امید ہی نہیں تھی۔ کیسے یاس بھرے لہجے میں کہتا تھا۔

”ہم تو انہیں نکال کر بہت خوش تھے۔ ہم احمق تو جانتے ہی نہ تھے کہ وہ تو گھات لگائے بیٹھے تھے کہ کب پھر موقع ملے اور ہمارے اوپر چڑھ دوڑیں۔“

ٹی وی پر تباہی کے مناظر اور نیشنل میوزیم کی مہربادی پر اس کی دل گرفتگی شدید تھی صدام کے انجام سے وہ اگرچہ بہت خوش تھا مگر معصوم عرقیوں کی تباہی پر دکھی اور غمگین تھا۔ سامراجیوں کی اجارہ داری پر، اینگلو امریکی سیاست دانوں کے جھوٹ اور دھوکے پر مبنی بیانات اور مغربی میڈیا کی جھوٹی رپوٹوں کے پلندوں پر مشتعل بھی بہت تھا۔ اُسے دکھ بھرے جذبات کی اس منجھدھار سے نکالنے کے لیے میں نے اُس کے سامنے امید کی شمع جلائی اور کہا۔

”سعدی تم کڑھنے اور لکھنے کے سوا کیا کر سکتے ہو؟ یہ سوچو یہ صورت عراق کے لیے بہتر بھی ہو سکتی ہے۔ تم انشاء اللہ وطن جاؤ گے۔ بصرہ جاؤ گے۔“

وہ ہنسا۔ میں نے محسوس کیا تھا۔ اس کی ہنسی بڑی مصنوعی اور کھوکھلی سی ہے۔ تاہم میں نے یہ بھی جانا کہ انسان کتنا ہی بڑا دانشور، کتنا ہی بڑا لکھنے والا کیوں نہ بن جائے کہیں وہ

کچھ سراب امیدوں کے سہارے بھی ڈھونڈتا ہے۔

”دیکھو نا۔ ماموں نے میری طرف دیکھا تھا۔ یہ کیسی بد قسمتی ہے کہ آپ اپنے وطن نہ جاسکیں۔ صدی کا چوتھائی حصہ یعنی پورے پچیس سال ہوتے ہیں وہ عراق نہیں گیا۔ اس نے بغداد نہیں دیکھا۔ وہ بصرہ نہیں گیا۔ بصرہ جہاں اس نے جنم لیا، جہاں اس کا بچپن گزرا، جہاں اس کا خاندان ہے، جہاں اس کی ماں جیسی بڑی بہنیں اس کی راہ نکلتی ہیں۔ اس کا گہرا دوست الجواری بھی ابھی تک دمشق میں ہی ہے۔

ہاں ماموں نے جب یہ کہا کہ اب جب صدام اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے تو اس کی واپسی کا امکان بھی بڑا روشن ہے۔

چلو میں نے تھوڑی سی خوشی محسوس کی۔

میں سالوں تک یہ نہ جان سکی کہ انہیں اپنے وطن جانا نصیب ہوا یا نہیں۔ میرے رشید ماموں فوت ہو گئے تھے۔ اگست 2003 میں اُن پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ اور سچی بات ہے میری زندگی اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا کی تفسیر بنی ہوئی تھی۔ ستم ہائے روزگار نے ذرا سی فراغت دی تو دل عراق جانے کے لئے مچلنے لگا۔

سعدی یوسف کے وطن عراق۔ اپنے خوابوں کے شہر بغداد کو دیکھنے کی کتنی آرزو تھی۔ معلوم نہیں خالموں نے اُس کا کیا حشر کیا تھا۔

انہی دنوں 2006 کے لگ بھگ جب میں بغداد کے کیلئے کسی ساتھی خاتون کی تلاش میں تھی۔ پاکستان کے خوبصورت شاعر شہزاد نبیر نے مجھے طارق علی کی کتاب Bush in Babylon پر ہنسنے کو دی۔ کتاب کے مطالعہ نے مجھے بتایا کہ شاعر تو اپنے وطن جا ہی نہیں سکا کہ نئے آقاؤں کے گماشتوں نے اُسے بین کروا دیا تھا۔

لندن میں اپنے گھر میں بیٹھے جب وہ ٹی وی پر لندن کے ہی ایک ہوٹل میں عراقی

غداروں اور عراقی سامراجی پٹھوں کوئی کورنگ باڈی میں مینگ کرتے دیکھتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ اُن کے تصور میں ایک ایسی وہ منظر ابھرتا ہے جو اُن کے بصرہ اور اس کے مضافات میں گرمیوں کی راتوں میں کھلے آسمان تلے سوتے معصوم دیہاتیوں کی نیند خراب کرنے گیڈروں کے ریوڑ آتے تھے۔ یہ کچھ غل غپاڑہ مچاتے، کچھ لڑتے جھگڑتے، کچھ جاگنے والے کسی دیہاتی سے اینٹ روڑا کھاتے تھے۔ تو یہ منظر بھی بعینہ ویسا ہی تھا۔ وہ اپنے گہرے دوست مظفر انواب کو مخاطب کرتے ہیں۔

او مظفر انواب! میرے عزیز دوست۔

”اس گیڈروں کی بارات کا کیا کریں۔“

تمہیں یاد ہیں وہ پرانے دن

شام کی لطیف سی ٹھنڈک میں

بانس کی چھت تلے روئی سے بھرے تکیوں سے ٹیک لگائے

قبوے کی چسکیاں

دوستوں کے ہنکھٹے میں

رات کتنی نرمی سے ڈھلتی چلی جاتی ہے

جیسے زبان سے نکلے الفاظ

مٹی سے دھویں کے مرغولے اٹھتے ہیں

تب

لمبی گھاس اور کچھو رکے درختوں کے عقب سے شور آتا ہے

گیڈروں کی بارات

او مظفر انواب

آج کیا گزرا ہوا کل ہے
 سچ یہ ہے کہ ہم ان گیڈروں کی دعوت ولیمہ میں آئے ہیں۔
 ان کا دعوت نامہ پڑھا ہے۔
 آؤ اک معاہدہ کرتے ہیں
 تمہاری جگہ ان سے ملنے میں جاؤں گا
 میں ان گیڈروں کے منہ پرتھوکوں گا
 میں ان فہرستوں پرتھوکوں گا
 میں انہیں بتاؤں گا
 ہم اہل عراق

ہم جو اس دھرتی کی تاریخ کے وارث ہیں
 ہمیں اپنی بانس کی معمولی چھت پر فخر ہے

یہ نظم تو منٹوں میں بغداد اور بصرہ پہنچ گئی تھی۔ عراق کے گاؤں گاؤں
 گھومی۔ سعدی یوسف پر لعن طعن کی بوچھاڑ بدسنے لگی۔ دھمکیاں ملنے لگیں۔ جن دو ہزار افراد
 کی عراق میں داخل نہ ہونے کی لٹیں بنیں اُن میں سعدی یوسف سرفہرست تھا۔ جنرل ٹومی
 فرینکس کے نام سعدی یوسف کا خط بھی بڑا مشہور ہوا۔ شاعر نے بھگو بھگو کر جوتیاں ماریں۔
 اُس کی شاعری کے کوئی تیس 30 کے قریب مجموعے ہیں۔ دو ناول اور پانچ
 کہانیوں کی کتابیں ہیں۔

سعدی یوسف فیض احمد فیض سے نہ صرف بیروت میں مل چکے تھے بلکہ اُن کا وہ
 سارا کلام جو انگریزی میں ترجمہ ہو چکا تھا بھی پڑھ بیٹھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فیض کے بہت
 مداح تھے۔

یہ 2008 ہے اور میں الف لیلی کے بغداد میں ہوں۔ میرا خوابوں کا شہر کتنی بار اجڑا اور کتنی بار بسا۔ یہ میرے پسندیدہ شاعر سعدی یوسف کا بغداد ہے جسے یہاں سے جا کر واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ یہ میرے ماموں رشید کا بغداد ہے۔ اس کے گلی کوچوں میں کہیں ان کے قدموں کے نشان، اس کی ہواؤں میں کہیں ان کی آواز کی بازگشت مجھے سنائی دیتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کی قدامت اور عظمت کے وہ گن گاتے تھے۔

میری یہ کیسی خوش قسمتی کہ مجھے افلاق جیسا بیدبسا اور پیارا بچہ ڈرائیور کی صورت میں ملا۔ جس نے میری للک دیکھ کر مجھے اس کا چپہ چپہ دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ بغداد ابھی بھی حالت جنگ میں ہے۔ امریکی ابھی بھی ہر اہم جگہ پر جٹ چھا ڈالے بیٹھے ہیں۔ بہر حال معمولات زندگی اسی انداز میں رواں دواں ہیں۔ راتیں جوان اور دجلہ کی رونقیں تاباں ہیں۔ زندگی یقیناً اسی کا نام ہے۔

میں پرانے بغداد کے اُن کیفوں، قبوہ خانوں اور ادبی کافی ہاؤسوں میں جانے کے لیے مری جا رہی ہوں۔ ایک تو میرا ماموں رشید ان جگہوں پر جاتا تھا دوسرا میرے اُس شاعر کی جوانی کا عروج انہی جگہوں پر جبر کے تپیدارے کھاتے گزرا تھا۔ مجھے مُنتَدرِل زیدی سے بھی ملنے جانا تھا۔ وہی دلبر بچہ پش کے منہ پر جوتا مارنے والا۔

افلاق نے مجھے شہداء برج پر مستنصریہ مدرسہ کی ملحقہ مسجدِ آصفہ میں اُتارا۔ بالعموم میں بغداد کی 55 ڈگری پر پہنچی ہوئی گرم ترین دوپہر کے چند گھنٹے کسی مسجد کے ٹھنڈے خواتین والے حصے میں گزرتی ہوں۔

آج لیٹی ضرور تھی مگر نہ آنکھیں بند ہوئیں اور نہ اعضاء نے آرام کی خواہش کی۔ سوجہ جانتی ہوں۔ ساتھ ہی الہتجائی سٹریٹ ہے نا۔ جہاں کتابوں کی دنیا ہے۔ میں اٹھی اور باہر نکل آئی۔

داخلہ آسمان کو چھوتی محراب سے ہوا۔ کہیں کہیں عمارتوں کی بالکونیاں ایک دوسرے سے جھپٹیاں ڈالنے کو بھلتی نظر آتی تھیں۔

عراقی روشن خیال قوم ہے۔ اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے پر ماز کرنا جانتی ہے۔ انہیں باعزت اور قابل فخر مقام دیتی ہے۔ ماضی کے متنازعہ شاعر ابو نواس ہو، المہتمابی ہو بغداد کے کوچہ بازار میں عظمتوں کے تاج پہنے کھڑے ہیں۔ بلا سے کوئی مرد تھا یا بیغبری کا دعوے دار۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوفے میں 915 ہجری میں پیدا ہونے والا المہتمابی اپنی شاعری میں پختہ کار تھا۔ قصیدہ کوئی میں کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین سو نظمیں اس کی داستان زندگی کی بہت سی پرتوں کو کھولتی ہیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی، بذلہ منجی اور کلام کی طاقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔

”میں وہ ہوں جس کے لکھے ہوئے کو اندھا بھی پڑھ سکتا ہے۔ میری شاعری جادوئی اثر رکھتی ہے۔ جسے بہرہ بھی سن سکتا ہے۔ جو کام تلوار اور تیر کرتے ہیں۔ میرا کاغذ، قلم اور حرف اُس سے زیادہ موثر ہیں۔“

المہتمابی بازار اسی شاعر کی یاد میں ہے۔

میں کتابوں کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ یہ کتابوں کا جہان تھا۔ یہاں کتابوں کی دنیا آباد تھی۔ صاف ستھرے فرشوں پر بکھری ہوئیں، تھڑوں پر دھڑوں کی صورت پڑی ہوئیں، تختوں پر بچھی ہوئیں۔ برآمدوں کے ستونوں سے لگائے عارضی چوبی شیلٹوں میں دھری اور بڑی دڑی دوکانوں کی شیشے کی الماریوں میں بچی ہوئیں۔

شاند امروں کے پرے کہیں انہیں پھر دلتے، کہیں انہیں پڑھتے، کہیں بھاؤ تاؤ کرتے نظر آئے تھے۔ کتنی دیر میں نے بھی انہیں دیکھا لیکن وہ زیادہ عربی میں تھیں۔ فریج

میں تھیں جو میرے لیے بیکار تھیں۔ انگریزی میں جو چند دیکھیں وہ ایسی نہ تھیں کہ میں انہیں جھپٹ کر دبوچتی۔

میں چلتے چلی جاتی تھی۔ برآمدوں کے سایوں میں اور یہ بھی دیکھتی تھی کہ کہیں کہیں اس کے وجود کے کسی چھوٹے سے حصے پر، کہیں بڑے پر جیسے برص کے سے داغ ہیں۔ جلنے سڑنے کے، ٹوٹے پھوٹے ہونے کے، شکستگی کے، مڑھالی کے۔ ایسا کیوں ہے؟ ہانپن میں یہ داغ دھبے کیوں؟ رُک کر پوچھا تو جانا کہ کوئی ڈیڑھ سال قبل بم بلاسٹ ہوا تھا۔ جاہلوں نے علم کے اس مرکز کو تباہ کر دیا۔

لیکن پوری دنیا میں بکھرے عراقیوں کے پیغامات نے اس کے اندر نئی روح پھونک کر اسے کھڑا کر دیا تھا۔ صفحے جو جلے تھے پھر سے زندہ ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں سج گئے۔ المہتابی کی رونقیں لوٹ آئیں۔

میری اس خواہش پر کہ کیا وہ مجھے کسی ایسے بندے سے ملا سکتا ہے جس سے میں عراقی ادب کے حوالے سے کچھ باتیں کر سکوں۔

”ضرور ضرور“ بڑا پر جوش سا لہجہ تھا۔

”آئیے“ وہ مجھے ساتھ لیے چلنے لگا۔ کوئی چوتھائی فرانگ پر ایک بہت بڑی دوکان کے اندر داخل ہوئے۔ اتنی بڑی دوکان تھی کہ میں حیرت سے کنگ اُسے دیکھ چلی جاتی تھی۔ لڑکا مجھے لے کر غربی سمت بڑھا جہاں چند سیڑھیاں اُتر کر ہم ایک تہہ خانے میں اُترے۔ یہ تہہ خانہ کب تھا؟ یہ بغداد کا ادبی چہرہ تھا۔ جہاں چوبلی بیچوں پر دھرے خوبصورت گدے نما کشتوں پر چند لوگ بیٹھے حقے کے کش لگاتے، بحث و مباحثے میں اُلجھے ہوئے دیکھے تھے۔ آٹھ نو کی نفری مادل نگار، صحافی اور شاعروں پر مشتمل جو ولیدال ونداوی، علی جعفر، رسل ال قیسی، رعید جرار، لولوا کاظم۔ جنہوں نے پر جوش انداز میں استقبال کیا،

کھڑے ہوئے عزت دی۔

میں نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ مناسب سہولتوں سے سجا سورا کمرہ جس کی سامنے والی دیوار پر آراستہ بڑی سی تصویر المتنبانی سٹریٹ میں بچے صوفوں پر بیٹھے وزیراعظم نورالماکی کے ساتھ کتب خانہ افرادوس کے مالک کی تھی جو بڑا نمایاں نظر آتا تھا۔ یہ سب مجھے تعارف کے وقت معلوم ہوا تھا۔ تصویر کے متعلق بھی وضاحت ہوئی تھی کہ بم بلاسٹ کے بعد حکومت اور وہ سب جنہیں کتاب سے محبت تھی۔ جنہوں نے گہرے دُکھ اور یاس کا اظہار کیا تھا۔ وہ لفظ کے تقدس اور اس کی حرمت کیلئے حکومت کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوئے۔ فوری کوششوں سے اس کی بحالی ہوئی۔ صرف ڈیڑھ سال میں انہوں نے اس کی رونقیں لوٹا دیں۔ اور تخریب کاروں کو پیغام دیا تھا کہ تمہاری تخریب کاری نے وقتی طور پر حرف جلا ڈالا مگر دیکھو ہم نے انہیں پھر سے زندہ کر دیا ہے۔

گفتگو کے دروازے کھلنے لگے۔ ادب اور آرٹ کے حوالوں سے جب باتیں شروع ہوئیں تو وہ سب گفتگو میں یوں شامل ہوئے کہ قبوے کی چسکیاں تھیں اور باتیں تھیں۔

1950 کا زمانہ ادب اور آرٹ کے لحاظ سے ایک طرح نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ ادب میں مختصر کہانیوں کے رجحان نے زور پکڑا کو ابھی تک مادل بہت کم کم لکھا گیا تھا۔ شاعری میں البتہ نئے رجحان سامنے آرہے تھے۔ اس میں آزاد نظم نے زور پکڑا اور اپنا آپ منوایا تھا۔ بہت سارے ناموں کا ذکر ہوا۔ سعدی یوسف بہر حال بہت بڑا نام تھا۔ میری خواہش پر اس کے نئے مجموعے ”نوعلیا میرا دشمن“ سے رسل ال قیسی نے شط العرب سے دو نظمیں پہلے عربی میں سنائیں۔ پھر اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ تھوڑی سی مدد رعید جرانے کی۔

شط العرب

پہلا خواب

درد و کرب اور دکھ بھری راتوں میں

تکلیہ پانیوں سے گیلا ہو جاتا ہے

اور جیسے یہ کائی کی سی بو دینے لگتا ہے

میری دائیں ہتھیلی کو

چنبیلی کی سبز بٹنی چھوتے ہوئے

جیسے کہتی ہو

جاگ جاؤ

میں دریا ہوں

کیا تم مجھے پیار نہیں کرتے

تم لبصرہ نہیں جانا چاہتے

تکیے کے پردوں پر سوار

دریا اے دریا

میں جاگ گیا ہوں

میرے تکیے پر اک قطرہ پڑا ہے

جو مجھے کائی کی طرح ذائقہ دے رہا ہے

یہ لبصرہ ہے

دوسرا خواب

آسمان مجھ پر سایہ قلمن ہے
 آسمان کے ساتھ چڑیاں بھی سایہ قلمن ہیں
 میرے دادا میرا ہاتھ تھامتے ہیں
 ان کے چہرے پر سرخ کفالیہ کا نگہ ہے
 ذرا فاصلے پر پانی چمکتا ہے
 اور دادا میرا ہاتھ پکڑتے ہیں
 آؤ تیز چلیں اس سے پہلے
 کہ پرندے گھروں کو لوٹ جائیں
 آؤ تیز چلیں
 اس سے پہلے کہ لہریں ہمارے گھونسلے تباہ کر دے
 ایک اور خواب

کوئل ال زین کے ساحلوں پر صبح کیسی خستہ دم سی ہے
 میں آہواز جانے کے لیے دوسرے کنارے کی طرف تیرتا ہوں
 میرے بالوں میں بارش کے موتی
 ستاروں کی مانند چمکتے ہیں
 کھجور کے درخت ارغوانی کلغیوں سے سجے ہیں
 اور کیرون کا پانی مجھے کیسا محسوس ہوتا ہے
 جیسے جیسے
 بصرے کا پانی

سعدی یوسف پر اُن کی آرا کا مختصر اظہار بھی تھا۔ دراصل سعدی کی شاعری پر اس

مختصر سے وقت میں سیر حاصل بحث تو ہو ہی نہیں سکتی۔ رسل ال قیسی نے کہا تھا۔

وہ عرب دنیا کا ایک منتخب نام جس کی زندگی کا ہر اُتار چڑھاؤ، ہر موڑ، ہر تجربہ بقاری کے دل کی دنیا کو زبرد کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ اتنا سارا مال و متاع اس نے عربی زبان اور لوگوں کو تحفے کی صورت دیا۔ ابھی جو وہ نظمیں آپ نے سنی ہیں۔ ان میں مناظر رنگ، بچپن کی یادوں کی خوشبوئیں اور اس کے کرب کا اظہار نمایاں ہے۔

وطن سے جو قدم نکلا تو وہ بارہ یہاں دھرنا نصیب نہ ہوا۔ "نوطلیا میرا دشمن" جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ اس کے اپنے ملک کے لیے محبت اور اپنے لوگوں کی مہربادی پر ماتم کی سی کیفیات کا اظہار ہے۔ لفظ آپ کو کس جہاں میں لے جاتے ہیں۔ جہاں دکھوں کے لیے ہیں۔ جہاں خوبصورتیوں کے چہرے ہیں۔

وہ تاریخ سے مکالمہ بھی کرتا نظر آتا ہے۔ تاہم اس کی نظموں کو سیاسی رنگ نہیں دیا جاسکتا۔ یہ اُس کا وہ اظہار ہے جو اس کے ارد گرد موجود تھا۔ اور جسے اس کی آنکھ نے دیکھا۔ دل نے محسوس کیا اور اس نے اسے زبان دی۔

اگر کہیں امریکی قبضے کا ذکر ہے تو کہیں کسی جھیل میں شام کی گھٹتی سیاہی کا رنگ بھی ملتا ہے۔ کہیں تیلیوں کے رقص، کہیں طوفان، پانی، بے گھر لوگ۔ کہیں مامیدی اور مایوسی کے ہی وطن سے اٹھتی امید کی کوئی سنہری کرن خوش آئند پیغام کی آواز بنتی ہے۔

یہ بڑے پیارے لوگ تھے۔ باتوں کے رسیا، تھوڑے اور کچھ کے دھنی۔ مگر یہ سیاہ تھوڑے کی جب تیسری پیالی میرے سامنے لا کر رکھی گئی میں نے گہرا کراؤ سے دیکھا اور خود سے کہا۔

’اے تو میں نے چھوٹا بھی نہیں۔ سارا حلق کڑواہٹ سے بھر گیا ہے۔ ابھی چینی کی پانچ کیوبز ڈالی تھیں تو یہ حال ہے۔ آفرین ہے ان لوگوں پر جو اسے پانی کی طرح پیتے

ہیں۔“

چچی بات ہے مجھے تو اُنکے نام بھی یاد نہیں رہنے تھے اگر وہ خود اس کا اس درجہ اہتمام نہ کرتے کہ جو بھی گفتگو میں شامل ہوتا وہ ہر بار اپنا نام اور کام دہرانا نہ بھولتا۔ جس کا فائدہ وقت کی کمی کے باوجود مجھے ہوا تھا کہ جب میں نے رات کو ڈائری میں انہیں قلم بند کیا تو وہ سب اپنے ناموں، کاموں، شکلوں اور آوازوں کی انفرادیت کے ساتھ میرے سامنے تھے اور کہیں ابہام نہیں تھا۔

پہلا شارٹ سٹوری رائٹر عبدالملک نوری جس کا مدرسہ فکر و وجہ روایت سے بغاوت تھی۔ مختصر کہانی کے حوالے سے جس نے ادب کا یہ باب کھولا تھا اس کا لب و لہجہ علی جمفر کی نسبت زیادہ صاف، تلفظ زیادہ بہتر اور گفتگو آسانی سے سمجھ آنے والی تھی۔ رعید جبار جو خود بھی کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ وہ عبدالملک نوری کے حوالے سے بات کرتا تھا۔ اس کا بہترین کام نشا و لارض Nashid-al-Ard۔ (دھرتی کا گیت) کی صورت سامنے آیا تھا۔ اس میں سوسائٹی کے پيسے ہوئے طبقوں کی عکاسی تھی۔ دراصل قانون اراضی ایکٹ نے عراقی معاشرے کی لوڈ ٹڈل کلاس کو جس طرح زرعی غلام بنا کر رکھ دیا تھا اور اعلیٰ تعلیم اور مراعات بالائی اور درمیانے طبقے کے لیے مخصوص ہو گئی تھیں۔ اس سے بے چینی، اضطراب اور جوگھٹن پیدا ہوئی، اس کو نوری نے بہت خوبصورتی سے پوٹریٹ کیا۔ The South wind میں صدیوں کے رائج معاشرتی رویوں پر احتجاج تھا۔

اسی طرح فہد ال ٹکرلی Faad-Al-Takarli میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد کی رسوم پر سخت نکتہ چینی کی۔

Safirah Hafiz سفیرہ حافظ نے عورتوں پر ہونے والی سختیوں اور مظالم پر لکھا۔ اس دور میں کمیونسٹ سوچ بھی اثر انداز ہوئی۔ شاعری میں یہ زیادہ کھل کر سامنے

آئی۔ جمیل صدیقی، الزا ہوی، مہدی الجواہری، سعدی یوسف، مظفر انواب یہ سب بائیں بازو کے وہ ترقی پسند شاعر تھے۔ جنہوں نے حقیقتاً ایک عملی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ ان کی شاعری اتنی پراثر تھی کہ پوری عرب دنیا میں یہ شاعری کوچی۔ آزاد نظم کے شاعروں میں ایک بہت بڑا نام نازک الملائیکہ کا بھی ہے۔ جس نے عورتوں کے مسائل، محبت اور عورتوں کی آزادی پر کھل کر جی داری سے لکھا۔

نازک الملائیکہ سے میرا تھوڑا بہت تعارف ضرور تھا مگر رسل ال قیسی اُس کا بہت مداح تھا اتنا کہ بدر سے بھی زیادہ اُسے سراہتا تھا۔

بدر شا کرسیاب کا نام بھی بڑا اہم ہے۔ اس کی شاعری کے بہت سے مرحلے تھے۔ ابتدائی دور اگر رو مانوی تھا تو حقیقت پسند شاعر بن کر اُس نے کمال کی شاعری کی۔ بدر کے ہاں انقلابی ذہنیت تھی۔ انہوں نے شاعری کے مروجہ اصولوں اور ان کی بندشوں سے آزاد ہو کر لکھا اور خوب لکھا۔

بدر اور نازک الملائیکہ پر باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی۔ اسی طرح ال شعیب کے ہاں موضوعات کا تنوع تھا۔ عربوں کے اندر اپنے مستقبل بارے پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب، اُن کی جہالت، سادگی اور انہیں ملنے والے دھوکے اور ان پر مغربی تہذیب کی یلغار۔ شعیب نے ان احساسات کو بہت خوبصورت زبان اور ادائیگی دی۔

اگر یہاں عبدالوہاب الباقی کا ذکر نہ کیا جائے۔ رسل ال قیسی کا لہجہ خاصا جوشیلا تھا تو عراقی شاعری کا باب ادھورا رہے گا۔ سوشلسٹ نظریے کا شاعر جس نے مظلوم اور نچلے طبقے کو بھنجوڑا مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی عرب شناخت پر بھی زور دیا۔

Exile From Exile کا بھی پڑھنے سے تعلق ہے۔ آنکھیں بھیگ جاتی

ہیں اسے پڑھتے ہوئے کہ عربوں کو کیسے در بدر اور دیس بدر دکھایا ہے۔

صوفے کے آخری کونے پر بیٹھے لولوا کاظم بھی اچھا بولنے والے انسان تھے۔ صاحب علم تھے مگر یہودیوں سے بہت متاثر لگتے تھے۔ مجھے تو گمان گزرا تھا کہ شاید یہودی ہیں۔ اور میں نے پوچھ بھی لیا تھا وہ ہنستے ہوئے بولے۔
 ”ہوں تو نہیں مگر متاثر ضرور ہوں۔“

اس دوپہر اور شام کی شکر گزاری کہ سعدی یوسف کے ساتھ میں نے عراق کے اور بھی قابل فخر ادبی چہرے دیکھے۔

دو دن بعد کی ایک شام بغداد کی شہرہ آفاق ال شائبندر کافی شاپ جانا ہوا۔ ال شائبندر کافی شاپ کی کھڑکیوں سے دجلہ لشکارے مارتا تھا۔ دو منزلہ عمارت بالکونیوں اور آہنی چھجے دار شیڈوں کے ساتھ کونے پر کولائی کی صورت پھیلی ہوئی تھی۔

موجودہ ملکی صورت پر تھوڑی سی بات چیت کے بعد یوسف سعدی زیر بحث آگئے۔ علی ایاد کوئی چالیس کے ہیر پھیر میں ایک دلکش شخصیت جس کی انگریزی بڑی شستہ تھی نے بعض پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔

صدام کے زمانے میں اُن کی جلاوطنی خود ساختہ تھی۔ وجہ خوف تھا۔ مارے جانے کا۔ ایک بار نہیں صدام نے کئی بار مظفر النواب اور سعدی کو لکھا۔

”عراق تمہارا منتظر ہے۔ تم لوگ ملک کا بیش قیمت سرمایہ ہو۔ واپس آؤ کہ ملک تمہارے لیے بہت کچھ کرنے کا خواہش مند ہے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اگر آتے تو انہیں اعزازات اور انعامات سے ضرور نوازا جاتا مگر چیونٹی کی طرح مسل بھی دیا جاتا۔ وہ نہیں آئے۔ اچھا ہوا۔ انہوں نے جو لکھا وہ ہم نے ہی نہیں پوری دنیا نے پڑھا۔

پھر انہوں نے بہت سی نظموں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سنائے۔ ”شکر یہ تمہارا

امراء القیس "کیا خوبصورت شہ پارہ نظم تھی۔ پھر "رواگئی" سنی۔

جلدی

سب کمرے بند کر دیئے جائیں گے

آغاز تہ خانے سے ہوگا

ہم ان کے پاس سے گزرتے جائیں گے

ایک کے بعد ایک

حتیٰ کہ ہم بندوقوں تک پہنچ جائیں گے

پھر

انہیں بھی چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں گے

جیسے ہم نے پہلے کمروں کو چھوڑا تھا

اور چلتے جائیں گے

اپنے خون میں تلاش کرتے ہوئے

یا پھر اپنے نقشوں میں

سنے کمروں کے لئے

☆☆☆

ابونواس

عربی ادب کا عظیم کلاسیکل شاعر

- o ہمارے عہد کے مفکر، دانشور، شاعر اور ادیب زیادہ لبرل تھے۔
- o دانٹے کی ڈیوائن کومیڈی دراصل ابوالعلا مہر کی رسالت الغفران سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔
- o نویں صدی کی عرب عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری آج کی عورت کیلئے قابل تقلید ہے۔
- o اپنے وقت کا ایک عظیم کلاسیکل شاعر ابو نواس روڈ پر مجھ سے ہم کلام تھا۔

ایک میں کیا بغداد کے بیشتر شعر اور لکھاری بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عرب دنیا کی اکثریت کا یہی انداز تھا۔ چلو ابن رماندی کو چھوڑو تمہارا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ ولادہ بنت المستنقی کی شاعری کا تو جائزہ لیما تھا۔ تمہیں پتہ چلتا نوں صدی کی عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری کا۔ ابوالعلاء المعری کو پڑھنا تھا۔ اس کے ہاں اگر شہوانیت نہیں مگر مذہب پر تنقید ہے۔ خدا پر ایسی ٹکنت چینی ہے کہ تم جیسے چھوٹے ذہن کے لوگ پل نہ لگائیں اور مرمت اور کافر کے فتوے دائر کر دیں۔ جنت اور جہنم کے پس منظر میں لکھی گئی اس کی مشہور نظم ”رسالت الغفران“ کہ جس سے دانتے نے متاثر ہو کر ڈیوان کا میڈی لکھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے رکا۔ ایک خوبصورت سنہری بالوں اور شیرینی آنکھوں والے بچے نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ہمارے عہد کے مفکر، دانشور، شاعر اور ادیب زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ تم لوگوں کی نسبت زیادہ روشن خیال تھے۔

البواس

بغداد کی رات کے اس پہلے پہر جب میں دجلہ کے پانیوں میں ڈوبی روشنیوں کے عکس، کہیں اُن سے بنتے کھکشاں جیسے راستے، کہیں چمکتے دسکتے چھوٹے چھوٹے کوئلے سے پانیوں میں مستیاں کرتے، کہیں قرمبی ہوٹلوں کی روشنیاں ستاروں جیسے روپ لئے پانیوں میں اُتری ہوئیں، کہیں مئے پئے قہقہے جلتے بجھتے دیکھتی اور ان کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے روپ اور صورتوں کے تحیر میں گم تھی۔

مجھے تو معلوم بھی نہ ہوا تھا کہ کب ایک وجہیہ عراقی بوڑھا میرے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ اُسکا روایتی لباس، اُس کی مخمور آنکھیں، اُسکی سنہری رنگت، اُسکا بانگمین سبھوں نے میری توجہ کھینچ لی تھی۔ میں نے قدرے حیرت اور استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا تھا اور اُس کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہشمند ہوئی۔

یہیُنَا آنکھوں کی زبان اُس نے پڑھ لی تھی۔ گھن گرج سی تھی لہجے میں جب بولا

تھا۔

”میرے نام سے منسوب جدید بغداد کی اس اہم شاہراہ ابونواس پر تم کس ٹھہرے
سے بیٹھی ہو۔ اور تم نے نہ مجھے یاد کیا، نہ خراج تحسین پیش کیا۔ حد ہو گئی ہے دجلہ کے فراق
میں ہی گھل رہی ہو۔“

”اوہو،“ میں مسکرائی تھی اور سمجھ بھی گئی تھی کہ میرا مخاطب کون ہے؟

”کمال ہے جب سے یہاں آ کر بیٹھی ہوں آپ کے ہی خیال میں تو گم ہوں۔“

شاعر کی جوانی، اُس کے دلکش خدو خال، اُس کی شہابی رنگت اور سنہرے بال اگر
تب راہ چلتے لوگوں کو متوجہ کرتے تھے تو بڑھاپا بھی کم شاندار نہ تھا۔ شاہوں جیسا بانگین تھا
اُس میں۔

سچی بات ہے وجاہت تو آنکھوں میں گھب گئی تھی۔ مرعوبیت نے وضاحت بھی
فورائی کرنی شروع کر دی تھی۔

”لو میں نے تو جب عراق آنے کا قصد کیا۔ عراق سے متعلق لٹریچر اور معلومات
کے جھمیلوں میں اُلجھی۔ تم تو اُسی دن سے میرے سامنے آ گئے تھے اور میرے ساتھ رہنے
لگے تھے۔ اور یہ بھی تھا کہ میں ابونواس روڈ پر دجلہ کے کنارے بیٹھ کر تم سے لمبی چوڑی باتیں
کرنا چاہتی تھی مگر یہ افلاق مجھے مچھلی کے چکروں میں ڈالے ہوئے تھا۔ اب تھوڑی سی تفصیل
تم بھی سُن لو تا کہ تمہارا گلہ کچھ دور ہو سکے۔

”مچھلی کھلاتی ہے آپ کو۔“ اُس نے گاڑی ایک جگہ پارک کر دی تھی۔

”مچھلی“ بلڈ پریشر کا بھوت میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

میرے ملاحظہ پر وہ من موہنا سائز کا ہنس پڑا تھا۔

”دجلہ کے کنارے بیٹھ کر مچھلی نہ کھائی تو بغداد آنے کا فائدہ۔ میں ہلکے نمک کے

ساتھ بنانے کا کہوں گا۔“

تو پھر AL MAZGOUF فز ریسٹورنٹ میں آگئے۔ یہ تمہاری ابو نواس روڈ ڈانس کلبوں اور کیسٹو کیلئے بھی بڑی شہرت رکھتی ہے۔

یہاں دجلے کے کنارے کنارے دُور تک چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ عمارتیں، ہوٹل اور صفائی ستھرائی کا معیار تو بس اوسط درجے کا ہی ہے لیکن روشنیوں، دجلہ، گھاس کے لان، درختوں کا پانی میں جھکاؤ، ماحول اور لوگوں کے اُبلتے سیلاب نے انہیں خاص بنا دیئے ہیں۔ اندر باہر طوفان سا برپا ہے اور لگتا ہے جیسے پانیوں کے اوپر ایک جہاں آباد خود میں گم ہے۔

ایک کونے میں شطرنج کھیلی جا رہی ہے تو ذرا آگے تاش کی بازی جھی ہوئی ہے۔ فضا میں کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں۔ بچوں والے لوگ ہیں تو محبتوں اور یاریوں والے بھی بہترے ہیں۔ شیشہ پینے والے کس مزے سے بیٹھے تھے پیتے اور موسیقی پر سر دھنستے ہیں۔ موسیقی بہت اونچی پر دلنوازی ہے۔

عراقی موسیقی میسوپوٹیمیا موسیقی اور عرب موسیقی کا دل کش امتزاج ہے جس پر ایرانی روایتی موسیقی نے بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ یہ افلاق نے مجھے بتایا ہے ابھی۔

یہ عود Oud بج رہا ہے اور یہ شہور عود سٹ Oudist احمد مختار ہے۔

تالاب کے کنارے کھڑا افلاق کچھ بات کرتا ہے۔ میں بھی پاس چلی گئی تھی۔ مچھلیوں کی تو بہار لگی پڑی تھی۔ چھلنی سے تین نو عمر لڑکے گاہکوں کے بتانے پر مچھلیاں پکڑ پکڑ کر اس زور سے فرش پر مارتے تھے کہ بیچار یوں کو شاید سانس لیما بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ چاقو سے پیٹ چاک ہوا۔ گندمند نکلا پھر مچھلیاں لوہے کی سلاخوں میں پرو کر کونے میں بنے لکڑیوں کے آلاؤ کے گرد کھڑی کر دی گئیں۔

اور جولوڑکا شیف کا کام کرتا ہے بڑی شان ہے اُس کی بھی۔ پینٹ قمیش پہنے

اپرن چڑھائے، وجاہت والا جیسے شیف نہ ہو آرٹسٹ ہو۔

”زندگی تو کھانے کیلئے ہے“ جیسے خیال رکھنے والوں کیلئے تو یہ لوگ آرٹسٹ ہی ہیں۔ بیٹھنا میں نے وہاں چاہا تھا ”جہاں تیرا نظارہ درمیان میں“ والی بات ہو بغداد میں دجلہ سے بڑا ”تیرا“ بھلا کون ہو سکتا ہے۔ یوں یقین ماننا تمہارا خیال بھی تو ساتھ ساتھ ہی تھا۔

ہاں یہ بات بھی تمہارے کوش گزار کرنا چاہتی ہوں کہ پاکستان میں جو کچھ تم پر پڑھا وہ ادب کے حوالوں سے تو بہت اہم تھا۔ مگر مجھ جیسی کچھ تنگ نظر، تھوڑی بہت روایات کی اسیر، کچھ ماڑے مولے اخلاقیات کے بندھنوں میں جکڑی عورت کیلئے بظاہر کچھ اتنا پسندیدہ نہ تھا۔ کہیں رسوائے زمانہ نظروں سے گزرا۔ کہیں مذہبی اقدار کا باغی اور کہیں شہوانیت کا مارا ہوا۔ پر اندر کی بات بتاؤں کہ میں نے بھی پھسکے لے لے کر تمہیں پڑھا اور اپنی ادبی سہیلیوں کو بھی تمہارے ہمہ پارے سنائے۔ روشن خیال اور ترقی پسند عورتوں نے تمہیں جی بھر کر سراہا۔

خیر لوڈے تو تمہاری شاعری کا ایک مستقل مزاج حصہ ہیں۔ ایک ایسی نظم جسمیں عقیدے اور مذہب کی بھی جھلک ہے وہاں یہ دیوانگی کفر کی حد تک چلی جاتی ہے۔ پھڑ پھڑ کرتی شاعری آنکھوں کے سامنے مچنے لگی ہے۔

گزشتہ جمعہ کی شب

اچانک میرا کمر آؤ ایک جھوم سے ہوا
ہزاروں لاکھوں لوگ پاگلوں کی مانند
چیختے چلا تے تھے
تو یہ روز جزا تھا

اللہ کے پاس جانے کا

ہمارا وقت آخر

جیسا کہ تمام پیغمبر کہتے ہیں

دنیا کے خاتمے کی علامت

نصب شب کا سورج

یہی ہے وہ

ہم کانپ رہے ہیں

ہمیں اعتراف ہے

میں تو ہنسا تھا اور

میں نے کہا

ارے یہ کب سورج ہے

جو ستارے کی طرح طلوع ہوا ہے

بھئی

یہ تو میرا دوست احمد ہے

جس کی موجودگی

اور جس کے بلوری قدموں کے نشان

مچھلی چھپر کھٹ کو روشن کرتے ہیں

جس کے ماتھے پر ستارہ چمکتا ہے

جس کے گالوں پر وینس پھوٹتی ہے

دیر تک میں اس نظم کے حصار میں قید رہی تھی تمہاری علمیت کی داد نہ دینا کتنی

زیادتی کی بات ہوتی میں نے بے اختیار داد دی تھی۔ تمہیں سراہا تھا۔ رومنوں کی پیار و محبت کی دیوی وینس مجھے بھی بڑی پسند تھی۔

تمہاری ایک اور نظم میں پڑھتی ہوں۔ کہنا چاہتی ہوں۔ ابونواس تمہاری اس نظم کو پڑھتے ہوئے میرے اندر کے شیطان نے اگر پکسکہ لیا تھا تو خیر کے تربیت یافتہ پہلو نے فطرت کی خلاف ورزی پر احتجاج بھی کیا تھا۔

آماجی پر مائل لڑکے سے مجھے پیار ہے
ایک خوبصورت، پروقار، خطرناک، غزال
جس کی پیشانی نقاب میں چھپے چاند جیسی
کونکے جیسے سیاہ اور بادلوں جیسے گھنے بال
جو اپنے زیر جامے میں کابلی سے پلسے مارتا ہے
نہ زبورات کا کوئی مطالبہ
اور نہ ہی پرفیوم کے لئے کوئی تقاضا
نہ کبھی چیتھڑوں سے کپڑوں میں نظر آتا ہے
اور نہ ہی کبھی حاملہ ہوتا ہے

ایک شام جب میں تمہاری ایسی ہی نظمیں پڑھتے ہوئے جہاں تم نرم و نازک لطیف سے جذبات پر بستے بستے گندگی کی پاتال میں اتر جاتے تھے۔ میں نے بے اختیار ہی اُس وقت ہاتھوں میں پکڑے نظموں کے پلندے کو دراز میں گھسیڑ دیا تھا کہ میرا بڑا بیٹا غضنفر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ عالمی ادب کے قدیم و جدید شعرا اور ادیبوں سے شناسا اپنے اس بیٹے سے میں نے تم پر بات نہیں کی تھی۔ مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔ تم خود بھی تو سوچو نا۔ اب تم جب کہتے ہو

لوگو! آؤ سیدھے میری طرف
میں عیش و عشرت کی ایک کان ہوں
مجھے کھو دو

پرانی مدہوش کرنے والی شراب
خانقاہوں میں راہب ہی تیار کرتے ہیں
شیش کباب، بھنے ہوئے مرغ
کھاؤ، پیو اور موج میلہ کرو
اور بعد ازاں

تم میرے ٹول کو
شمپو کرنے کیلئے آ سکتے ہو

اور پھر ایسے ہی ایک دن میں نے زچ آ کر انہیں بیخ دیا اور خود کو لعن و طعن کرتے
ہوئے اپنے اندر کو ڈپٹا۔

”بہت ہو گیا۔ بہت ہو گیا علموں بی بی بس کراب۔ تھوڑی دیر کیلئے اس موضوع
سے ہٹ کر اس کی شاعری کی اور خوبصورت پر تئیں دیکھ۔ لوہڑے بازی پر ہی تیری سوئی
انک گئی ہے۔

”ابو نواس“

میں نے گُرسی کی اگلی ناگلوں پر زور ڈالتے اور پچھلی کو اٹھاتے ہوئے خود کو اس کے
قریب کیا۔

”مجھے یقیناً اپنی خوش قسمتی پر رشک آ رہا ہے کہ آٹھویں صدی کے وسط اور آخری
دہائی کا عربی کلاسیکل شاعری کے ایک بہت بڑے نام کا حامل شاعر ابو نواس نے مجھے شرف

ملاقات بخشا ہے اور میرے پاس آکر بیٹھا ہے۔“

”ابونواس“

میں کچھ جھجھکی تھی۔

”کہو۔ جو کہنا چاہتی ہو۔ تم ایک دہنگ بندے کے سامنے بیٹھی ہو۔“

”ابونواس میں گنہگاری کچی کچی مسلمان عورت تمہاری شاعری کا جو رتہ پھر دیتی تھی وہی مجھے مایوس سا کرتا تھا۔ ابونواس میں جاہلی سی مجدد سے ذہنی افتق کی مالک تمہاری شراب اور شراب نوشی، لوہڑے بازی، ہتھکڑیاں اور خدا سے محول بازی کو اس طرح ہضم نہ کر سکی جیسے شاید باقی لوگ کرتے ہوں گے۔ اب میں بھی کیا کروں تم خمریات (K h a m r i y y a t) (شراب نوشی) مدھتقارات (M u d h a k k a r a t) (لوہڑے بازی) اور مجبیات (Mujuniyyat) (کفر بکنے والا) کے چکروں سے ہی نہیں نکلتے تھے۔

شاعری کا سارا تانا بانا تو ان ہی موضوعات کے گرد دھنچے رہے۔“

”بس تو اتنا سا علم لے کر بیٹھی ہو۔“

ابونواس نے اپنے انگوٹھے اور انگشت شہادت کو مضبوطی سے ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے درمیان میں معمولی سے خلا کا راستہ بھی بند کرتے ہوئے گہرے ٹھٹھے سے کہا۔

”ایک میں کیا بغداد کے بیشتر شاعر اور لکھاری بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عرب دنیا کی اکثریت کا یہی انداز تھا۔ چلو ابن روانہ کی کوچھوڑو تمہارا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔

ولادہ بنت المستنقی کی شاعری کا تو جائزہ لیتا تھا۔ تمہیں پتہ چلتا نویں صدی کی عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری کا۔ ابوالعلاء المعری کو پڑھنا تھا۔ اس کے ہاں اگر

شہوانیت نہیں مگر مذہب پر تنقید ہے۔ خدا پر ایسی نکتہ چینی ہے کہ تم جیسے چھوٹے ذہن کے لوگ ہل نہ لگائیں اور مُرد اور کافر کے فتوے دائر کر دیں۔ جنت اور جہنم کے پس منظر میں لکھی گئی اُس کی مشہور نظم ”رسالت الغفران“ کہ جس سے دانستے نے متاثر ہو کر ڈیوائن کامیڈی لکھی۔

وہ چند لمحوں کے لئے رکا۔ ایک خوبصورت سنہری بالوں اور شیرینی آنکھوں والے بچے نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ہمارے عہد کے مفکر، دانشور، شاعر اور ادیب زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ تم لوگوں کی نسبت زیادہ روشن خیال تھے۔

وہ تمہارے محبوب فارسی کے شعرِ اُحمرِ حیا م اور حافظ جن کی شاعری پر تم جیسے لوگ سر دھنتے ہیں۔ میرے ہی تو جانشین ہیں۔ میری روایات کے امین ہیں وہ۔ یونانی اور رومی شاعروں کو پرہو۔ دنیا کے فلاسفروں اور دانشوروں کا مطالعہ کرو۔ انکے کام بھی میرے جیسے ہی تھے۔

چچی بات ہے اگر یہ طعنہ نہ بھی ملتا تب بھی مجھے اپنے سطحی سے علم کا بخوبی احساس تھا۔ میرے ہاں دعویٰ تو سرے سے ہی نہیں تھا۔ دعویٰ تو سر اسر جہالت ہے۔

میں نے اپنے ان جذبات کا اظہار بڑے نرم اور شائستگی و متانت میں ڈوبے لہجے اور انداز میں کیا۔ تھوڑا سا زور اس بات پر بھی دیا کہ شاعری کی بہت ساری اصناف میں شاعر کس میں زیادہ گہرائی کے ساتھ سامنے آیا ہے اسے پرکھنا تو یقیناً نقادوں کا کام ہے۔ عام قاری تو لطف کیلئے پڑھتا ہے۔

تاہم تاریخ میں درج یہ سچائی اور حقیقت بہت کھل کر سامنے آئی ہے کہ تمہارے علم کی وسعت بے پایاں، تمہارا حافظہ قوی اور یادداشت غیر معمولی تھی۔ تمہارے عہد کے

نقادوں کی رائے بشمول ابو حاتم اللمکی

”کہ ابونواس کے ہاں عمیق گہرائی اور سطحی پن دونوں ہیں۔ ابونواس اگر خود اس کا اظہار نہ کرے تو بسا اوقات سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

یوں تمہاری جی داری اور حوصلے کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ ابو العتہیہ جیسا صوفی خدا پرست شاعر مقابلے پر ہوا اور مذہبی لوگوں کی جماعتیں بھی تمہارا تیا پانچہ کرنے پر تلی رہتی ہوں تب بھی تم کہتے تھے۔

سرور ملتا ہے مجھے

اُن کاموں کے کرنے سے

جنہیں روکتی ہے مقدس کتاب

میں گریز پا ہوں اُن سے

جن کی اجازت دیتی ہے الہامی کتاب

بغداد کے کوچہ بازار میں اگر ابو العتہیہ کا صوفیانہ کلام کو نہجتا تھا

کھا سوکھی روٹی کا ٹکڑا

پی ٹھنڈے پانی کا پیالہ

تنہا بیٹھ اور غور کر

مقصد حیات کو سامنے رکھ

یہ چند گھڑیاں بہتر ہیں

بلند و بالا محلات میں شاہوں کے حضور بیٹھنے سے

وہیں تجھ سے محبت کرنے اور تیرے چاہنے والے تجھے یوں گنگناتے اور گاتے

تھے۔

”ابونواس۔“

فائدہ اٹھا اپنی جوانی سے
جان لے یہ باقی نہیں رہے گی
صبح و شام کی شraithیں ملا
نشے کا لطف اٹھا
اور مخمور ہو

”پچ پچ پچ۔“

ایسا طغیہ اور تمسخر انداز تھا۔ نگاہیں جو چہرے پر جمی تھیں وہ ان احساسات سے
لبالب بھری تھیں۔ بڑی خفت سی محسوس ہوئی تھی۔ ایک تو گرمی اوپر سے شرمندگی۔ مساموں
سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

”اندھا تھا ابوالعتاہیہ۔ اندھے زندگی بسر کرتے ہیں۔ گزارتے نہیں۔ میں نے
زندگی اُس کے حُسن و رنگوں کے ساتھ بھرپور انداز میں گزاری ہے۔ کوئی بار بار ملنے والی چیز
تھی یہ۔“

میں خاموش ہو گئی تھی۔ قیداً میں اُس وقت اُسے وہ سب نہیں سنانا چاہتی تھی جو
میرے قلب و ذہن میں شور مچائے جاتا تھا۔ چاند چہرے جیسے لڑکے، ان کے مرمروں
بدن، زیر جاموں کی زماہٹ اور اس کے چانداریوں سے۔

”ابونواس زمانہ قدیم سے جدید تک دنیا بھر میں شہرت کے اعتبار سے مقبول ترین
کئی ایک الف لیلوی کہانیوں میں تمہاری جس ظرافت، تمہارا مزاح اور تمہاری ذہانت بہت
دلنشین انداز میں سامنے آئی ہے۔ اپنی کوئی ایسی ہی کہانی آج کی رات وجہ کے کنارے
مجھے سناؤ۔“

ابونواس کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا۔

”یہ الف لیلوی کہانیوں کا عشق ابھی بھی قائم ہے؟“

”کوئی سی بات کرتے ہو کہانیوں کا عشق ابھی کبھی مerta ہے۔“

چلئے کہانی شروع ہوئی صیغہ غائب میں۔

ابونواس بہت چالاک ہوشیار آدمی تھا۔ خلیفہ نے اُس کی چالاکیوں کے بارے میں سنا۔ ہوشیار یوں کے متعلق جانا۔ غیر معمولی ذہین اور فطین آدمی ہے۔ درباریوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے۔

”پیغام بھیجو اُسے۔ خلیفہ ملنا چاہتا ہے فوراً۔ لیکن اُسے بتا دو کہ وہ میرے پاس اُس وقت نہ آئے جب سورج چمکتا ہو۔ اور جب اندھیرا ہو تب بھی نہیں۔“

ہاں اُسے بتاؤ کہ اُس نے میرے پاس اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے نہیں آتا ہے اور نہ ہی اُسے کسی جانور پر سوار ہو کر آنا ہے۔

اور ہاں یہ اُس پر واضح کر دو کہ اگر اُس نے میرے ممنوع کردہ کسی بھی طریقے کو اپنایا تو بس پھر جلاؤ اسکا گانا اُتارنے کو تیار بیٹھا ہے۔

وہ آئے جلد اور بہت جلد۔“

اب ابونواس نے جالی کا بڑا سا بیگ لیا۔ اس میں بیٹھا۔ یا ربیلیوں سے کہا اُسے اونٹ کی گردن سے رے کے ساتھ لٹکا دو۔ یوں وہ تھومتا جھامتاتا ایک ایسے وقت میں جب آسمان پر ہلکے سے بادل تھے اور ملکی بلکی بارش تھی خلیفہ کے پاس پہنچ گیا۔ خلیفہ اُسکی ہوشیاری پر حیران رہ گیا تھا۔

خلیفہ تو حیران تھا ہی۔ اکیسویں صدی کی یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی عورت بھی حیران تھی۔ ماحول کے رنگا رنگی نے چند لمحوں کیلئے توجہ بانٹ لی تھی۔ پلٹی تو دیکھا کہ اُس

کی مخمور آنکھیں جیسے یادوں کے جوار بھائے میں بچکولے لے رہی تھیں۔ ذرا سا رخ پھیرنے پر ہی سبب جان گئی تھی۔ افلاق نے سامنے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دینیے انہیں۔ علی الازوای Ali Al Essawi۔ اس کا یہ گانا پوری عرب دنیا میں ہٹ ہوا ہے۔“

مقام Maqam جیسے سریلے شریں دل کی دنیا زیر و زبر کرنے والا آلات موسیقی اور مکتوبہ Makhtooaba جیسا گیت۔ لوگ جھوم رہے تھے۔ من چلوں کی سیٹیاں تھیں۔ پہچان تھا۔ پر میں دیکھتی تھی ابونواس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے خفیف سے رنگ تھے۔

میں سمجھ گئی تھی علی الازوای کی پر فارمنس پر ناک بھوں چڑھی تھی۔

پھر جیسے وہ خوابناک سی آواز میں بولنا شروع ہوئے۔

”ہمارا نوجوان ڈزلزل عود Oud بجاتا تھا تو گلیوں میں چلتے لوگوں کے قدموں کو زمین جکڑ لیتی تھی استادوں کا استاد جس نے بے شمار راگنیوں کو ایجاد کیا۔ اسحاق اُسی کا شاگرد تھا اور اُس میرے ہم عصر ابراہیم موصلی کے گانے پر تو پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے نیچے گرتے تھے۔ وجہ کا پانی ساکت ہو جاتا تھا۔ ہوائیں چلنا بھول جاتی تھیں۔ اُس کی انگلیوں کی پوروں سے سُرخ پھوٹتے تھے۔ راگنیاں جنم لیتی تھیں۔ وہ سُراور گلے کا بادشاہ تھا۔“

ہمارے سامنے چلتے ٹی وی کی آواز کسی نے اونچی کر دی تھی تو جہ منعطف ہو گئی۔

بھرے بھرے گالوں اور موٹی آنکھوں والی ایک مغنیہ مریم فارس سامنے تھی۔ کیا طرح دار لڑکی تھی۔ شانوں پر بکھری گھنگریالی زلفوں پر کہیں شام کی لالیوں کا گمان پڑتا تھا۔ نیم عریاں جسم اور داؤں کا بانگن۔

میں نے چہرے کے تاثرات سے یہ جانتا تھا کہ اُن آنکھوں میں نئے رنگ و آہنگ
کو دیکھنے کا سُور و ضرور تھا پر گیت کی شاعری کے معیار پر اعتراض تھا۔

”زبیدو! اقصاء نہیں سنائیں گے۔“

زوردار قبضہ فضا میں گونج گیا تھا۔

”میری دُکھتی رکوں پر آپ کی انگلیاں ہیں۔“

”بجدا نہیں۔“

میں بھی ہنس پڑی تھی۔

”دن تو موسم بہار کی رتوں والے تھے۔ کوئلیں پھوٹی تھیں اور دجلہ بہت گدلا گدلا
ساتھا۔ پانی کے بہاؤ نے اس سال ابھی سے ہی آخری کناروں کو پچھاڑنا شروع کر دیا تھا۔

شام کی سنہری کرنوں میں خلیفہ کا محل، دجلہ کے پار برامکیوں کے شاندار محل فن
تغیر کے وہ مادر نمونے کہ جو بندے کوڑک کر دیکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ باغ میں دنیا
جہاں کے درختوں کی مادر اقسام، کیاریوں میں کھلے سینکڑوں اقسام کے پھولوں کی مہکار،
جھاڑیوں کی قطع برید، کہیں سانپوں، شیروں، چیتوں، موروں کی صورت باغبانوں کی
فنکاری کے عکاس، گھاس کے قطعوں میں موتی بکھیرتے حوض جن میں ناچتی
مچھلیاں۔ دجلہ کے اوپر مرغابیوں کی ڈاروں کو پر پھڑ پھڑاتے ہوئے قطاروں کی صورت
اڑتے شام کی زرنگار کرنوں میں دیکھنا۔ اللہ کس قدر دل خوش کن منظر تھا۔

میں خلیفہ کے بلاوے پر اُن سے ملاقات کیلئے آیا تھا اور چند لمحوں کیلئے رُکا تھا۔
بالکونیوں سے باہر کے منظر جیسے چوکھٹوں میں نصب تصویروں کی مانند مجھے دکھے تھے۔

کمرے میں تہائی تھی۔ نیبڈ سے بھری صراحی اور فواکھات کی سینی سامنے
تھی۔ میں نے مزاج شاہی کی افسردگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”واللہ امیر المؤمنین آپ بھی کیا چیز ہیں؟ فردوس میں رہتے ہیں۔ ذرا نگاہ اٹھا کر تو دیکھیے۔ باہر کے منظر اُن تنگیں جگانے اور جذبات اُبھارنے والے ہیں اور آپ ہیں کہ ملول بیٹھے ہیں۔“

میں نے اپنا تازہ کلام سنایا اور کہا۔

”جعفر برکی نے کنیز خریدی ہے۔ چہرہ جس کا شرک شہزادیوں کا سا، جسم رومی نازنیوں جیسا، نین حجازی دوشیزاؤں اور کمریمنی میاؤں جیسی ہے۔ حضور اس گناہ ثواب کے چکروں کو چھوڑیئے۔ یہ دو روزہ زندگی ہاتھ سے گئی سو گئی۔ لطف اٹھائیئے۔ شراب سے، شباب سے اور سسے کی ساعتوں سے۔“

ابراہیم موصلی اور ابن جامع کو بلوائیں۔ راگ وراگنیوں سے دل بہلائیں۔ پری چہرہ مازنیوں سے اپنی راتوں کو آبا دا ورشا د کریں۔“

خلیفہ کی افسردگی دُور ہوئی۔ مُسکرایا، ہنسا اور شاد کام ہوا۔

میں گھر کو نالہ بھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دستک ہوئی۔ سمجھا کہ غلام خلیفہ کی جانب سے انعام و اکرام لے کر آئے ہوں گے۔

گنڈی کھولی۔ غلاموں کی ایک لام دُور تھی جو دروازے کو دھکے مارتی اندر آئی۔ مجھے پکڑا۔ وہ پٹائی کی کہ چارپائی پر پڑنے اور تیل ہلدی لگانے والی بات ہو گئی تھی۔

معلوم ہوا کہ ابونواس کے محل سے نکلتے ہی زبیدہ خاتون عُصّے سے لال چیلی بارون کے کمرے میں آئی اور پوچھا۔

”ابونواس آپ سے کیا باتیں کرتا تھا؟“

زبیدہ بڑی زبردست اور ڈاڈھی ملکہ تھی۔ خلیفہ تو پل بھر میں ہی منکر ہو گیا۔ وہ

بھری۔

”امیر المومنین کمال کرتے ہیں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے اُسے تمہیں بہکاتے اور گناہ کی ترغیب دیتے سنا۔ تم سے اتنا نہ ہوا کہ اُسے پھٹکار دو اور نہیں تو ڈانٹ ڈپٹ دو۔“

ہارون ہنسا۔ ”بھئی زبیدہ سچی بات ہے۔ ایسی اچھی اچھی باتوں پر ڈانٹنے کا کیا کام۔“

اور زبیدہ نے اپنے ملازموں سے ابونواس کو ایسی پھینٹی لگوائی کہ بیچارہ دو ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔

مجھے مزہ آیا کیونکہ ایک خوبصورت قہقہہ فضا میں دیر تک گونجا۔

خلیفہ کو ایک دن پھر میری ہڑک انھی۔ بلا بھیجا۔ ایسی خستہ حالی دیکھی تو پوچھا۔

”ابونواس تمہیں کیا ہوا؟ بیمار تھے کیا؟“

”امیر المومنین بس کچھ مت پوچھیے۔“

میں ساری بات چھپا گیا کہ میں نے دونوں کمروں کے بیچ دروازے میں رکھے

چوہی پردے کے پیچھے جان لیا تھا کہ وہاں کون ہے؟

”ہاں ابونواس اُس دن کی طرح کچھ مزے مزے کی باتیں ہو جائیں۔ کچھ ذکر

پری پیکروں اور پری دھوں کا کہ طبیعت اُداس ہے۔ تمہاری باتوں سے شاید راحت و سرور

نصیب ہو۔“

”ہاں تو امیر المومنین اُس دن میں آپ کو بتا رہا تھا کہ عربی میں ایک کہادت ہے

کہ جس کی دو بیویاں اُس کی کیا زندگی؟ اُدھر جھوٹ اُدھر جھوٹ۔ اُدھر کچھ اُدھر کچھ۔ جس کی

ہوں تین بیویاں وہ بیچارہ تو کوہِ دُکھوں کی سان پر چڑھ گیا۔ اور جس نے کی چار وہ بنا

مظلوم۔ نہ زندوں میں نہ مَر دوں میں۔

تو امیر المومنین میں نے تو دنیا کو دیکھتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بیوی بس ایک ہی، دل کی وہی رانی۔“

ہارون الرشید نے پہلے تو حیرت سے آنکھیں پھاڑیں پھر چیخا۔
 ”ابونواس تم کیواس کرتے ہو۔ قسم لے لو مجھ سے جو تم نے اُس دن ایک بھی ایسی بات کی ہو۔“

”امیر المومنین“ ابونواس عاجزی سے جھکتے ہوئے بولا۔
 ”آپ کو میری باتیں بھول گئی ہیں شاید۔ میں نے اُس دن آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ بنی مخزوم قریش میں افضل ترین زبیدہ خاتون دختر قاسم اُس قوم کے خوشنما پھولوں میں سے سب سے حسین پھول۔ اُس دن مجھے محسوس ہوا تھا کہ آپ کا دل دوسری عورتوں کی طرف مائل ہے۔ میں آپ کو سمجھانا چاہتا تھا کہ زبیدہ خاتون ہی آپ کے قلب و جان کیلئے راحت کا سامان ہے۔“

ہارون الرشید غصے میں چلایا۔
 ”ابونواس تم جھوٹے ہو۔ خدا کی لعنت ہو تم پر۔“
 ابونواس نیم ایستادہ ہوا۔ کورٹش بجالاتے ہوئے بولا۔
 ”امیر المومنین آپ مجھے وقت سے پہلے مردانا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ جو میں لنگڑاتا ہڈیاں کوڈے رگڑتا آپ کے حضور حاضر ہو گیا ہوں۔ اس سے بھی جاؤں۔ رحم کیجئے مجھ پر۔“

اُسی وقت پردے کے پیچھے سے زبیدہ کی ہنسی سُنائی دی۔
 ”ابونواس تم سچے ہو۔ تم نے یہ سب کہا ہوگا۔ امیر المومنین چونکہ پریشان تھے انہوں نے یہ سب باتیں اپنے پاس سے گھڑیں اور تمہارا نام لگا دیا۔“

بالکل، بالکل، درست، درست کہتا میں اپنے گھر دوڑتا گیا۔ گھر پہنچا تو دروازے پر زبیدہ کے غلام خلعتِ فاخرہ اور زرنقہ لئے کھڑے تھے۔

کئی ماہ بعد خلیفہ کو یہ سب معلوم ہوا۔ بہت ہنسا۔ انعام و اکرام سے نوازا۔
”وہ کلام الیل والا کیا قصہ تھا؟ اُسے بھی تو سنائیں۔“

”ارے بھئی اُن دنوں محل میں آرمینیا کی چند کنیزوں کا بڑا چہ چاہا۔ آرمینیا کی لونڈیاں بڑی مہذب اور شائستہ سمجھی جاتی تھیں۔ محل میں بچوں کی تربیت کا بیشتر کام اُن کے سپرد تھا۔ ایک رات ہارون نے تنہائی میں ایک طرحدار اور دل کش کنیز سے کچھ شرارت کرنی چاہی۔ اُس نے صبح پرٹڑا دیا۔ اگلے دن ہارون نے اُسے بلوایا اور وعدہ دیا دلا لیا۔ آرمینیائی لونڈی نے دائے ہانکپن سے کہا۔

کلام الیل یموۃ النصار۔

ہارون مسکرایا۔ اُسے لونڈی کی بات بہت پسند آئی تھی۔ بغداد کے سب شاعروں کو اکٹھا کیا اور کہا کداس پر گرہ لگائیں۔

”جانتی ہیں یہ بازی کس نے جیتی؟ انہوں نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تھا۔ میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ فوراً اپنے سینے پر فخریہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”ارے بھئی میں نے۔ یعنی ابونواس نے۔ میں نے تفسیمین کے مصرعوں میں ہارون الرشید کی دراز دہی کا سارا حال بیان کر دیا تھا۔

”تو اب رخصت۔ تمہاری مچھلی بس آیا ہی چاہتی ہوگی۔“

میں نے لگا ہیں اٹھا کر دُرُور پھینکیں۔ اخلاق تو مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

”کیا مجھے تھوڑا سا وقت اور نہیں عنایت کریں گے۔“

میرا انداز بڑا ملتی سا تھا۔

کچھ اپنے بارے میں بھی بتا دیں۔ خود سے ملا دیں۔

”ارے بھائی ہماری زندگی بس ایسی ہی اُجڑی پُجڑی سی تھی۔ جسکا اُطفہ تھا۔ اُس کی صورت تو کبھی دیکھی ہی نہ۔ بس سنا کہ مروان دوم کی فوج میں ایک سپاہی ہے۔ اور نام بھی معلوم نہیں ایک بار ماں نے ”حینی“ بتایا تھا۔ میری ماں گلبن ایرانی اور پیشے کی جولاہی تھی۔ کھڈی پر بڑا خوبصورت کپڑا ملتی تھی۔ صورت کی اتنی حسین کہ ہواؤں میں اڑتے پرندے دیکھ لیں تو غش کھا کر سیدھے اُس کے قدموں میں گریں۔ ماں تو میرا ماں نے الحسن ابن حینی ال حاکمی رکھا۔ میں خوبصورت تھا۔ سنہری بالوں میں گنڈل پڑتے تھے اور دو ٹیٹیں شانوں پر گرتی تھیں تو گاؤں کے من چلوں نے ”ابونواس“ کہنا شروع کر دیا۔

ہاں پیدا کہاں ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔ کسی نے دمشق کہا۔ کسی نے بصرہ اور کچھ ہوا ز کہتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟ مجھے تو خود معلوم نہیں۔

ابونواس نے منہ بنایا۔ ہاتھوں کی انگلیاں نچائیں سارے چہرے پر نفی کا تاثر بکھیر دیا۔

ماں نے مجھے یمن کے کسی تاجر کے پاس کیوں بچ دیا؟ میں کبھی سمجھ نہیں سکا۔ چھوٹا سا تھا۔ کیا میری روٹی اُس پر بھاری تھی؟

یمن کے اِس تاجر کی دوکان بصرہ میں تھی۔ کھانے پینے کی یہاں کھل ڈُل تھی۔ خوب قد کاٹھ نکالا۔ رؤساف اول جیسا تھا۔ ذہین بھی، بہت اور حسین بھی بہت۔ راہ چلتے رُک کر دیکھتے ضرور تھے۔

اور پھر اُس نے مجھے دیکھا۔ ولیدہ ابن احباب نے یہ شاعر تھا۔ اُس نے مجھے خرد اور اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ پڑھائی لکھائی، گرامر، صرف و نحو۔ کوئی دو سال بدوؤں میں بھی

رکھا کہ زبان خالص ہو جائے۔

یہ دلیہ ہی تھا جو مجھے بغداد دلایا۔ یہیں میں نے شاعری شروع کی۔ مزاح سے بھرپور۔ صحرائی روایات کے برعکس، بھری زندگی کی عکاس جسمیں نوخیز لڑکوں کی محبت اور شراب تھی۔

میں باغی تھا۔ روایات کا، اقدار کا، مذہب کا۔ سرور ملتا تھا جب مُلا چیتنے چلاتے تھے جب لعن طعن ہوتی تھی۔

قصیدہ کو تھا اپنے سر پر ستوں کا۔ ہر امگیوں کیلئے کیوں نہ لکھتا۔ وہ تو سمجھنے تھے جو عباسیوں کو مل گئے تھے۔ عربوں کا عروج اپنی جگہ، اُنکی فتوحات کے پھیلاؤ کی اہمیت کا اپنا مقام۔ اُنکی زبان کی وسعت، مذہبی رواداری، آئین و دستور کی بالادستی نے دوسری قوموں پر انہیں غالب کیا یہ سب حقائق مسلم۔ لیکن ایرانیوں کے تہذیب و تمدن کی شائستگی، نرمی اور لطافت بھی اپنی جگہ بڑی نمایاں تھی۔ ہر اُنکی ایرانی جنہوں نے اپنا رنگ اُنکے رنگ میں شامل کیا اور اُسے مزید نکھارا۔

ہر اُنکی میرے محسن تھے۔ مجھے نوازتے تھے۔ جعفر برکی نے جب اپنا وہ شاندار محل بنایا جو شان و شوکت کے اعتبار سے خلیفاؤں کے محلوں سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ اور ہاں دیکھو یہ میری چھٹی حس تھی۔ یا تم! اسے میرا وجدان کہہ لو کہ جیسے مجھے ان کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ ہوا۔ محل کو دیکھتے ہی بے اختیار میرے ہونٹوں پر یہ اشعار تھر تھرانے لگے۔

اے محل شگستگی کے آثار تجھ پر ظاہر ہیں
میں نے تیری دوستی میں خیانت نہیں کی
اے برک کی اولاد جب تم دُنیا سے گم ہو جاؤ

تم پر ہمیشہ سلامتی رہے۔ دنیا تمہیں یاد کرے۔
 ہارون الرشید کو مجھ پر اتنا سیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُسے بھی توا احسان
 فراموشی کی انتہا کر دی تھی۔“

”ابو نواس ہارون الرشید پر تمہارا اتنا معصہ درست نہیں۔ طاقتور شاہوں کی کتاب
 میں یہ درج ہوتا ہے کہ صرف انہیں ہی مرکز رہنا ہے اور جب کوئی دوسرا مرکز بننے کی کوشش
 کرتا ہے تو پھر وہی ہوتا ہے جو بر مکیموں کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے اختیارات اور شاہانہ اظہار
 کی تمام حدیں پھلانگ لی تھیں۔“

”ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے جو لکھی تھی، ہارون الرشید کی جگو، جو بغداد کے
 گلی کوچوں میں زور و شور سے کوئی خلیفہ نے مجھے دیس نکالا دے دیا۔ پھر بھاگنا پڑا تھا اور
 میں مصر بھاگ گیا تھا۔

میری بہترین شاعری امین کے دور میں لوگوں کے سامنے آئی تھی۔“
 ”ابو نواس اگر کچھ کہوں تو سنیں گے نا؟ تم نے امین کا اُستاد ہونے کے ناطے
 اُسے بھی شراب پر لگا دیا تھا۔ امین بہت خوبصورت اور دھبیہ لڑکا تھا۔“
 ”تمہاری عدالت میں ہوں۔ جو چاہو کہہ سکتی ہو۔“

”نہیں نہیں ابو نواس۔ میں نے تو جو ماڑا موٹا پڑھا ہے اُسی کی روشنی میں تم سے
 بات کرتی ہوں اور تصدیق چاہتی ہوں۔“

”تو پھر سنیں۔ یہ امین ہی تھا جس کی شعر کوئی کی اصلاح پر زبیدہ نے مجھے مامور
 کیا۔ میں نے اصلاح کی۔ غلطیاں بتادیں تو نو جوان شہزادے نے مشتعل ہو کر مجھے بندی
 خانے میں ڈال دیا۔ ہارون کو پتہ چلا تو بیٹے پر مارا راض ہوا اور مجھے رہائی دلوائی۔

چند ہی دنوں بعد جب میں خلیفہ کی خدمت میں حاضر تھا انہوں نے بیٹے سے کہا

کہ اپنا تازہ کلام ابونواس کو سناؤ۔ امین نے ابھی دو تین شعر ہی پڑھے ہوں گے جب میں کھڑا ہو گیا۔ ہارون نے بے حد تعجب سے میری طرف نگاہیں کیں اور استفسار کیا کدھر؟ میں نے کہا بندی خانے جانے کیلئے۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ بھئی ہم تو ایسے ہی تھے بڑا در بے باک سے البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ امین کے مرنے پر جو نوے میں نے تخلیق کیئے وہ عربی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ زبیدہ کے ماملے اور بغداد کی لگیوں میں کوئچتے نوے میری شاعری کے صدقے تھے جنہوں نے مامون کو فتح یاب ہو کر بھی بغداد میں داخل ہونے سے مہینوں روکے رکھا۔ خائف تھا وہ۔

مامون میرا نام سُننا نہیں چاہتا تھا۔“

”ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابونواس تم آخری عمر میں تائب ہو گئے تھے۔ بڑے مذہبی اور خدا پرست بن گئے تھے۔“

”یہ ہوائی تو میرے کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ جیل اور بڑھاپے نے پریشان کر دیا تھا۔ انعام کے لالچ میں مدح سرائی بھی کی۔ اور ہاں ایک بہت بڑی حماقت بھی سرزد ہوئی کہ مامون کے درباری مشیر نے چالاک سے علی ابن طالب کے خلاف ججو بھی لکھوالی اور اُسے بغداد کے کوچہ بازار میں نشر بھی کر دیا۔“

”کہتے ہیں زہر دیا گیا تھا تمہیں۔ اسماعیل بن ابوسہل مرکزی کر دار تھا۔“

”زہر ملا۔ یا جیل میں ہی طبعی موت مرا۔ بس دنیا سے جانے کا بہانہ ہی چاہیے تھا۔ وہ لگیا اور چلا گیا۔“

لو تہاری مچھلی آگئی ہے۔ کھاؤ۔ میں چلتا ہوں۔“ ایک ہاتھ میری طرف بڑھا تھا جسے میں نے محبت سے تھاما۔

بڑی سی سینی میں ٹماٹر، پیاز، کھیروں اور چٹنی کے ساتھ پیچلی آگئی تھی۔
 افلاق بتاتا تھا کہ پچھلی الاؤپر روسٹ کے بعد مرچ مصالحوں کے ساتھ گرم کوکلوں
 ملی ریت میں دم پخت کی جاتی ہے۔

اب ذائقے کے بارے میں کیا کہوں۔ استنبول کا پرنس آئی لینڈ یاد آ گیا تھا۔ کہ
 تب بھی جی چاہا تھا اٹھا کر باسفورس میں پھینک دوں۔ میں تو چاہتی تھی۔ سیما ہی نہیں مانی۔
 اور اب بھی اگر افلاق ساتھ نہ ہوتا تو دجلہ میں پھینکنا ضروری تھا۔

افلاق بیٹوں جیسا ہی تھا۔ ذائقے سے آشنا بھی۔ تو ہرج ہی کیا تھا کہ اُسے پچھلی بھی
 کھلاتی جاؤں اور باتیں بھی کرتی جاؤں اور اُس شخصیت کو تھوڑا سا اور یاد کر لوں۔

اُس کے مرنے پر جب گھر کی تلاشی لی گئی تو بدخواہوں اور حاسدوں کو صرف
 کاغذوں کا ایک دستہ اور کہانیوں کی ایک کتاب کا بیرونی کوری ملا تھا۔ دستے میں صرف ونحو
 اور گرامر کی چند تراکیب درج تھیں۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اُس کی شاعری سے متعلق ہر بات کی
 تان اس کے غیر معمولی گہرے اور ذومعنی اظہار پر ہوتی تھی۔

اپنے عہد اپنے وقت کا ایک بڑا شاعر ابونواس۔



بانی عراق جرٹروڈ بیل

بیسویں صدی کی ایک عظیم لکھاری، ولیہ سیاح، ایک منفرد کردار اور بہترین منتظم جس سے میں
بخدا امیدیں ملی اور جس کی کہانی کا انجام لاہور آکر جانی

- مجھے مشرق کا سحر، اُس کے صحراؤں کا ظلم، اُس کے لوگ اور ان کے کلچر کی
رومانیت بہت ہانت کرتی ہے۔
- میں جیسے جیسے "حافظ" کی شاعری کو پڑھ رہی ہوں حیرتوں میں گم ہوتی جا رہی
ہوں۔ ہم کیسے لوگ ہیں جو اُس کے مقام سے ہی آگاہ نہیں۔ اُس کی نظموں میں
موسیقی کا ایسا رچاؤ ہے کہ آپ کا جی انہیں بے اختیار گنگنا تے رہنے کو چاہتا
ہے۔
- مجھے خدا سے اتنی محبت ہے کہ خدا دیوں کو بھی نہیں ہوگی۔ کوئی خدا دی اسکے
حُسن کو ان نظموں سے نہیں دیکھتا جن سے میں اسے دیکھتی ہوں۔ دریا کی
خوبصورتی، پام کے باغوں کا حُسن، کھجور کے درختوں کا بانگین، صحرا کی دل
آویزی۔ سب مجھے گرفت میں لے لیتے ہیں۔

The woman who made Iraq یعنی بانی عراق جیسا ٹائیٹل
اُسے عراقی عوام نے دیا تھا۔ صحرائی بدو اور علاقائی شیخ اُسے کو مین اف دی ڈیزٹ کہتے تھے۔
Shaper of the nations اور فی میل لائرس آف عربیہ کا خطاب اتحادی
فوجوں کا عطا کردہ تھا۔ وہ کنگ میکر تھی۔ اُسے بے تاج ملکہ بھی کہا جاتا تھا۔

جرٹروڈیل

The woman who made Iraq یعنی بانی عراق جیسا ٹائیٹل اُسے عراقی عوام نے دیا تھا۔ صحرائی بدو اور علاقائی شیخ اُسے کو مین آف دی ڈیزٹ کہتے تھے۔ Shaper of the nations اور فی میل لارنس آف عربیہ کا خطاب اتحادی فوجوں کا عطا کردہ تھا۔ وہ کنگ میکرتھی۔ اُسے بے تاج ملکہ بھی کہا جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں تو اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ کہیں ایک آدھ بار رسی سا پڑھا ہو گا تو وہ میرے حافظے میں کہیں نہیں تھا۔

پہلا تعارف بُرے سے تاثر کا حامل تھا۔ دمشق جاتے ہوئے جہاز میں ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی چھٹی جنٹی ٹیار کٹارا سے نین نقش والی دمشق یونیورسٹی میں جغرافیہ کی اُستاد نے شام کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اچانک کہا۔

”یہ کیمخت مارے ذلیل انگریز اور فرانسیسی انیسویں صدی کے آواخر سے ہی

فاحشاؤں جیسے کردار ایسے مشرق وسطیٰ پر رالیں پکاتے پھرتے تھے۔ اُس منحوس ماری جیڑو ڈنیل Gertude Bell کو کیا کہوں۔ مہنجار کہیں کی کیسے اُس نے میرے امتنے خوبصورت ملک کی شکل و صورت بگاڑ دی۔ کیا مرد مارعورت تھی؟ ابصرے کو بغداد سے ملایا۔ موصل اس میں شامل کیا۔ کویت کو علیحدہ کر دیا۔ اردن کا ٹونا الگ کیا۔“

میں نے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ مجھے احساس تھا۔ یقیناً میری آنکھوں میں لاعلمی کے رنگ ہوں گے اور میری پتلیوں پر سایہ کرتے نادانقہیت کے عکس اور کہیں یہ خفّت بھرا احساس بھی کہ چلی ہے شام اور عراق کی سیاحت اور ان پر لکھنے کو اور حقائق جانتی ہی نہیں۔ اس کے لہجے میں جاندار قسم کی تلخی تھی۔

”برٹش کورنمنٹ کی ایجنٹ، اُس کی منتظم اعلیٰ، اُس کی بادشاہت کے ستونوں کو مشرق وسطیٰ میں گہرے گاڑنے میں برٹش عزائم کی معاون، لارنس آف عربیہ اور وٹسمن چرچل کی ساتھی اور پورے جزیرہ نماعرب کے صحراؤں، میدانوں اور شہروں کے چپے چپے کو اپنے پیروں تلے روندنے اور علاقے کے شیخوں اور صحرائی قبائل کے سرداروں کو جاننے اور تعلق والی جو مشرقی وسطیٰ پر ایک اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

مگر ان سب کے باوجود اُسے عراق سے محبت تھی۔ وہ بغداد کی دیوانی تھی۔ وہ دفن بھی یہیں ہے۔“

جیڑو ڈنیل میرے اندر اتری ضرور پراگلے بہت سارے دنوں میں شام کے شہروں کی سیاحت اور بغداد کی سرزمین پر قدم دھرنے کے بعد تک وہ ذرا دل سے اوجھل ہی رہی۔

یہ اور بات ہے کہ جونہی میں عراق آرکیا لوجی میوزیم میں داخل ہوئی اور گھومتے گھومتے میوزیم کے داہیں حصے میں جا گھسی تو ٹھٹھک گئی۔ وہاں جیڑو ڈنیل کانسی کے ٹسموں

اور آرٹسٹوں کے کمال فن کی صورت میں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھی۔ اس کی لکھی گئی ڈھیروں ڈھیر کتابیں اس کے استعمال کی اشیاء سمجھوں کو میں نے دیکھا۔ اُس پورشن میں سب سے خوبصورت وہ لفظ تھے جو اُسے خراج پیش کرتے تھے میں نے انہیں پڑھا اور جی جان سے سراہا۔

This window is in remembrance of Gertrude Bell versed in learning of the East and of the West, writer, Poet, Historian, Antiquary, gardner, mountaineer, explorer, lover of nature of flowers and of animals incomparable friend, sister and daughter.

مجھے پتہ چلا تھا کہ اس شاندار میوزیم کو بنانے میں اُسکی انتہا درجے کی دلچسپی، آثار قدیمہ اور خاص طور پر میسوپوٹیمیا کی سرزمین پر بکھرے ہزاروں سالہ تاریخی ورثے سے اُس کی بے پناہ محبت اور لگن نے یہ عظیم کارنامہ اُس سے کروایا۔

افلاق میرے ٹیکسی ڈرائیور کے پاس اُس سے متعلق کافی معلوماتی ذخیرہ تھا۔

”چلو میوزیم کے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا تھا جو یہ بتائے اسے تو سنوں۔ پھر کسی اور کو بھی ڈھونڈوں گی۔“

پتہ نہیں میرے وجدان نے مجھے سگنل دیا تھا کہ اس تاریخ ساز شخصیت کے پیچھے بہت دلچسپ کہانیاں ہوں گی۔

ہم دونوں نے قبوے سے بھری گلاسیاں اٹھائیں۔ سب لیتے اور میں نے آنکھیں اور کان افلاق کے چہرے پر لگا دیئے۔

1868ء پیداؤش کا سال اور جگہ انگلینڈ کی کاؤنٹی درہم Durham۔ خاندان

سٹیل steel کا بیوپاری۔ دولت کا کچھ یہ حال کہ آج کے بل گئیس سے ملایا جاسکتا ہے۔ ذہانت بھی بہت، دلیری بھی اور اعتماد بھی انتہا کا۔ سوتیلی ماں فلورنس نے محسوس کرتے ہوئے تربیت سازی کی کہ اپنی ماں ماریا تو اُس کی کمسنی میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ماڈرن ہسٹری میں ایم اے میں ٹاپ کرنے والی وہ پہلی طالبہ تھی۔

”مجھے مشرق کا سحر، اُس کے صحراؤں کا ظلم، اس کے لوگ اور ان کے کلچر کی رو مانیت بہت ہانٹ کرتی ہے۔ پہاڑوں کی دنیا کی ہیبت اور انہیں سر کرنے کا میرا جنون ہے۔“

ایسی باتوں کا اظہار اکثر اُس کے ہاں ہوتا۔

”مجھے ایران جانا ہے۔ انگل فرینک Frank Lasceller کے پاس۔ فارسی زبان سیکھنے کا آغاز کرتے ہوئے اُس کا گویا ایک اعلان تھا۔

چھ ماہ بعد تہران کی ایک بہت خوبصورت سی شام کو سفارت خانے کے ہال میں استقبالیہ پر کھڑے خود نو جوان Legation سیکریٹری ہنری کاڈوگن Cadogan نے ایک دلکش لڑکی کو قیمتی فرلوں سے بچے فراق میں برطانوی سفارت کار سر فرینک اور لیڈی فرینک کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ہال کی کھڑکیوں سے آتی شام کی کرنوں میں اُس کے تیز سرنخی مائل بال یوں چمکے تھے جیسے اُن میں آگ لگی ہوئی ہو۔ اُس کی ابھری ہڈیوں والے رخساروں پر چمکتی نیلگوں سبزی مائل آنکھیں کانچ کی طرح چمکتی تھیں۔ اُس کے دلکش خدو خال اور اُس کے گلے میں پہنے قیمتی موتیوں کا ہار اُسکی گردن میں لپٹا بہت قیمتی نظر آتا تھا۔

ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ بکھیرے اُس نے پذیرائی کی اور وقت رخصت وہ ذرا سا اُسکی داہنی جانب جھکا اور سر کوٹشی کے انداز میں بولا۔

”ایک چھوٹی سی خواہش، ایک چھوٹی سی درخواست اسے پذیرائی دینا۔ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

جرٹروڈ نے رخ پھیرا اور اُسے لغو رد کیا۔ ایک دلکش نوجوان شوق و اشتیاق کی لو سے دمکتی آنکھیں اُس پر جمائے پوری طرح متوجہ تھا۔
جرٹروڈ کو بھی ہنری پسند آیا تھا۔

اب ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ پکنک پارٹیاں، رائیڈنگ، لمبی لمبی سیریں، شاموں کی کافی پارٹیاں اور طویل باتوں کے سلسلوں میں جہاں وہ اپنے بارے میں اُسے بتاتی کہ اُسے کوہ پیما کی لے کر صحراؤں میں گھومنے پھرنے۔ آثار قدیمہ، نئی نئی زبانوں کو سیکھنے، دنیا کو دیکھنے، دنیا کی مختلف قوموں، گروہوں، فرقوں کے لوگوں سے ملنے اور اُن کے کلچروں سے آشنا ہونے کا کتنا شوق ہے؟

ہنری اُسے رشک سے دیکھتے ہوئے سوچتا اور دھیرے سے کہتا۔
”جرٹروڈ تمہارے اور میرے شوق کتنے ملتے ہیں اور ہمارے خیالات میں کتنی ہم آہنگی ہے؟ اور زبانیں تو تم ابھی بھی چھ سات روانی سے بول سکتی ہو۔“
تب وہ کھلکھلا کر ہنستی اور کہتی۔

”نہیں ہنری یہ تو کچھ بھی نہیں۔ بیس تو کم از کم آتی چاہیں۔ ابھی تو میری فارسی بھی اتنی اچھی نہیں۔ مزید مہارت کی ضرورت ہے۔ یوں مجھے یہ زبان بہت پسند آتی ہے۔ میٹھی اور اپنی پشت پر بھاری اثاثہ لیئے۔ ویسے ہنری مجھے ڈل ایسٹ بہت فینڈ کرتا ہے۔ میں نے اب اس کی سیاحت کرنی ہے۔“

ہنری اس کی خوبصورتی سے کہیں زیادہ اُس کے بیچے میں چھپے دماغ سے متاثر ہوا تھا۔ وہ ذہانت کی انتہاؤں پر تھی۔

ایسی ہی ایک ملاقات میں ہنری نے کہا تھا۔

”جرٹروڈ مجھے لگتا ہے تم نے کوئی عظیم کام کرنا ہے۔ تم بہت خاص اور انوکھی ہو۔ میں تمہیں بہت پیار کرنے لگا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

اُس نے چچا اور چچی کو آمادہ کیا اور منگنی کر لی۔ مگر جب اُس نے اپنے باپ کو اس کے بارے میں لکھا۔ ہگ بل کا جواب بہت دل شکنی والا تھا۔

”میں نے اُسے قطعی پسند نہیں کیا۔ ہنری بہت عام سے خاندان کا لڑکا ہے۔ معاشی طور پر بھی فیملی مطلوب نہیں۔ اور خود ہنری کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ اتنی کم تنخواہ میں میری بیٹی کا گزارہ نہیں ہوگا۔ یوں بھی وہ جوئے کا دلدادہ ہی نہیں بلکہ عادی کھیلنے والا ہے۔ تم خود سوچو جرٹروڈ میں تمہیں کسی جواری کے ساتھ تو نہیں بیاہ سکتا۔ ہمارا خاندان اعلیٰ و کٹورین اقدار کا حامل ہے۔“

خط ہاتھوں میں تھا مے اور اُسے پڑھتے ہوئے جرٹروڈ نے خود سے کہا تھا۔

”اف کاش مجھے اپنے باپ سے اتنی محبت نہ ہوتی اور میرا خاندان و کٹورین اخلاقیات اور روایات کا ایسا سیر نہ ہوتا۔“

تاہم اُس نے رد عمل کے طور پر کچھ نہیں کہا۔ منگنی توڑی اور واپس انگلینڈ چلی گئی۔

پر وہ بہت غمزہ تھی۔ دل شکستہ سی۔ فلورنس سوہیلی ماں جانتی تھی کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک لڑکی ہے۔ وہ خود بھی پلے رائٹ تھی۔ شاید اسی لیے اُس نے کہا۔

”تمہارا باپ تمہارے لیے ہیرا سے لڑکے کا متغنی ہے۔ اس ڈپریشن سے باہر نکلواؤ لکھو۔ تم نے ایران کا چہرہ چہرہ دیکھا ہے۔ یہ سب لوگوں کو دکھاؤ۔“

آہستہ آہستہ اُس نے خود کو آمادہ کیا اور Persian pictures لکھی۔ پہلی کتاب ہی نے اُسے بطور لکھاری مستند کر دیا تھا کہ اس کے انداز بیان میں جذب کرنے کی

فراوانی تھی۔ فارس مغرب کیلئے اتنا زیادہ مانوس نہ تھا۔ اُس کی تحریر ایران کے شاندار ماضی کی اساطیری کہانیوں کے بیچ و خم سے گزرتی قاری کو اُس کی عظمتوں سے مرعوب کرتی اُس کے موجودہ زوال اور اسباب سے آشنا کرتی تھی۔ ایران کے چہرے پر نمایاں اُسکی سیاسی تہیں، اُس کا اسرار، اس کا طرز تمدن، خواتین کے رویے، اُن کی بود و باش، اُن کا حُسن جمال، زمین کا قدرتی اور اس پر انسانی ہاتھوں کا دیا گیا حُسن، محرم اور رمضان کی رونقوں کی تفصیلات دلچسپی سے معمور پڑھنے والے کو قید کرتی تھیں۔

مذہبی تہواروں کی تفصیلات میں اسلام اور عیسائیت کے تقابلی جائزے میں دونوں مذاہب کے فرق اور مماثلتوں کی تفصیلات حیران کن تھیں۔

یہ ایک ایسا سفر نامہ تھا جس میں مشرق کی دنیا اپنی چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور رازوں سے سامنے آئی تھی۔

اس کی دوسری تخلیق Poems from Diwan Hafiz 1897 میں شائع ہوئی۔ جو اُس کی فنی مہارت کا ایک اور ثبوت تھی۔

باقاعدہ ترجمے سے پہلے پیش لفظ میں اُس نے حافظ کی زندگی کے نمایاں پہلو اور ان کے کام کا تنقیدی جائزہ لیا۔ نظموں کے ساتھ ساتھ لکھے گئے اس کے نوٹس میں حافظ کے ہم عصر شعرا کے تقابلی جائزوں میں اُس کے اندر کے علم کی وسعت اور گہرائی کھل کر سامنے آئی۔ کہیں وہ اُس کا موزانہ Dante دانتے سے کرتی ہے۔ کہیں وہ اُسے کونسے سے جوڑتی ہے، اور کہیں Villon سے۔ کہیں خیالات کی رو میں اُسے احساس کی وہ جھلک نظر آتی ہے جو مغرب کی مشرق سے inspiration سے جڑتی ہے۔

یہاں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس کی موت کے بعد بیسویں صدی کی وسطی دہائی میں ایک پبلشنگ ادارے نے اس کی اس کاوش کو حافظ ایک عظیم صوفی شاعر، حافظ کی

تعلیمات، حافظ کے حالات زندگی وغیرہ کو مختلف عنوانات کے تحت اسی نوے کے صفحات پر مشتمل خوبصورت فارسی خوشخطی کے ساتھ ساتھ مختلف کتابوں کی صورت شائع کیا جو بہت پسند کی گئیں۔

وہ حافظ شیرازی کی بہت مداح تھی۔ حافظ کے بارے میں اُس کا اپنے والد کو ایران سے لکھا گیا ایک خط شاعر کی عظمت اور اس کے کمال فن کا ثبوت ہے۔

لکھتی ہے۔

”میں جیسے جیسے ”حافظ“ کو پڑھ رہی ہوں حیرتوں میں گم ہوتی جا رہی ہوں۔ ہم کیسے لوگ ہیں جو اُس کے مقام سے ہی آگاہ نہیں۔ اُس کی نظموں میں موسیقیت کا ایسا رچاؤ ہے کہ آپ کا جی انہیں بے اختیار گنگنا تے رہنے کو چاہتا ہے۔ دنیا کا مقبول ترین اور محبوب ترین جسے شاعروں کا شاعر اور Tongue of the invisible کہنا چاہیے۔ میں اُس کے دیوان کا ترجمہ کروں گی تاکہ مغرب اُسے جان سکے۔“

جب وہ دیوان حافظ کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھی اُسے معلوم ہوا تھا کہ ہنری نمونہ سے فوت ہو گیا ہے۔

چند لمحوں کیلئے اُسے ماحول اور اپنا وجود یکسر ساکت محسوس ہوا تھا پھر جیسے اُس کے لبوں نے خود سے سرکوشی کی تھی۔

”دیکھو ابھی تو سال ہی گزرا تھا اور وہ دنیا سے بھی چلا گیا۔“

بہت دنوں وہ حافظ کے شعروں کو پڑھتی خاص طور پر اُس کے ان اشعار کو زیر لب گنگنائی رہی۔ غم زدہ ہوتی رہی۔

بلبل کے دل سے نکلے خون کے قطروں نے

سُرخ گلاب کو زندگی دی

اُسے تو امانی دی

اے موت کی ہواؤ

تم تو میری امیدیں بھی لے اڑیں

پھر پہاڑ اور ان کی مہم جوئی نے توجہ کھینچ لی۔ پہلے فرنجی افس کی Meije چوٹی سر
کی تو حوصلہ بڑھا بعد میں سوئس افس نگاہوں میں آ گئے۔

اس نے بہت سی چوٹیاں سر کیں۔ ایک کو تو اُس کا نام بھی دیا

گیا۔ Gertrudspitze

اکتیس سال کی عمر میں اُس نے مشرق کا رخ کیا۔ یروشلم اور دمشق میں اُس کی
سہیلیوں نے اُسے لکھا تھا۔

”تم آؤ یہاں۔ بہت حیران کن تجربات سے ملو گی۔“

اب وہ نئی زبانیں سیکھنے میں جُت گئی۔ اُس نے ٹرکش سیکھی، عبرانی اور عربی میں
مہارت حاصل کی اور یروشلم آ گئی۔

مڈل ایسٹ اُس کیلئے تحیرات کی سر زمین تھی۔ شہروں کی سیاحت کے بعد وہ
صحراؤں میں نکلی۔

افلاق نے کافی کا آرڈر دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے پر بھی ایسی عورت نہیں ملتی۔ مشرق وسطیٰ
کے صحراؤں کی سردی اور گرمی دونوں انتہاؤں پر۔ وجود کو جلانے اور بچھند کرنے والی موسمی
شدتیں۔ کیا شیر دل عورت تھی؟ گھوڑوں، فخریوں، ہادرچی، گائیڈ، خیمے، کتابیں نقشے اور دیگر
سیاحتی لوازمات کے ساتھ نکل پڑتی۔

سر پر دھڑے ہیٹ کے ساتھ کفالیہ سے سر ڈھانپتی۔ لمبے سکرٹ پہنتی۔ چہرے پر

جالی دار نقاب ڈالتی اور صحراؤں میں سے گزرتے ہوئے مقامی قبائلی سرداروں اور شیخوں سے ملتی۔ ہمیشہ پر ڈوکول کا دھیان رکھتی کہ اُسے شیخوں کے سامنے کیسے پیش ہونا ہے؟ اور انہیں کیسے عزت و تکریم دینی ہے؟

وہ زیادہ وقت مقامی لوگوں کے ساتھ گزارتی۔ فرانسے کی عربی بولتی۔ جگہوں کے بارے جاٹکاری حاصل کرتی۔ اُن کے خیموں میں، اُن کے گھروں میں، اُن کے سے انداز میں چوکڑی مار کر بیٹھتی۔ انکی تاریخ، اُن کے رسم رواج سے آگاہی حاصل کرتی۔ گاڑھے اور کیسلے قبوے کے گلاس پر گلاس پیتی۔ بڑی سی سینی میں روست بکرا اور چاول جنہیں وہ اُن کے ساتھ ہی قالین پر بیٹھ کر ہاتھوں سے کھاتی اور انگلیاں چاٹتی۔

مڈہف (مہمان گھر جو زسلوں اور چیوٹ کے ریشوں سے بنایا جاتا ہے) میں ٹھرنا اُسے بہت پسند تھا۔ جب بھی ایسا موقع آتا وہ اپنے میزبانوں سے stuffed بکرے کی فرمائش کرتی جو اُس کی دم اُس کے منہ میں ڈال کر اُس کی آنکھیں نکالے بغیر روست کیا جاتا تھا۔ سگریٹ پیتی اور حقے کے کش بھرتی۔ اکثر بون فائر میں ان کے ساتھ ڈانس کرتی، گانے گاتی۔ وقت رخصت انہیں قیمتی تحائف اور قیمتی بندوقوں سے نوازتی۔

وہ حیرت سے اُسے دیکھتے۔ ایک اکیلی نوجوان خوبصورت عورت تن تنہا اتنے شدید موسم میں کیسے سفر کرتی ہے؟ بل تو اب یہ بھی جان گئی تھی کہ گھڑسواری کے دوران گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے اُونگھ کیسے لی جاتی ہے؟ کونین اف دی ڈیزٹ کا خطاب اُسے ان ہی قبائلی سرداروں اور شیخوں نے دیا تھا۔

The Desert and the Sown بھی اُس کا ایک بے مثل تاریخی

شاہکار ہے۔ جو تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ تقریباً ڈیڑھ سوا انتہائی اعلیٰ درجے کی تصویروں سے مزین ہے۔

وہ ایک بڈر، دلیر، جی دار اور وسائل رکھنے والی سیاح تھی۔ اُس کا بڑا مقصد کرداروں کا مطالعہ، جگہوں کا مشاہدہ اور رسم و رواج سے آگاہی تھی۔

جگہوں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ اُس کا زیادہ فوکس لوگوں پر رہا۔ ان کے اطوار و کردار پر اُس کی گہری نظر اور عورت ہونے کے ماطے عائلی زندگی کے بہت سے پہلو جنہیں پردہ دار روایتی اسلامی معاشرے میں صرف ایک عورت ہی دیکھ سکتی ہے۔ اُس نے انہیں دیکھا اور پوری تفصیل سے زیر تحریر لائی۔ ان قبائلی معاشروں کی یہ وہ حقیقی تصویر تھی جس نے اُسے باقی سیاحوں سے منفرد کیا کہ تہذیبی اور تمدنی زندگی کا ایک اہم پہلو گھریلو معاشرت ہوتی ہے۔ دیواروں کے اندر کی زندگی کیسے سانس لیتی ہے اور اُسے کیسے بسر کرتی ہے۔ عورت ہونے کے ماطے جرٹوڈ نے عرب قبائلی زندگی کو اس کے پورے رنگوں سے دیکھا اور اُسے بیان کیا۔

قدرت نے اُسے ایک خاص نوع کی حس مزاج سے نوازا تھا۔ پہاڑوں اور صحراؤں کے لوگوں سے اپنے اسفار کے دوران ملاقاتوں میں وہ اپنے مخاطب سے لفظوں کا ایک ایسا ڈرامائی کھیل کھیلتی کہ اُن کی شخصیت کھل کر سامنے آ جاتی۔ کسی منظر کا بیان ہو۔ کسی شخص سے گفتگو ہو۔ آٹا و قدیمہ کے کسی حصے کی روندار ہو۔ منظر آنکھوں کے سامنے مجسم ہوتے تھے۔

Amurath to Amurath اُس کا ایک اور شاہکار سفر نامہ ہے جو حلب سے شروع ہو کر دریائے فرات کے ساتھ ساتھ چلتا دیا بڑک Diyaberk سے قونیہ تک جاتا ہے۔

The Thousands and one churches جیسی کتاب ولیم ایم ریمزے اور اس کی مشترکہ کاوش سے لکھی گئی۔ اس کی تصاویر اور تفصیلات ایسی معلومات

فراہم کرتی ہیں جو بہت قیمتی ہیں۔ آغاز کے بازنطینی اور عیسائیوں کے اناطولیہ کے ریجن میں پوسٹ کلاسیکل یا دگاریں جن میں بہت سی اب مایید ہیں۔ اور جو ہیں اُن کے نئے نام ہو گئے ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ ان علاقوں سے، بغداد اور عراق سے محبت کرتے کرتے اُسے ایک جیا لے سے محبت ہو گئی۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہ برٹش تھا۔ اُس کی چوڑی چھاتی تمنوں سے سچی ہوئی تھی۔ بڑا بہادر، جیالا، دلیر اور دلبر سا مشرق وسطیٰ میں برٹش آرمی کا میجر چارلس ڈوگی ولی Doughty Whlie۔

دونوں مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھے تھے۔ دونوں کی دلچسپیاں اور شوق ملتے تھے۔ جرٹروڈ کو اپنے اندر بہت ہیجان بھری کیفیات کے مد و جز رکا احساس ہوا تھا۔ چارلس میں وہ سب کچھ تھا جس کے خواب جرٹروڈ جیسی خاتون دیکھتی تھی۔ ایک آئیڈیل مرد۔

مگر یہ کیسا المیہ تھا کہ وہ شادی شدہ تھا اُس کے اندر سے ہوک سی اٹھی تھی۔ تاہم پھر بھی وہ خود کو اس کی محبت میں گرفتار ہونے سے روک نہ سکی۔ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے تو لمبے لمبے خط لکھتے۔

جرٹروڈ کے خطوط ایسے شاہکار ہوتے کہ جنہیں وہ بار بار پڑھتا اور اُس کا جی نہ بھرتا۔ پندرہ ہزار خط جو اُس نے اپنے والد، والدہ، سہیلیوں اور چارلس کو لکھے۔ یہ وہ آئینہ تھا جس میں اُس زمانے کے سارے عکس موجود تھے۔ برطانیہ اور اس کے حواریوں کی چالیں، ریشہ دوانیاں، لارنس آف عربیہ اور چرچل کے کردار۔ مقامی آبادی، مذہبی رہنماؤں کے باہمی اختلافات، کمیونسٹ عناصر کا اثر و نفوذ۔ بغداد اور دمشق کے شب و روز۔ یہ خط نہیں تاریخ تھے۔ اس کے علاوہ سولہ ڈائریاں۔ خطوط کو پانچ چھ والیوم کی

صورت میں چھاپا گیا۔ اور یہی صورت ڈائریوں کی ہوئی۔ مغرب کا عام قاری تو انگشت بدندان تھا۔ اُسکے تحریری شہ پاروں نے مشرق کو اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ جنگی جرنیلوں اور سیاسی ممبروں کیلئے اُس میں جاننے اور سمجھنے کیلئے بہت کچھ تھا۔

یہی وہ دن تھے جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور جرٹروڈ نے سوچا اس کے مادر وطن کو اس وقت اس کی ضرورت ہے۔ وہ فرانس پہنچی۔ ریڈ کراس میں رزمیوں اور گرم شدہ سپاہیوں کے اندراج کرنے کی ڈیوٹی دینے لگی۔

ایسے ہی دنوں میں اُسے چارلس کا خط ملا۔ اُس نے لکھا تھا۔
 ”میں تمہیں مس کر رہا ہوں جرٹروڈ۔ ملنا چاہتا ہوں۔ اگلے چند دنوں تک مجھے گیلی پولی کے فرنٹ محاذ پر جانا ہے۔“

چار دن انہوں نے لندن کی گلیوں، سڑکوں پر گھومنے پھرنے، ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنے ریسٹورنٹوں میں کھانے کھانے میں گزارے اور پھر جدا ہوئے۔

مئی کے پہلے ہفتے کے آخری دنوں میں جرٹروڈ لندن آئی تھی۔ خوبصورت موسم کا سارا حسن جنگ کے بادلوں میں گم ہوا پڑا تھا۔ لندن ریڈ کراس آفس میں جب وہ فائلیں دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً آفس کی انچارج نے باتیں کرتے کرتے جزیرہ نما گیلی پولی کے محاصرے میں اُن برٹش سینئر آرمی افسروں کی ہلاکت کا ذکر کیا تھا جن کے بارے میں اطلاعات کل شام موصول ہوئی تھیں۔ بریگیڈئیر جنرل اور بریگیڈئیر میجر کے مرنے کے بعد کمان لینے کی ضرورت تھی۔ تاہم اپنی تمام تر دلیری کے باوجود وہ اور اس کے ساتھی مارے گئے۔ وہ ساکت بیٹھی اُس کے لبوں کو ہلتے دیکھتی تھی۔ اندر اٹھتے طوفان کے جھکڑوں کی شدت کے کسی ہلکے سے عکس کو اُس نے چہرے پر پھیلنے نہیں دیا۔

اور جب روزمرہ کے اس کوفت بھرے تھکا دینے والے ڈیسک ورک کو نپٹا کر

وہ ۹ غ اٹھی۔ اُس نے لمبی آہ بھر کر خود سے کہا تھا۔

”محبت میرے نصیب میں نہیں۔“

جیسے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

اور وہ بغداد آ گئی۔

”یہ کیسی حیرت انگیزی بات ہے۔ مشرق نے میرے دل کو گھائل کر دیا ہے۔ مجھے ہمیشہ اس کی خوبصورتی اور سحر جکڑ لیتا ہے۔ گھر تو وہاں ہے جہاں تمہارا دل ہے۔ میں خود سے پوچھتی ہوں۔ میرا دل کہاں ہے؟“ بغداد میں۔ مجھے بغداد سے اتنی محبت ہے کہ بغدادیوں کو بھی نہیں ہوگی۔ کوئی بغدادی اسکے سُسن کو اُن نظروں سے نہیں دیکھتا جن سے میں اسے دیکھتی ہوں۔ دریا کی خوبصورتی، پام کے باغوں کا سُسن، کھجور کے درختوں کا بانگین، صحرا کی دل آویزی۔“

یہ اپنے والد کو اُس کا لکھا ہوا ایک خط تھا۔

اور یہ 1916 کے دن تھے۔ برٹش آرمی بصرہ پر قابض ہو چکی تھی۔ مگر اُسے بغداد آنے میں بہت دشواریاں نظر آرہی تھیں۔ ہائی کمان اُس کی صلاحیتوں سے آگاہ تھی۔ ان علاقوں میں اُس کی ہر دل عزیزی سے واقف تھی۔ مقامی بااثر لوگوں سے اُس کے رابطوں کو جانتی تھی۔

”ہمیں محفوظ راستے بتاؤ۔ بغداد تک پہنچنے میں تمہاری رہنمائی چاہیے۔“

جنرل کلین Clayton کا پیغام اُسے ملا تھا۔

اُس نے نقشے اور ڈائریاں اٹھائیں اور بصرہ پہنچ گئی۔ برٹش آرمی کم سے کم جانی و مالی نقصان اور مزاحمت کے بغداد پر قابض ہو گئی تھی۔ برطانیہ کی ہائی کمان نے اُسے باقاعدہ اورینٹل سیکریٹری کا درجہ دیا۔

برطانیہ اٹلی جنس سروس کو اس کی صلاحیتوں کا بہت اچھی طرح علم ہو گیا تھا کہ عربوں سے ڈیل کرنے میں انہیں اس کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ اُس کا زبان پر عبور اور صحرائی قبائل کے بارے علم منفرد تھا۔ عراق کے ساتھ اور ہاشمی خاندان کے ساتھ ہر حال اسکی ہمدردیاں تھیں۔ شریف مکہ کے بیٹوں فیصل اور عبداللہ کو عراق اور اردن کے بادشاہ بنانے میں اُس کا بنیادی کردار تھا۔

برطانوی مینڈیٹ کو پس پردہ قائم رکھنے اور عراقیوں کو فرنٹ لائن پر رکھنے میں اُسے اصرار تھا۔ قاہرہ کی کانفرنس میں وہ واحد خاتون عورت تھی جسکی نئے ملکوں کو بنانے اور مستقبل کی صورت پر دو ٹوک حتمی اور قابل عمل رائے تھی۔ مسو پویمیا کا چیف پرسی کوکس اور وائس چیمپل اُس سے متفق تھے۔

کنگ میکنگ جیسے مشکل مرحلوں سے گزرنے، اختیارات عراقیوں کو منتقل کرنے میں اُس کی حیثیت لازماً کلیدی رہی تھی۔ "الحاتون الحاتون" کہتے عراقیوں اور "ام المومنین" کہتے کہتے شامیوں کی زبانیں خشک ہوتی تھیں۔ بے تاج ملکہ جیسی حیثیت تھی۔

پران مرحلوں کے بعد تلامذہ خیز زندگی میں تھوڑا سا شہراؤ آگیا۔ ڈپریشن کا شکار ہوئی مگر اُس نے اپنی دلچسپیاں آرکیالوجی میوزیم بنانے میں ڈھونڈ لیں۔ ایک بہت بڑے کام کی تکمیل ہو چکی تھی۔ اور یہ سال 1926 تھا۔ اور وقت بہت بدل گیا تھا۔ بادشاہ کو اس کی ضرورت کم کم محسوس ہوتی تھی۔ اُس نے خواب آور کولیاں زیادہ کھائی تھیں۔ جو جان لیوا ثابت ہوئیں۔ اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئی۔ یہیں بغداد میں برٹش قبرستان میں دفن ہے۔

مگر کہانی ختم کرنے سے قبل افلاق نے کہا تھا۔

”ایک عجیب سی بات ہے کہ پچاس سال کی عمر میں وہ تیسری محبت میں مبتلا ہوئی۔ افلاق نے کہانی ختم کر دی تھی پر میں ساکت بیٹھی تھی تیسری محبت یہ ایک اور

حیرت انگیز انکشاف تھا۔ یوں بھی عورت ہونے کے ماطے اس کی زندگی کے کچھ خاص حصوں کے بارے میں میں بہت متحسّ تھی۔ اُن کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

دفعۃً میرے ذہن میں برق سی کوندی۔ بغداد کی ایلٹ فیملی کی عورتیں جن کے ہاں بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی میں اُس کا آنا جانا اور میل ملاقات تھی انہیں ڈھنڈوا جائے۔ کو 1920 اور 2007، درمیان کا بہت سا وقت۔ بغداد کے پلوں کے نیچے تو ڈھیروں ڈھیروں پانی گزر چکا ہے۔ کھوج کروں گی بھی تو اس کی کوئی ساتھی ملنی ناممکن۔ مگر شاید کہیں ایک نسل سے دوسری اور تیسری تک کسی تعلق، کسی واسطے، کسی فخریہ اعزاز کے ساتھ کوئی اہم، کوئی خاص واقعہ، خاندان میں گردش کرتا رہا ہو اور کوئی راوی کچھ رازوں سے پردہ اٹھا دے۔

”اب اس کی قبر دیکھنی تو بہت ضروری ہو گئی ہے۔“ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا تھا۔
 ”وہ کون سا مسئلہ ہے۔ آرٹیفین چرچ کے پاس ہی باب شورجا Shorja کے نزدیک ہے۔ شام کو کسی بھی وقت چلے چلیں گے۔“

وہ دن بھر میرے ساتھ رہی تھی۔ میں نے طے کیا تھا کہ جیسے میں پرانے دمشق اور حلب کے گلی کوچوں میں عالیشان گھروں کے کھلے دروازوں سے اندر داخل ہو جاتی تھی۔ رنزل، وسیب کے سارے نظاروں کے مزے لوٹتی تھی۔ اکثر کھانا بھی ان کے دسترخوان پر کھاتی تھی۔ یہ طریقہ یہاں بھی آزماؤں۔ مگر دو قباحتیں سامنے تھیں۔ موسم کی شدت اور بغداد کے مازک حالات۔ پاکستان کا سُسن کر کہیں وہشت گردوں کی ساتھی جان کر ہی نہ دھتکار دی جاؤں۔ بہتر ہے کہ افلاق کی مدد لوں۔

میرا مسئلہ شاید افلاق کی سمجھ سے باہر تھا۔ بیٹے جیسے لڑکے سے میں کیا کھل کر بات کرتی کہ میرے اندر کون سا نسوانی اسرار جاگا ہوا ہے۔

میں ہوئی آئی۔ اتفاق ہی تھا کہ مردان سیٹ پر تھا۔ میں نے اُسے آج کی کارگزاری سے مطلع کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

میری بات کا جواب دینے سے پہلے اُس نے ستائشی انداز میں کہا تھا۔
 ”کیا عورت تھی؟ اپنے وقت کی ذہین ترین اور چالاک ترین جس کا دماغ دنیا کے کسی جینس مرد کا تھا وہ اس علاقے کے پچے پچے کو جانتی تھی۔ ایک بار ہمارے میسوپوٹیمیا کے ایک ممتاز شیخ سے اُس کے علاقے کی جغرافیائی حدود کے متعلق پوچھا گیا۔ اُس نے کہا تھا۔“

”جرٹروڈیل سے پوچھو۔ ڈوب مرنے کی بات تھی مائیں خوں کیلئے۔“
 میری خواہش کا اُس نے کہا تھا۔

”مشکل لگتا ہے۔ دراصل ہمیں اس کے بارے تھوڑی بہت معلومات اس لیے بھی ہیں کہ ہم سیاحتی پیشے سے منسلک ہیں۔ مگر نہ عام لوگ نہیں جانتے ہیں۔ یوں عراق کے ممتاز احمد شیلابی خاندان کی بزرگ بی بی جو صدام سے پہلے کے بغداد کی معتبر اور امیر ترین عورت شمار ہوتی تھیں اور اعظمیہ کے ڈیر Deer پلیس میں کسی ملکہ کی طرح رہتی تھیں۔ اُن کے ہاں اُس کا بہت آنا جانا تھا۔ اس خاندان کی لڑکی متارہ بھی بہت سرگرم ہے۔ ممکن ہے وہ کچھ جانتی ہو۔“

میری بے تابی اور شبہ کی کچھ یہ عالم تھا کہ بس نہ چلتا تھا ابھی اٹھ کر منصور سٹی چلی جاؤں جہاں اُن کا محل نما گھر ہے۔ مردان مزید بتا رہا تھا۔

”گذشتہ سال اُس نے کورا قبرستان میں جرٹروڈ کی قبر کے آس پاس یا سمن کے پودے اور کچھو کے بیٹھار درخت لگوائے تھے۔“

منصور ڈسٹرکٹ گرین زون سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ بغداد کی ہائی کلاس

سماجی زندگی کا ایک اہم حصہ یہاں رہائش پذیر تھا۔ یہ ڈپلومیٹ، بزنس کلاس اور اعلیٰ درجے کے ہنرمندوں کا بھی گھر تھا مگر بمبوں کے دھماکوں kidnapping اور رُسّی تشدد پسندوں نے اسے غیر محفوظ بنا دیا ہے۔

منصور میں تمارہ شیلابی سے تو ملاقات نہ ہوئی کہ وہ استنبول گئی ہوئی تھی۔ ہاں البتہ اس کے محل نما گھر کے سیکورٹی گارڈوں اور اسلحہ بردار محافظوں سے ضرور ملاقات ہوئی جنہوں نے مجھے پاکستانی جان کر مسکراہٹیں بکھریں اور افسوس بھی کیا کہ وہ اپنے پاکستانی مہمان کی خدمت سے قاصر رہے۔

تاہم بغداد پریس کلب میں حسین السیدی جیسے صاحب علم لکھاری اور صحافی سے باتیں ہوئیں۔ حالات حاضرہ سے متعلق بہت سی باتوں کے بعد جب میں نے جرٹو ڈبیل کے تیسرے عشق والے موضوع کو چھیڑا اور مروان اور افلاق کی گفتگو سے حاصل کردہ ابن سعود بن عبدالعزیز اور شریف مکہ کے بیٹے امیر فیصل کے نام ان کے سامنے رکھے۔

”ابن سعود“

اُن کے کول مول سے چہرے پر نفی کے بھرپور تاثرات بکھر گئے۔ میں نے فوراً کہا تھا۔

”ابن سعود کے بارے میں تو بہت اونچی رائے رکھتی تھی وہ۔ اُس کا اعتراف تھا کہ اپنے ہم عصر لیڈروں میں وہ بہت منفرد تھا۔ کہیں وہ اُس کی شاندار قامت اور وجود بارے رطب السان تھی اور کہیں اس کے بھاری پوٹوں کے نیچے اس کی سنجیدہ اور ذہین آنکھوں، سپاہیانہ دلیری و شجاعت اور سیاسی بصیرت کے گن گاتی تھی۔

”تو اس کا مطلب ہے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ بس محبت میں گرفتار ہو گئی۔ بھی سمجھو وہ ایک عظیم لکھاری بھی تھی۔ کرداروں کو حسن و خوبی سے بیان کرنا جانتی تھی۔ یوں بھی

ابن سعود اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس کی تیز اور نیکی آواز سے اُسے کوفت ہوتی تھی۔ جب وہ بے تکلفی سے اُسے کہتی۔

”عبدالعزیز۔ عبدالعزیز دیکھو اسے۔ اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ابن سعود کو کوفت بھرے انداز میں بات کوٹال جاتا تھا۔

ہاں فیصل کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے مگر میں اسے قربت رفاقت کے تعلق کا نام دیتا ہوں۔ اس کی چند وجوہات بھی ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں ان فاتح اتحادیوں کی بندر بانٹ میں شام پر مسلط فرامیسوں نے تو فیصل کو دمشق سے سال بھر کے اندر ہی دھکا دے کر نکال دیا تھا۔ برطانیہ نے تھوڑی سی شرم و حیا کی۔ جرٹروڈ نیل نے اسے تین صوبوں پر مشتمل اس نئے ملک جس کی حدود کی لائیں خود اُس نے کھینچی تھیں پر بٹھایا۔ مقامی اشرافیہ اُس کی کچھ خاص حامی تھی۔ مگر درمیان میں جرٹروڈ نیل تھی جس پر عرب شیخ بھی اعتماد کرتے تھے اور برٹش کابینٹ cabinet بھی۔

عراقی جھنڈے کی ڈیزائن کاری دونوں نے مل کر کی تھی۔ بغداد کے ماضی سے اُس کی پوری جانکاری تھی۔ کالی پٹی عباسی دور، سبز پٹی امیہ اور سفید فاطمیوں کی نمائندہ بنی۔ اونچ نیچ، توڑ جوڑ کے سبق وہ سب اُس نے اُسے پڑھائے تھے۔ برطانیہ کی پشت پناہی بھی فیصل کو سو فیصد حاصل تھی۔ اور جس صبح فیصل کی رسم تاجپوشی تھی اُس نے تقریب کے اختتام پر کہا تھا۔

”یہ کنگ میکنگ تو زاعذاب ہے۔ اس کھینچا تانی نے مجھے تھکا دیا ہے۔“

ابھی اس بیاہ کاہنی مون پر یڈ چل ہی رہا تھا کہ جب شیعہ سنی عوام متحد ہو کر اس سامراجی غلبے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سارے میسوپوٹیمیا کے شہروں میں محمد

البعیدی کی شاعری کو نچ رہی تھی۔

اے عراقیوں اٹھ جاؤ اب

آگ لگا دو

خون سے ذلت کے دھبے دھو دو

ہم غلام ہیں؟

جو گردنوں میں طوق پہنیں

ہم قیدی ہیں جو پاؤں میں بیڑیاں پہنیں

ہم کیا عورتیں ہیں؟

جو آنسوؤں کو تھیار کھتی ہیں

ہم یتیم ہیں؟

کہ ہمیں عراق کیلئے مینڈیٹ چاہیے۔

جب ہوا ہیں اور فضا ہیں ایسی ہوں تو ظاہر ہے انحصار بڑھ جاتا ہے ہمہ وقت

مشورے رائے۔ یوں بھی فیصل عرب خواہ صورتی کا شاہکار نمونہ تھا۔ ایسے میں محبت تو ہو جاتی

ہے نہ۔ پالک کتے بلی سے بھی پیار ہوتا ہے نا۔

”بڑے المناک انجام سے دو چار ہوئی۔“ میرے لہجے میں گلے گلے تک ماسف

تھا۔

”ایسا ہی ہوتا ہے۔ بڑا مارل سالجہ تھا ان کا۔ بہت اونچے جا کر جب بندہ زمین

پر آتا ہے تو ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ ڈپریشن کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ فیصل کو اس کے

مشوروں کی ضرورت اب کم کم ہوتی تھی۔ برٹش ہائی کمیشن آفس میں نئے نئے لوگ آگئے

تھے۔ آرکیالوجی میوزیم اُس کا ایک بڑا کام مکمل ہو گیا تھا۔ وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ چین سموکر

تھی۔ پھیپھڑے متاثر ہو گئے تھے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہم جیسے لاکھوں بغدادیوں سے زیادہ بغداد کی تھی۔

پاکستان آ کر بھی وہ مجھے اکثر یاد آتی۔ میں تنہائی میں ایک سوال ضرور اپنے آپ سے کرتی۔ زندگی سے بھری ہوئی، آزاد معاشرے کی ایک مکمل عورت کیسے ممکن ہے کہ اُس کے اندر مرد کی قربت کی تمنا نہ چلی ہو اور اُس نے اسکی تکمیل نہ کی ہو۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے جم خانہ لائبریری سے جارجینا ہوول Georgina Howell کی کتاب The Queen of the Desert ملی۔ اپنے کزن کی ممبر شپ پر میں نے اسے ایٹو کروایا۔

پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتی گئی پڑھتی گئی۔ پھر رُک کی۔ ایک بار، دو بار، تین بار پڑھا۔ چوتھی بار اور پانچویں بار کا پڑھا ہوا آپ بھی پڑھیے۔

یہ ذکر ہے اُس شام کا جو بادلوں سے بھری ہوئی تھی۔ جرٹروڈ چارلس سے مل کر لندن میں اپنے ذاتی اپارٹمنٹ میں کوئی گھنٹہ بھر پہلے آئی تھی۔ چارلس ڈوگی کو آج رات دس بجے کی ٹرین سے محاذ پر جانا تھا۔ ڈیرینگ ٹیبل کے سامنے سٹول پر بیٹھی وہ اپنے بالوں میں لگی پنیں نکال رہی تھی جب اُس نے ایک نرم اور دھیمی سی دستک سُنی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ چارلس مسکراتے ہوئے اندر آیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ چپ چاپ۔ جرٹروڈ سے کہا ہی نہیں گیا کہ ابھی تو میں تمہیں رخصت کر کے آرہی ہوں۔ لباس بھی تبدیل نہیں کیا۔ پھر چارلس کے توانا بازوؤں نے اُسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

”جرٹروڈ! یہ نہیں کیوں لگتا ہے تمہیں شاید پھر نہ دیکھ سکوں۔ تین گھنٹے کا مارجن تھا۔ جی چاہ رہا تھا یہ وقت بھی تمہارے ساتھ گزاروں۔“

اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور بازوؤں کے ہالے میں سمیٹتے ہوئے اُس نے اُسے بھی ساتھ ہی بیٹھا لیا۔ پھر وہ لیٹ گیا۔ اُس نے اُسے بھی اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اُس کے ماتھے اور پھر اُس کے گالوں پر بو سے دینے کے بعد جب وہ ذرا سا آگے بڑھا تب اُس کے بازوؤں میں گھرے اُس کی محبت کی گرمی میں پگھلنے اور ڈوبنے کے بجائے اُس نے دھیرے سے سرکوشی میں کہا تھا۔

”نہیں۔ چارلس نہیں۔ ہرگز نہیں۔“

پھر اُس نے اُس کے والہانہ بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو آہستگی سے پیچھے ہٹاتے اپنے جسم کو اکڑاتے، اس کی گرفت میں سے نکلتے اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”چارلس میں ورجن ہوں۔“



جان کیٹس

پانیوں پر لکھے ہوئے نام والا

- کیمس، شیلے اور بارن کو میں نے اپنی بیٹی کے ساتھ پڑھا اور ان کی محبت میں
گرفتار ہوئی۔
- جوزف سیورن جیسا پرستار بھی کہیں مقدروالوں کو نصیب ہوتا ہے۔
- فیٹی براؤن سے اُسے محبت نہیں عشق تھا۔
- ستارے جیسا بننے کی تمنا اور لافانی ہونے کی خواہش۔

روشن ستارے

روشن ستارے کاش میں آرٹ کی طرح امر ہو جاتا

میں بھی فطرت کے کسی رسیا کی طرح

جاگتے رہنے والے کسی رشی منی کی طرح

رات کے خوبصورت جلووں میں کبھی اکیلا تو نہ ہوتا

اس ابدی حسن کو آنکھیں کھول کھول کر دیکھتا

دھرتی کے انسانی ساحلوں کے گرد

رواں پانیوں سے وضو تو کسی پادری کا ہی کام ہے

جان کیٹس شیلے میوزیم روم

یہ بتانا مشکل نہیں کہ سات سمندر پار والے اُس خوبصورت موٹی آنکھوں، کھڑی ناک اور گھنگریالے رومانوی کلاسیکل شاعر کیٹس سے میرا عشق کب شروع ہوا؟ بلکہ اس میں اگر تھوڑا سا اضافہ کروں تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس دوڑ میں اس کے دوست شیلے اور ہارن بھی شامل تھے۔ کیٹس ہمیشہ میری کمزوری رہا۔ تاہم شیلے بھی کم نہیں۔ ہاں البتہ اس رومینک ٹکون نمائش کا تیسرا سرا لارڈ ہارن کہیں تھوڑا سا پیچھے ہے۔

سچی بات ہے اس تفصیل کے ساتھ میں نے کہاں پڑھنا تھا انہیں اگر میری بیٹی انگریزی ادب میں ماسٹرز نہ کرتی اور کینیڈا کالج میں لڑیچر کی مس کوثر شیخ اُس کی استاد ان شاعروں کی عاشق صادق نہ ہوتی۔ اُن کے عشق میں ڈوبے اس کے طویل لکچر اور آئے دن کی آسائش منتوں نے بیٹی کے ساتھ ساتھ اُس کی ماں کو بھی پڑھنے ڈال دیا تھا۔

اسلامیات اور تاریخ جیسے مضامین کے ساتھ بی اے اور ایم اے کرنے والی ماں

کو احساس ہو گیا تھا کہ انگریزی ادب سے شناسائی اُردو ادب میں اپنا قد کاٹھ بڑھانے کیلئے کتنی ضروری ہے؟ اسی لیے چورمالوں پنڈ کاہلی کے مصداق بیٹی طالب علم سے زیادہ ماں اُستاد ریفرنس بکس کیلئے بھاگی بھاگی پھرتی تھی۔

مطالعے نے اُن کی زندگیوں کے ایک ایک گوشے سے شناسائی کروادی تھی۔ دل کی مسند پر البتہ دو نے توفیق نہ کر لیا تھا۔ ساری ہمدردیاں اور محبتیں سمیٹ لی تھیں۔ جان کیٹس اور پرسی Percy Bysshe Shelley دونوں جوانا مرگ۔ ایک تپ دق سے اور دوسرا ڈوب کر۔

روم اور یہیں وہ سپینش سٹیپ زوالا گھر جہاں کیٹس نے اپنی بیماری کے دن کاٹے اور ختم ہوا۔ شیلے بھی اٹلی میں ہی ڈوب کر مرا۔ دونوں دفن بھی روم کے پروٹسٹ قبرستان میں ہیں۔ ایک کی ہڈیاں اور دوسرے کی راکھ۔ پر کیٹس کی محرومیوں پر دل زیادہ کڑھتا تھا کہ "حسرت اُن غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔" تنہ کے نصیب میں کچھ بھی نہ تھا۔ محبوبہ کا پیار بھی نہیں کہ وہ بھی کم بخت بڑی دنیا دار اور بے وفائی۔

تو روم پہنچ کر دل کا وہاں جانے کیلئے مچلنا اور رھمکنہ سمجھ آتا ہے کہ عاشقوں کی زیارت گاہ ہے۔

راہنمائی کیلئے راگیر ہی دستیاب تھے۔ تندرست و توانا سے لوگ جنہوں نے سپینش سٹیپ زبا رے یوں ہاتھ ہلا کر گلیوں گلیوں سے جانے کا بتایا کہ جیسے یہ گلی کٹی اور اُس گلی کا موڑ مڑوں گی تو محبوب کے درآستانے کا دیدار ہو جائے گا۔ ہاں البتہ ایک معقول سے بندے نے سمجھایا کہ میٹرو سے جائیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔

”ہائے رہا اس میٹرو کے سیا پے نے جان نہیں چھوڑی۔“

بہر حال نیچے اُتری۔ چنچتی چنگاڑتی دنیا میں داخل ہوئی۔ زیادہ مشکل پیش

نہیں آئی۔ بڑی مہربان سی عورت نے ہاتھ تھام لیا تھا۔ تیسرے اسٹیشن پر اترنے کی تاکید تھی۔ چلیے یہ معرکہ سر ہوا۔

سپاگنا Spagna میٹرو اسٹیشن کے بل سے باہر نکلی تو خوشگوار مسرت بھری حیرت آنکھوں میں پھیل کر ہونٹوں پر بکھر گئی تھی۔ اتنا خوبصورت ماحول سامنے تھا کہ جی خوش ہو گیا۔

تھوڑا سا چلنے پر ہی میں spagna پیازہ سکوار میں کھڑی اپنے چاروں طرف پھیلی رنگ رنگیلی دنیا دیکھتی تھی۔ موتی اڑاتے Bernin's فوارے کے تعمیری حُسن نے سحر زدہ کرتے ہوئے کھڑا کر دیا تھا۔

”بھلا اس کا نام ”بد صورت کشتی والا“ فوارہ کیوں رکھا گیا تھا۔ یہ تو بڑی انفرادیت والا ہے۔“ سوال جواب خود سے ہوئے تھے۔ شاہوں کے مزاج اگر موڈی اور متلون ہوتے ہیں تو مذہبی راہنماؤں کا حال بھی کچھ اُن سے کم نہیں ہے۔ پوپ اربن ہشتم کی خواہش پر اس کی تعمیر ہی ایسی ہوئی تھی کہ دریائے ٹبر Tiber کے ایک سیلاب میں بہتی ایک بدرنگی بے ڈھیمی سی کشتی یہاں آگئی تھی اور پوپ اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔

ذرا سی نگاہیں اوپر اٹھیں۔ کیا نظارہ تھا۔ کشادہ سیڑھیوں کا ایک پھیلاؤ اپنے نقطہ عروج پر ختم کھاتے ہوئے ایک اور دل ربا سے منظر کا راستہ کھولتا تھا۔ ایک Obelisk ٹرینا مونٹی چرچ کے دو باروق سٹائل ٹاوروں کے سامنے بڑی آن بان سے کھڑی منظر کو عین درمیان سے کاٹتی تھی۔

چرچ دراصل فرانس والوں کا ہے۔ اللہ کی مخلوق اپنے من موہنے رنگوں کے ساتھ سارے میں بکھری ہوئی تھی۔ کہیں فوارے کے گر دیلیں ڈالتی، کہیں پتھروں کی لمبی قطاروں پر بیٹھی، کہیں سیڑھیوں پر ایک دوسرے کی بغلوں میں گھسی، کہیں سیڑھیاں چڑھتی، کہیں اوپر

سے نیچے اترتی، کہیں کیسروں سے کھیلتی اور کہیں بوس و کنار کے مزے لوٹتی۔ اتنے رنگوں کی افراط تھی کہ انہیں دیکھتے رہنا بھی ایک دلچسپ شغل تھا۔

یہ علاقہ تب انگلش گیٹو Ghetto کہلاتا تھا کہ آرٹ سیکنے کیلئے برطانیہ سے بہت سے آنے والے لوگ اسی علاقے میں رہتے تھے۔ روم تو یوں بھی مذہبی، تاریخی اور آرٹ کے حوالوں سے ایک خصوصی اہمیت کا حامل شہر کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ Eternal سٹی (ابدیت) کا نام اسی لیے تو اسے دیا گیا ہے۔ شیلہ اور ہارن بھی یہاں بہت آتے تھے۔ بہت سی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد رُک گئی ہوں۔ سستانا ضروری تھا۔ نظروں کو نظاروں کی تپش سے سیکنا اہم تھا۔ دل کو رجھانا کھانا بھی تو تھا۔ اور جب یہ سارے کام کر بیٹھی تو اب خود سے پوچھتی ہوں۔ مجھے جانا کہاں ہے؟ کیٹس کے میوزیم میں یا چرچ میں۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف اُسکا دلبر سامندہ۔

”ارے بھئی Trinita Monti چرچ کو کیا دیکھنا۔ اللہ کے گھر تو کم و بیش ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اُس دلبر کے پاس چلتی ہوں جس کے لفظوں سے محبت کے سامنے رومن بادشاہوں کا جاہ و جلال، اُنکی تاریخ اور انکی عظمتوں کی داستانیں سب بے معنی ہو گئی تھیں کہ بنگالی لڑکے مستفیض الرحمن نے کلوزیم colosseum بارے میں بھر میں گڈے باندھ دیئے تھے۔ پر میرا من چلا دل مائل ہی نہیں ہوا تھا۔

تو میں چارمنزلہ عمارت جو کہیں 1725 میں بنائی گئی تھی اور اس وقت کیٹس شیلہ ہاؤس کے نام سے روم کی ایک اہم قابل دید جگہ ہے اس کی دوسری منزل پر کیٹس میوزیم جانے کیلئے اٹھ جاتی ہوں۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر دل کا رانچھا تو راضی کر لیا تھا۔

اس کے نام کے ساتھ شیلے کے نام والا بڑا سا بورڈ عمارت کی پیشانی پر جگمگاتا ہے۔ کلاسیکل ڈیزائن کی کھڑکیاں بند ہیں۔ عمارت کے باہر سکوائر کا سارا منظر ہی بے حد

خوبصورت اور موہ لینے والا ہے۔ اندر جانے کیلئے لمبی قطار ہے جسمیں شامل ہو جاتی ہوں۔ مجھ سے آگے کھڑی لڑکی نما عورت بڑی ہنس مکھ سی ہے۔ کینیڈا سے شوہر نندا اور بچوں کے ساتھ آئی ہے۔ اور میری طرح سب سے پہلے یہیں آئی ہے۔

26 کا ہندسہ پلیٹ پر چمکتا دُور سے نظر آتا ہے۔ ایک چھوٹے سے دروازے کی گزرگاہ سے اندر داخلہ ہوتا ہے۔ اس کی دل کو بھگوانے والی نظم قدموں کے ساتھ ساتھ چلنے لگی ہے۔ ہلکی سی نمی بھی آنکھوں میں اتر رہی ہے۔

خوف و خدشات کے سائے جب مجھے گھیر لیں

اس سے پہلے کہ

میرا قلم میرے دماغ کی معذوری کا احاطہ کرے

اور کتابوں کے ڈھیر اور اُن کے اندر کی خوبصورتیاں

مجھے گرفت میں لے لیں

اس بھرے غلے کی کوٹھڑی کی طرح

جو کچے اناج سے بھری ہوتی ہے

جب میں رات کے چہرے کو دیکھتا ہوں

جیسے ایک دلکش رومانس کے دبیز بال ہوں

سوچتا ہوں کہ میں تو شاید

زندگی کے اس رخ کو دیکھنے کے لئے زندہ ہی نہ رہوں

ان کے سائے اتفاق کے جادوئی ہاتھ کے ساتھ

جب میں محسوس کروں

صرف ایک گھنٹے کی خوبصورت تخلیق

اور میں اسے اس سے زیادہ ندیکھ سکوں
 کبھی نہ منعکس ہونے والا پیار
 تب ساحلوں پر
 اس وسیع و عریض دنیا میں
 میں اکیلا کھڑا ہوں اور سوچتا ہوں
 محبت اور شہرت سب بیکار ہیں
 پس مر جاؤ

ادھر ادھر جانے کی بجائے سب سے پہلے اُس کے اُس کمرے میں جانے کی
 خواہش مند ہوں جہاں اُس نے آخری سانس لیں۔ پانچ یورو کا ٹکٹ۔ Attendent
 لڑکیاں بڑی خوبصورت اور ہونٹوں پر شہد جیسی مسکراہٹ بکھیرے ہوئے ہیں۔
 ایک قابل فہم چہچان کی سی کیفیت طاری ہے کہ کبھی روم آنے اور اس زیارت گاہ کو
 دیکھنے کی خوش بختی کا تو کہیں تصور ہی نہ تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے راہنمائی کر دی
 ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ میری دائیں بائیں کسی طرف کوئی توجہ نہیں۔ رک گئی
 ہوں۔ سانس کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ سامنے وہ کمرہ ہے۔ جس پر پتیل کی بڑی سی پلیٹ پر لکھا
 ہوا پڑھنے لگتی ہوں۔

In this room,

on the 23rd of February 1821

Died

John Keats

آنسوؤں کو پلکوں سے نیچے نہ اُترنے میں تھوڑی سی نہیں بہت کوشش کرنی پڑی

ہے کہ رُک کر گردن کو پیچھے لے گئی تھی۔

یہ کمرہ اس کے زمانے میں دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک مالک مکان اینا Angeletti کے تصرف میں اور بقیہ حصہ جسکا چہرہ میدان کی طرف تھا کیٹس اور جوزف سیورن کے پاس تھا۔

میں نے مارگریٹ (نگران) سے چند لمحوں کیلئے کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت لی ہے۔ وہ کمرہ جہاں وہ چھبیس سالہ خوبصورت آنکھوں، چہرے اور خوبصورت دماغ والا شخص موت کے ہاتھوں کی ظالم گرفت میں جکڑنا چلا گیا تھا۔ شیشوں سے پارسکوار میں زندگی کتنی خوش و غرم، ہستے، مسکراتے، قہقہے لگاتے نظر آ رہی ہے۔

میری تیسری آنکھ کھل گئی تھی جس نے ماہ نومبر کے کسی چمکتے خوشگوار سے دن کو سکوار میں بھاگتی بگیوں اور اُن میں بچے گھوڑوں کے سموں کی ٹھپ ٹھپ اُسے سناتے اور شیشوں میں سے زندگی کو آج ہی کی طرح رواں دواں دکھاتے ہوئے یقیناً اُسے اپنی صحت کے حوالے سے ایک نوید دی ہوگی۔ میٹھی سی اس نوید نے پل بھر میں گنگناتے خوابوں کو اسکی آنکھوں میں بیدار کر دیا ہوگا۔ وہ خواب جنہیں وہ جوان ہونے کے بعد سے دیکھتا چلا آیا تھا۔ مارگریٹ نے مجھے بتایا ہے کہ منظروں کی یکسانیت میں تب اور آج کے حوالوں سے کچھ زیادہ فرق نہیں۔ میں نے دیکھا تھا۔ بیگہیاں تو اس وقت بھی سکوار میں بعینہ اُن دنوں کی طرح بھاگتی دوڑتی پھر رہی تھیں۔

اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھنے والے سمجھدار اور ذہین لوگ اپنے تاریخی ورثوں اور اُن مخصوص روایات کو اسی ماحول سے ہم آہنگ کرتے ہوئے وقت کی چال کو اسی روپ میں نہلاتے ہوئے لوگوں کو مسرت و سرشاری سے نوازتے ہیں۔ اب میں مقابلہ "من و تو" میں کہاں کہاں کھیتی اور اپنا خون جلاتی۔

کمرہ اس وقت کتنا چمکتا دکلتا ہے۔ کھڑکی کے پردے کھینچے ہوئے ہیں۔ ڈیوڑھی
ماسک سامنے دیوار پر آویزاں ہے۔ ساتھ ہی چھوٹا سا شوکیس سجا ہے۔ ذرا فاصلے پر ایک بڑا
شوکیس اور درمیان میں آتش دان ہے۔ تب یہ کمرہ یقیناً ایسا شاندار تو نہ تھا۔ عام سی
دیواریں، چھت اور کھڑکی والا تھا۔

گلاب کے پھول جکتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ پھول تو آج بھی ہیں۔ یہ
ہاتھوں میں ہاتھ دیئے جوڑے اُس وقت بھی تھے جب نومبر کی سنہری اُترتی شاموں میں وہ
اپنے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اُتر کر سیر کیلئے بورگیز باغ Borghese جاتا۔ تب نیلے
آسمان پر پرندوں کی اڑانیں دیکھتے ہوئے کبھی اس کا دل غم سے بھر جاتا اور کبھی امید اُسے
خواب دکھانے لگتی۔

تصویر کی آنکھ کھل گئی ہے اور منظر کسی مازنین کی نشانی آنکھ کے خمار سے بھر گیا
ہے۔ میٹھی آواز کا جادو چاروں اور پھیل گیا ہے۔ ”A thing of Beauty“ میرے
لبوں پر آگئی ہے۔ دنیا بھر میں حسن و خوبصورتی کے حوالے سے ایک مثالی محاورہ بننے والا یہ
مصرع مصرع A thing of Beauty is a joy for ever اُسی شاعر کا ہی
ہے۔ جو لافانی ہونے کی تمنا رکھتا تھا۔

حُسن ہمیشہ رہنے والی ایک خوشی ہے
اس کی خوبصورتی بڑھتی رہتی ہے
یہ کبھی فنا نہیں ہوتی
ہمیشہ اپنے وجود کو قائم رکھتی ہے
جیسے یہ ہمارے لئے پھولوں کا کوئی پرسکون سنج ہو
یا نیند جو میٹھے خوابوں سے بھری ہو

جس میں تندرستی یا صحت اور خوشگوار

سانسوں کی مہک ہو

ایسے شعر کہنے والا بیٹھے خوابوں کا مفر دہ سنانے، صحت کا پیغام دینے اور مہکتے سانسوں کی روانی رواں رکھنے والا غموں کی بھٹی میں کیوں کر گر پڑا۔
اُسے فینی یاد آتی تھی جوں دن میں تھی۔ اسکی یاد اسکی آنکھیں بھگو دیتی۔ اُس کی محبت، مٹگنی اور پھر اسکی پیاری کا جان کر التفات بھرے اظہار میں اس کی بے رُخی اور بے نیازی جیسے رویے۔

مجھے بھی فینی یاد آئی تھی۔ بہت سی یادوں نے گھیراؤ کر لیا تھا۔

فینی ہمسائی تھی اس کی۔ بیوہ ماں کی پہلوئھی کی اولاد۔ سترہ اشہارہ سالہ ٹیار اور تینیس 23 چوبیس 24 سال کے جذباتی سے جو شیلے لڑکے کا پیار ہمارے دقتوں کے گلی کوچوں جیسا۔ سناٹھی دیواروں سے تا نکا جھانکی، چٹوں کی پھینکا پھینکائی اور چھوٹے بہن بھائیوں یا کزنوں کے ہاتھوں چوری چھپے خطوط کا تبادلہ۔ مٹگنی بھی کروائی تھی۔ پر یار دوستوں کا کہنا تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی ناقابل اعتبار ہے۔ مگر اس کا دل تھا کہ بے طرح لٹو تھا۔ ہر دوسرے دن لمبا چوڑا خط لکھنا ضروری ہوتا۔ ہر تیسرے دن محبت کی تجدید چاہتا۔

میری پیاری فینی کیا میں امید کروں تمہارا دل کبھی نہیں بدلے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے پیار کی کوئی انتہائی نہیں۔ دیکھو مجھے کبھی مذاق میں بھی دھمکی نہ دینا۔

ایک اور خط میں لکھتا ہے میں بہت حیران ہوتا ہوں کہ آدمی مذہب کیلئے مرتے ہیں تو شہید کہلاتے ہیں۔ میں تو سچی بات ہے اس خیال اور نظریے پر ہی تھڑا ٹھتا ہوں۔ میرا مذہب محبت ہے۔ میں صرف اس کے لیے مر سکتا ہوں۔ میں تمہارے لیے جان دے سکتا ہوں۔

ایک اور خط دیکھیے۔ محبت اور چاہت میں بھیگا ہوا۔ دنیا میں کیا کوئی چیز اتنی خوبصورت، چمک دار اور من موہنے والی ہے جتنی تم ہو۔

Bright Star یا دداشتوں سے نکل کر یوں پر آگئی ہے۔

روشن ستارے

روشن ستارے کاش میں آرٹ کی طرح امر ہو جاتا

میں بھی فطرت کے کسی رسیا کی طرح

جاگتے رہنے والے کسی رشی منی کی طرح

رات کے خوبصورت جلووں میں کبھی اکیلا تو نہ ہوتا

اس ابدی حسن کو آنکھیں کھول کھول کر دیکھتا

دھرتی کے انسانی ساحلوں کے گرد

رواں پانیوں سے وضو تو کسی پادری کا ہی کام ہے

کیسی خوبصورت شاہکار نظم۔ ابدی چمکنے والے ستارے جیسا بننے کی تمنا۔ لافانی

ہونے کی خواہش۔ اپنی محبت اور چاہت کا دل آویز اظہار۔

اس نے اپنے جنون، اپنی وارفتگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کے ساتھ

ابدیت کی ایسی خواہش کی جسے وقت اور حالات کبھی تبدیل نہیں کرتے۔ اس روشن ستارے

کی طرح جو اپنی جگہ پر ہمیشہ ساکت رہتا ہے۔ وہ تنہائی سے خائف اس کی محبت اور رفاقت

کیلئے بے قرار اور اس کے بغیر مر جانے کا خواہش مند۔ ستارے زمین اور پانیوں کے تشبیہاتی

استعاروں والی یہ نظم اعلیٰ شاعرانہ ذوق کی حامل جسے پڑھتے ہوئے ہم ماں بیٹی نے لطف

اٹھایا تھا۔

موت سے ایک سال قبل مئی 1820 کا خط ذرا دیکھیں۔

تم کتنی خود غرض ہو، کتنی ظالم ہو۔ مجھے خوش رہنے نہیں دیتی ہو۔ میرے لیے تمہاری محبت کی استقامت کے سوا کسی چیز کی اہمیت نہیں۔ تمہیں فلرٹ کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ مسٹر براؤن سے بھی یہی سلسلہ ہے۔ کیا کبھی تمہارے دل نے میرے بارے میں ذرا سا بھی سوچا ہے۔ مسٹر براؤن اچھا آدمی ہے مگر وہ مجھے انچ انچ موت کی طرف لے جا رہا ہے۔

اس کے بہکتے خواب بکھر گئے۔ دکھتا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا اس کے سانسوں کی ڈوری کتنی جلدی ٹوٹ گئی۔

بیاری تو وراثت میں ملی تھی کہ ماں اور بھائی ٹوم دونوں اسی سے مرے تھے۔

مجھے 1816 میں لکھی جانے والی اسکی پہلی

chapman's Homer اور دیگر "ode to a nightingale" اور "ode on a grecian" دونوں یاد آئی تھیں۔

اس نے سارے سفر بڑی سرعت سے طے کئے تھے۔ صرف چھ سال کا مختصر سا وقت۔ جس میں حیران کن حد تک ہر دل عزیز ی سیمٹی۔ شاعری، محبت، مٹگنی، بیاری اور موت۔ پہلے مجموعے Chapman's Hamer نے لوگوں کی توجہ کھینچی۔ مگر ساتھ ہی تک چڑھے نقاد اسے تباہ کرنے پر بھی ٹل گئے تھے۔ 1818 میں اس کی ambitious زیادہ بہتر رہی۔ یہاں اُسے ہنٹ، ولیم اور پیٹنجن ہائیڈن نے بہت سراہا۔

1819 اسکی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین زمانہ تھا۔

وہ فینش کی محبت میں گرفتار ہوا۔ The Eve of St اور Bright Star

Angles جیسی شاہکار نظمیں تخلیق ہوئیں۔

میری نظریں بے اختیار اُس بیڈ پر جم گئی ہیں۔ نہیں جانتی ہوں کہ اس کی ترتیب

اُس وقت بھی یہی تھی جواب ہے کہ آخری دنوں میں وہ زیادہ تر اپنے بیڈ پر ہی رہنے لگا تھا۔ یہی کھڑکی جو اس وقت میرے سامنے ہے اس کی دلچسپی اور دنیا سے ربط کا واحد ذریعہ رہ گئی تھی۔ اسی سے وہ سسپنشن سٹیپ ز اور برنیز Bernins کشتی کو دیکھتا۔ آسمان، موسم، لوگ، درخت اور زندگی کے کچھ رنگ اسی سے اُسے نظر آتے تھے۔

منظر کسی فلم کے سین کی طرح بدل گیا تھا۔ سکوائر میں فروری کے آخری دنوں کی صُبح کتنی دُھند اور سردی میں لپٹی ہوئی تھی۔ درختوں کی چوٹیوں پر دھرنا مارے بیٹھی برف دنوں پہلے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتی رہی تھی۔ سارے ماحول پر اُداسی اور تھکن کے سائے لرزاں تھے۔

کمرے میں کھڑے جوزف Severn نے اپنی تھکن کی لالی سے لبریز آنکھوں کو باہر سے اٹھا کر اندر پھینکا ہے۔ چار راتوں سے جاگتا اُسکا جسم اس وقت پھوڑے کی طرح درد کر رہا ہے۔ کمرے کی فضا میں کسی نحوست کے سائے سے بکھرے نظر آتے ہیں۔ دوسرے بیڈ پر گٹھڑی سی بنی ہڈیوں کی مٹھ میں سے ایک دل خراش سی آواز گندی مندی کی نحوس دیواروں سے ٹکراتی کمرے میں بکھرتی ہے۔

”سیورن“ (Severn)

سیورن فوراً سے پیشتر اُس گٹھڑی کو کلاوے میں بھر لیتا ہے۔

”سیورن میں مر رہا ہوں۔ میرا سر اوپر کر دو۔ ڈرکیوں رہے ہو؟ سیورن ذرا سا

اور اوپر کرو نا۔“

چھبیس سالہ جوزف سیورن Severn یا دواشتوں میں ابھر آیا ہے۔ یہ سنہری سنگتھر یا لے بالوں، خوبصورت خدو خال والا دلکش نوجوان آرٹسٹ بہت دن گزرے شاعر کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ اُن محفلوں میں اُس کا جانا اور شاعر کیلئے محبت کے جذبات رکھنے

کی پذیرائی نہ شاعر کی طرف سے ہوئی اور نہ اس کے دوستوں نے اُسے قابلِ توجہ گردانا۔ مگر وہ اس کے ایک خاموش پرستار کی صورت اُن محفلوں میں جاتا رہا جہاں شاعر اپنا کلام سُنا رہا تھا۔

سیورن اپنے فن کے مزید نکھار کیلئے روم جانے اور آرٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بڑا خواہشمند تھا۔ موقع ملا تو اس کی تکمیل کیلئے روم چلا آیا۔ محبت اور عقیدت رکھنے والے نے تو کبھی شاعر کی نجی زندگی میں جھانکا ہی نہ تھا کہ اُسے دُکھ کون کون سے ہیں؟ وہ حیران رہ گیا تھا جب اُسے خط ملا۔ کیٹس بیمار تھا۔ اُسے تپ دق تھی۔ ڈاکٹروں نے اُسے روم جانے اور وہاں رہنے کا مشورہ دیا تھا کہ یہاں کی آب و ہوا اُس کیلئے صحت کی پیامبر بن سکتی ہے۔ مگر نلندن کی سردی اُسے مار دے گی۔ اُسے شاعر کیلئے روم میں گھر لینے اور اُسے لٹینڈ کرنے کی درخواست تھی۔

اور یہ سیورن تھا اور یہی وہ گھر تھا جہاں وہ اُسے لے کر آیا اور اُس کی نرس بنا۔ اُسے لانے اور اسکی خدمت گیری کرنے میں اس کی فیملی کے بہت سے لوگوں کی مخالفت تھی۔ سب سے بڑا مخالف تو باپ تھا جسے بھنا تے ہوئے اُسے کہا تھا۔ ”تم پیشہ ور آدمی ہو۔ سیکھنے کیلئے روم گئے ہو۔ کیسے اُسے وقت دو گے؟ اپنا نقصان کر کے اور سب سے بڑی بات وہ بیمار ہے۔ چھوٹ کی یہ بیماری تمہیں لگ گئی تو کیا بنے گا؟ باز آؤ اس سے۔ مگر اُسے نہ کچھ سُنا اور نہ کچھ سوچا۔

چار ماہ کا یہ وقت اگر کیٹس کیلئے تجربات اور دوستوں رشتوں کی پہچان کا تھا کہ کون سے ایسے کڑے وقت اس کے ساتھ کھڑے تھے اور کون سے کان منہ لپیٹ کر روپوش ہو گئے تھے تو یہ بھی قابلِ ذکر بات تھی کہ سیورن اپنی شخصیت کی بھرپور خوبیوں کے ساتھ ابھر کر اس کے سامنے آیا تھا۔ یہی سیورن جسے کیٹس نے کبھی اہمیت ہی نہ دی تھی۔

پہلی بار وہ اُس کے قریب ہوا۔ دل کے قریب اور جانا کہ فیئی براؤن Browne سے علیحدگی کے غم نے کیسے کیٹس کو غموں کے پاناٹل میں پھینک دیا تھا۔ وہ کبھی کبھی اُس سے کہتا تو جب میں ٹھیک تھا، تندرست تھا وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اور جب میں بیمار ہوا اُس کی محبت کہاں گئی؟

کچھ باتیں پھر یادوں میں ابھری ہیں۔ اپنے کسی خط میں سیورن Severn جوزف نے لکھا تھا۔ ابھی ابھی وہ سویا ہے۔ میرے لیے ہر دن اُسے نمک کی طرح گھلنے دیکھنا کتنا تکلیف دہ ہے؟ شاید اگلے ماہ بہت بُری خبر کے ساتھ طلوع ہو۔ جب میں اُسے لیکر چلا تھا تو مجھے اس کی صحت یابی کا یقین تھا۔ مگر اب؟

ہاں پیسے بھی ختم ہو گئے ہیں۔ آخری چند کراؤن ہی رہ گئے ہیں۔ مل واپس آ گیا ہے۔ نیکر نے چیزیں دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میرے لیے باہر نکھنا اور دو گھنٹے کیلئے پینٹنگ سے کچھ کمانا ناممکن ہو گیا ہے کہ اُسے میری چند لُحوں کی دوری بھی برداشت نہیں۔ کس امید کا پلہ اُسے پکڑاؤں۔ یہ بہت اذیت میں ہے۔ اس کا خدا پر یقین اور ایمان تو پہلے ہی نہیں تھا۔ چلو عقیدے کی مضبوطی اور توانائی بھی کہیں تکلیف کی شدت میں کمی کا باعث بن جاتی ہے۔ اگر کچھ کہتا ہوں تو لعن طعن سُنتا ہوں۔ اب مجھے تو سمجھ نہیں آتی ہے کہ میں کیسے اس کے زخموں پر پھا ہار رکھوں۔ اور ہاں دیکھو نا زندگی کا کوئی فلسفہ، مذہب کی کوئی تھیوری کسی نہ کسی حوالے سے مُطمین کرنا اور مُطمین ہونا بھی کتنا ضروری ہے؟

آنکھیں پھر کہیں وقت کی مثل میں گھس کر ایک اور منظر سامنے لے آئی ہیں۔ مڈھال سا ایک جسم۔ ایک کمزور شکستہ سی آواز کمرے کے سناٹے میں ذرا سا شور کرتی ہے۔

”میرا دل اس وقت کیسے Greco میں کافی پیٹنے کو چاہ رہا ہے۔ چلو وایا ڈی

کون ڈوٹی Via dei condotti چلتے ہیں۔“

سیورن نے جنوری کی اس بخشتہ شام میں اُسے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُترنے میں مدد دی۔ یہ بھی محسوس کیا کہ اُس کی صحت بہتر ہونے کی بجائے زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتے ہوئے اُس نے کھڑکیوں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”جانتے ہو شیلے اور ہارن جب بھی روم آئے اسی کیفے میں کافی پینے آتے ہیں۔ سیورن شیلے بھی کیا کمال کا شاعر ہے۔“

اور جب وہ ہارن اور شیلے کے ساتھ اپنی محبتوں کا ذکر کرتا تھا۔ اُس نے بہت سے اور اپنے گہرے دوستوں کے نام لینے سے گریز کیا تھا۔ اب ہانٹ کی بیوی کوپ ڈق ہے۔ اس کے ڈھیر سارے بچے ہیں اور اس پر قرضوں کا بوجھ ہے۔ اُس نے اپنے خوبصورت سر کو مایوسی سے ”ہونہ“ کے سے انداز میں ہلایا تھا۔ بچنے اور جان چھڑانے کے کتنے خوبصورت بہانے ہیں۔ لیکن یہی تو وہ کڑا مقام ہے جہاں پر کھکی کسوٹی پر رشتے اور تعلقات پہچانے جاتے ہیں۔

اٹھنے سے قبل اسنے کہا تھا۔

”Leigh Hunt کی یاد نے مجھے مضطرب کر دیا ہے۔ مگر سیورن تمہیں تو میں جان ہی نہ سکا کہ تم کتنے عظیم ہو۔“

اس کی آنکھیں احساس جذبات نے بھگو دی تھیں۔

کیفے ہاؤس کا پراما بوڑھا اب Saxo phone بجا رہا تھا اور وہ دھیمے دھیمے When I have fears کو گنگنا نے لگا تھا۔

When I have fears that I may cease to be

Before my pen has glean'd my teeming brain

اُس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ کتنا بد مزاج اور چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے۔ گالیاں نکالتا ہے۔ ہر بات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔

ابھی ایک نئے منظر نے دروازہ کھولا ہے کمرے میں شور ہے۔ کیٹس ہاتھوں میں پکڑے نیکیے کوکھی بیڈ کی پانچھی، کبھی اسکے سر ہانے اور کبھی کمزور انگلیوں پر مارتے ہوئے اپنے حلق اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلاتے ہوئے کہتا ہے۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے آخر۔ میرے لئے عذاب بن گئے ہو۔“

مرنے دو مجھے۔ لوڈنم Laudanum کی شیشی تم نے کہاں چھپا دی ہے؟ ذلیل انسان کیوں نہیں دیتے ہو مجھے۔ کیا کرنا ہے مجھے زندہ رہ کر۔“

اُس کا سانس اکھڑنے لگا ہے۔ بلغم حلق سے جیسے اُبلنے لگی ہے۔ سیورن نے فوراً بڑھ کر اُسے گلاوے میں بھر کر اس کا سر جھکاتے ہوئے کہا ہے۔

”پھینکوا سے، نکالو اندر سے۔“

اس کے بازوؤں میں مڑھال سا وہ پھر ضدی بچے کی طرح کہتا ہے۔

”مرنے دو مجھے۔“

اور پھر وہ کسی کٹی شاخ کی طرح اس کے بازوؤں میں جھولنے لگا ہے۔ اس نے دھیرے سے اُسے لٹا دیا ہے۔ سانس کیسے چل رہا ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ چہرہ پسینے سے تر ہے۔ سیورن اس کے بیڈ پر بیٹھا اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے سوچے چلے جا رہا ہے۔ سوچے چلا جا رہا ہے۔

بہت سے اور دن گزر گئے ہیں۔ ہر دن اُسے موت کی طرف لے جا رہا ہے۔ ایسی ہی ایک غم زدہ اور المناک صبح میں وہ سیورن کو چھپائی انداز میں کہتا ہے۔

”مجھے تھام لو۔ ڈرو نہیں۔ دیکھ موت مجھے لینے کے لئے آگئی ہے۔ میرے جسم کی پورپور میں درد ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ سانس جیسے میری پسلیوں میں ٹھہر گیا ہے۔ میرے اندر شاید اب کچھ نہیں۔ خون کا قطرہ بھی نہیں۔

شیشوں سے باہر کی دُنیا میں کتنی چہل پھل ہے؟ کتنے رنگ کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں اندر کتنا سناٹا اور کتنی خاموشی ہے؟

کچھ اور دن گزر گئے ہیں۔ موسم نے تھوڑی سی انگڑائی لی ہے۔ لنڈمنڈ درختوں پر سرسبز روئیدگی پھوٹ رہی ہے۔ سیورن بے چین اور مضطرب ہے۔ اُسے محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کا سانس کہیں اٹکا ہوا ہے۔ بس کسی لمحے کا منتظر ہے۔ اور یہ لمحہ بالآخر تیس (23) فروری کی شب کو جب سیورن نے اُسے اپنے کلاوے میں بھر کر چھاتی سے چٹایا تو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب اُس کے اندر سے کوئی چیز نکلی اور پھر سے بند کھڑکیوں کی کسی چھوٹی سی درز سے باہر نکل گئی۔

خواب صورت کمروں کے ایک پھیلے ہوئے سلسلے میں گھسے ہوئے بے اختیار رہی میں نے سوچا تھا تھا کہ زندگی میں جن چیزوں کیلئے بندہ رُسکتا ہوا مر جاتا ہے۔ موت بعض اوقات کتنی فیاضی سے وہ سب کچھ اُسے دان کر دیتی ہے۔ یہ سب جو یہاں بکھرا ہوا ہے اس کے لافانی ہونے کی خواہش کا عکاس ہی تو ہے۔

یہ سیورن کا کمرہ ہے۔ اُن تصویروں کے پاس کھڑی ہوں جو کٹیس کے بھائیوں کے پوڑیٹ ہیں اور جنہیں سیورن نے بنائے۔ فیشی براؤن کے پوڑیٹ کو بہت دیر دیکھا ہی نہیں اُس سے باتیں بھی کیں۔

”کبھی تم نے اپنے مقدر پر رشک کیا۔ تم عام سے گھر کی عام سی لڑکی جیسے شاعر کی محبت نے کتنا خاص بنا دیا کہ انجانی سرزمینوں اور دور دیسوں کی لڑکیاں اور عورتیں شاعر کو

پڑھنے والے مرد اور لڑکے تم سے محبت اور نفرت کے ساتھ ساتھ تم پر رشک بھی کرتے ہیں۔
 Leigh Hunt اور ولیم ورڈز ورثہ کے پوٹریٹ۔ کیٹس کا لائف ماسک اور
 اس کی نظموں کے پہلے ایڈیشن یہاں ہیں۔

بڑے کمرے میں کرسیاں، تصویریں، خوبصورت فرش، چھت کو چھوٹی
 الماریاں، دنیا بھر کے رومانی لٹریچر کے خزانوں سے بھری ہوئیں۔ مادر اور نایاب چیزوں
 سے سچی ہوئیں۔ چھوٹا سا دروازہ ساتھ کے کمرے میں کھلتا ہے۔ شوکیسوں میں اسکے
 سکرپٹ، فریم کیئے ہوئے خطوط، ڈرائنگلو کیٹس کی مدح میں ایک سونیٹ، اسکے سنہری
 بال بینی کی انگوٹھی، آسکر وائلڈ کی تحریر، والٹ وٹمین Walt Whitman کی ذاتی
 لکھائی میں لکھا گیا مضمون۔ ماسک جیسے ہارن نے venetian carnival پر
 پہنا۔ لڑ بھرت Barrett کا تعریفی خط اور خوبصورت سیڈنریاں سب ماحول کو اس
 مخصوص فضا میں لے جاتے ہیں۔ مجھے اور دیدہ زیب فرنیچر شان میں مزید اضافے کا
 موجب ہیں۔

اسے میوزیم بنادینے کی داستان بھی بڑی عجیب ہے۔

وہ کمرے جن میں کیٹس اور سیورن رہے تھے اُن میں 1903 میں امریکی
 لکھاریوں کا ایک جوڑا ماں بیٹا جمیسنز وال کوٹ Walcott یہاں ٹھہرے اور انہوں
 نے یہاں کافی وقت گزارا۔ دونوں کو بڑا تجسس تھا۔ کمروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ خاتون
 اسے خریدنا اور ایک یادگار کے طور پر محفوظ کرنے کی حد درجہ خواہش مند تھی۔ جذبے بڑے
 طاقتور تھے مگر پیسہ پاس نہیں تھا۔

انہی دنوں ایک امریکی شاعر رابرٹ ایڈروڈ جانسن نے اسے دیکھا اس کی اہتر
 حالت نے اسے بہت متاثر کیا۔ روم میں رہنے والے بہت سے امریکیوں کو اس نے آواز

دی۔ ان کاوشوں نے برطانوی ڈپلومیٹ رینل روڈ (Rennell Rodd) کی توجہ کھینچی۔ اُس نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ جس نے گھر خریدنے اور اس ادبی ورثے کو محفوظ کرنے کی حکومتی سطح پر کاوشیں کی تھیں۔

1906 میں اسے ایڈورڈ ہفتم کی مالی اعانت سے خریدا گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں بھی اسے مازیوں کے ہاتھوں محفوظ کرنے کی حد درجہ کوششیں ہوئیں۔

چھوٹے سے سینما گھر میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر ڈاکومنٹری دیکھی۔ گفٹ شاپ میں کتابوں کی قیمتوں کا جائزہ لیا۔ میرے حساب سے مہنگی تھیں۔ تین دن میں روم میں رہنا تھا۔ کتابوں کی دکانوں پر جانا بھی ضروری تھا تو جلدی کا ہے کی ہے۔ خود سے کہا گیا۔

دونوں لڑکیوں کو رخصت ہونے سے قبل خدا حافظ کہا۔ اُن کی یہ بات کتنی اچھی لگی تھی۔

یہاں آنے والے کچھ لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ وہ کہاں آئے ہیں۔ مگر کچھ لوگ جب یہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ تب جانتے ہیں کہ وہ کہاں آئے تھے۔ اس کی قبر پر کیا عہدہ لکھا ہوا ہے۔ مارگریٹ نے ہی بتایا تھا۔ یہاں وہ شخص لیٹا ہوا ہے۔ جس کا نام پانیوں پر لکھا ہوا ہے۔ کاش وہ اپنی چھوٹی سی عمر میں جان سکتا کہ صدی کی اگلی نصف دہائیاں اُس کے لئے بے پناہ شہرت لے کر آنے والی ہیں۔

اور وہ وقت بھی آنے والا ہے جب وہ سب سے زیادہ پسندیدہ اور کوڑ کرنے والا
شاعر بن جائے گا۔



گوزیو کاردوسی

Giosue Carducci

اٹلی کا پہلا نوبل ایورڈ یافتہ قومی شاعر

- اٹلی کے پہلے نوبل ایوارڈ یافتہ قومی شاعر کوزیو کارووسی کی سوچ بڑی انقلابی تھی۔
- اُس کا کہنا تھا کہ شاعری ہی وہ ہتھیار ہے جو کسی بھی قوم کے شعور کی بیداری اور اُسے سیاسی بلوغت دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔
- شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا استاد، بہترین نثر نگار اور تنقید نگار بھی تھا۔
- ملکی سیاست میں بھی وہ بڑا فعال تھا۔

شمال کی کھر آلود زمینوں کی دختر

یہ چھوٹا سا ظہار تحسین اُس کے لیے ہے

جو برہنہ کے تاروں کو کسی

ان دیکھے ہاتھ سے چھوٹا ہے

اور کوئی قدیم سی دھن نکالتا ہے

نئی موسیقی میں سمونے کے لیے

معاف کرنا اگر کوئی تند و تیز سر نکل آئے

تمہاری سحر آگس موسیقی کی تائیں

جنہیں تمہاری اعلیٰ روح شاید ہی سمجھ سکے

لیکن تمہارا شہد جیسا ٹٹھا گا

شاید اس کا کوئی سراغ پا جائے

قدیم اٹلی کے دیوتا اور سمندری دیویاں

دیکھو پہاڑ جنگل، گھائیاں اور وادیاں

تمہاری کاہلی، سستی، تمہارا فخر و غرور

تمہارا جوش و اضطراب، تمہارا رشک و حسد

سب کھیل کو برآمد کرتے ہیں

محبت اور پیار کو ان سب پر غالب آنے دو

گوزیو کاردوسی Giosue Carducci

پہلا تعارف روم میں ایزولینا کی زبانی ہوا تھا۔ اپنے قومی اور نوبل انعام یافتہ شاعر پر بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ خاصا پر غرور سا تھا۔ تفصیلی تعارف مسز ریٹا سمیٹھ کی سٹڈی روم میں ہوا۔ یوں یہاں دانٹے Danta کانسی کے بڑے اور گوزیو کاردوسی Giosue Carducci ذرا چھوٹے دیدہ زیب مجسموں کی صورت موجود تھے۔ دانٹے سے تعارف ڈیوائن کومیڈی کے حوالے سے پرانا تھا۔ مگر اس کی مخصوص طوٹے جیسی ناک سے شناسائی یہاں اٹلی میں ہوئی۔

مگر یہ صورت۔ وجاہت برستی تھی۔ بنانے والے کی ہنرمندی کو بھی سراہنا پڑا تھا کہ دانشوری کا گھمبیر سا تاثر فنکار نے کمال فن کی صورت چہرے پر بکھیر دیا تھا۔ داڑھی اور مونچھیں بھی کمال کی تھیں۔ یہ صدی دوسری پہلے کے بڑے بڑے کھاری، دانشور، سائنس دان اور فنون لطیفہ کے ماہر اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اتنی بڑی بڑی مونچھیں اور داڑھی رکھتے تھے۔ کیا ایسا کرنا تب معاشرے میں مردانگی کی علامت سمجھی جاتی تھی یا پھر سست اوجہ داری اور کابلی کا کوئی مسئلہ ہوتا تھا؟

مسز ریٹا کے لہجے میں بھی چھلکتے فخر کا احساس اور اظہار بڑا زور دار قسم کا تھا۔

”ہمارے ملک اٹلی کا پہلا نوبل ایوارڈ یافتہ اور ماڈرن اٹلی کا قومی شاعر۔“

دراصل شدید خواہش کے باوجود مسز سمیٹھ کا سٹڈی روم میرے لئے ابھی تک شرک ہو موز جیسا اسرار لئے ہوا تھا۔ پہلے دن کی پہلی شام اس کے دروازے ضرور کھلے تھے مگر اندر جانے، وہاں بیٹھنے اور شیلغوں میں بند ہیروں کو دیکھنے کی حوصلہ افزائی نہ تھی۔ آج شام کو ان کے گھر جاتے ہوئے میں نے دل میں کہا تھا۔

”اب دم واپسی ہے۔ ڈھیٹ بن کر مددِ عاجز و رکوش گزار ہوگا۔“

وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئیں۔ روم کے بارے باتیں ہوئیں۔ میرے تاثرات اور تجربات بڑے ہی دل خوش کن تھے۔ پیسا کے بارے بھی بتایا کہ کل وہاں جانے کا ارادہ ہے۔ مسرور ہوئیں۔ پھر درخواست کو بھی پذیرائی ملی۔ کتابوں، محسوس اور پھول پتوں میں گھرے کمرے میں سانس لیتے ہوئے اپنے اندر سرشاری کی سی کیفیت روح تک میں اُترتے محسوس کرتے ہوئے میں فکر و آگہی کی دنیا میں داخل ہوئی تھی۔

میں شاعر سے تفصیلی متعارف ہونا چاہتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے شناسائی کی ساری منزلیں مسز ریٹا سمیٹھ خود طے کروانا چاہتی تھیں کہ شاعر سے بڑا عشق تھا۔ مگر میں بھی ایک نمبر کی کائیاں۔ میرے دل نے کہا تھا۔

”آپ کی محبت کا بہت شکریہ۔ مگر پلیز جانیے میرا تو رشتہ ہے اس سے۔ میرے قلم

قبیلے کا فرد ہے۔“

مسز سمیٹھ کی مہربانی، اُن کی نوازش کہ انہوں نے بھاپ اڑتی کافی کا مگ مجھے پکڑایا۔ بھاپ کے مرغولوں میں سے جھانکتی، شیلغ پرستی بے حد ذہین آنکھوں نے مجھے دیکھا۔ مسکراتے ہوئے میں نے کہا۔

”کوزیو تمہاری زبان سے سننے کا تو اپنا ہی لطف ہوگا۔ اور تمہیں تو انگریزی پر بھی بہت عبور ہے۔“

میں نے گھونٹ بھرا۔ ایک بھاری سی آواز کوئی تھی۔ ایک سوال ہوا۔

”تم لوکا Lucca دیکھا ہے؟“

”کل پیسا کے لئے روا لگی ہے لوکا بھی جاؤں گا۔ فلورنس کا بھی پروگرام ہے۔“

میرے لہجے میں کہیں مسرت اور کہیں شوق کا اظہار تھا۔

”لوکا بہت خوبصورت جگہ ہے۔ تمہارے اس شاعر نے لوکا Lucca کے ایک

چھوٹے سے قصبے والدی کیستلو Valdicastello میں 1835 کے سال جنم لیا تھا۔

ارے ہاں یاد آیا۔ بتانا چلوں تمہیں کہ اس جگہ سے قریب ہی وہ سمندر ہے جہاں

انگریزی ادب کا وہ مشہور شاعر شیلے ڈوب کر مر گیا تھا۔“

”ہائے۔“ میرے اندر سے ہوک اٹھی تھی۔ کیا خوبصورت شاعر تھا؟

میرا گھرانہ قدیم فلورنٹائن روایات کا اسیر تھا۔ میرے دادا کو اپنے وقت کی انقلابی

تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں اُسے اپنے ڈیوک سے بہت پیار تھا مگر میرے بابا

میخائل کاردوسی جو ایک مائنگ کمپنی میں ڈاکٹر تھا۔ بڑا انقلابی تھا۔ اٹلی کے اتحاد کا سب سے بڑا

داعی۔ کاربونیری Carbonari (اٹلی کی خفیہ تنظیم آزادی) کے ساتھ منسلک ہونے اور ملکی

سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے کی پاداش میں وقت کے حکمرانوں کی آنکھوں میں کھٹکتا اور

نتیجتاً خاندان کو تک کر ایک جگہ رہنا نصیب نہ ہوتا۔ شاعر کا سارا بچپن ادھر ادھر گھومتے

گزر رہا تھا۔ اسی درپردہ میں کچھ سال فلورنس میں بھی گزرے۔

اگر میں اپنے بچپن کی یادوں بارے کوئی بات کروں تو کہنا پڑے گا کہ دو واقعات

ایسے تھے کہ وہ ہمیشہ اپنی پوری توانائی سے میرے اندر محفوظ ہوئے اور گاہے گاہے ان کی

جھلمل اپنی پوری آب و تاب سے سامنے آتی رہی۔

ابھی میں چھوٹا ہی تھا۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے باغ تھا۔ اب جگہ کیسی تھی اس کی خوبصورتی یا بدصورتی کا کوئی واضح تصور ذہن میں نہیں۔ مجھے موسم بھی یاد نہیں۔ یہ بہار کے دن تھے۔ کیا سردیاں تھیں؟ گرمیاں یا خزاں کے دن۔ بس اتنا سایا دپڑتا ہے کہ جیسے زمین سے آسمان تک ہر چیز گیلی گیلی اور دھواں دھواں سی تھی۔ میری ہی عمر کی ایک لڑکی میرے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس کے رے کا ایک کونا میں نے پکڑا ہوا تھا اور وہ ٹاپ رہی تھی۔ دفعتاً ایک بد صورت مینڈک نما چیز ہمارے پاؤں کے سامنے آگئی۔ ایک خوفناک سی چیخ ہم دونوں کے حلق سے نکلی اور فضا میں بکھر گئی۔ دفعتاً عین سامنے والے گھر کا دروازہ کھلا۔ لمبی سیاہ داڑھی والا ایک مرد کتاب ہاتھ میں پکڑے دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کی نگاہوں میں غصے کی تپش تھی اور اس نے مجھے ڈانٹا تھا۔ رسہ پھینک کر میں اس کی طرف بھاگا چلا تے ہوئے۔

”دفع ہو جاؤ۔ تم بد صورت انسان۔ دفع ہو جاؤ۔“

وقت کا یہ کوئی فیصلہ کن لمحہ تھا جس نے میرے اندر یہ بیج بودیا کہ میں نے زندگی بھر ہر اس آدمی کو جس نے مجھے اخلاقیات کے نام پر لعن طعن کرنے کی کوشش کی۔ یہی کہا۔ ہاں اب دوسرا واقعہ بھی سنائے دیتا ہوں۔

گھر کا ماحول بے حد منظم اور سخت تھا۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی تھے۔ بچوں کی مجال نہ تھی کہ اپنی مرضی سے کوئی کام کر لیتے۔ مجھے جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ مگر اجازت ہی نہ تھی۔ اب کڑھنا اور احتیاج کرنا تو ضروری تھا۔ ماں کا سوا لوں سے ناک میں دم کر دیتا۔ میڈر (ماں) آخر میں عقاب کو کیوں نہیں پال سکتا۔ مجھے آلو بہت پسند ہیں۔ میں اُسے گھر میں رکھنا چاہتا ہوں۔ میڈر مجھے اجازت دو کہ میں بھیڑ کا بچہ رکھوں۔

وہ کام کرتے کرتے بیٹے کی ان معصومانہ باتوں کو سنتی اور دھیرے سے کہتی۔

”تمہارا باپ پسند جو نہیں کرتا۔“

پھر یوں ہوا کہ میں بھائیوں سے ساز باز کر کے آلو گھر لے آیا۔ جیب خرچ جمع کرتا رہا اور چھوٹا ساعقاب خرید لیا اور پھر بھڑیا کا بچہ بھی پالنے لگا۔

بھانڈا ایک دن پھوٹ گیا۔ گھر کے کچھواڑے رکھے ہوئے پرندوں میں آلو مار دیا گیا، عقاب کو اڑا دیا گیا اور بھڑیے کے بچے کو بھگادیا گیا۔

اور جب میں سکول سے گھر آیا۔ میرے کچھواڑے کا مال متاع لٹ چکا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نہ تھمتے تھے۔

ایسا دل شکستہ اور مایوس سا کہ گھر سے بھاگ کر جنگل میں چلا گیا۔ درختوں سے لیٹ کر روتا رہا۔ ساحل سمندر کے کنارے پر بیٹھا رہا، آنسو بہاتا اور خود سے باتیں کرتا رہا۔ بچپن کا یہ دکھ مجھے ہمیشہ یاد رہا۔ میری شاعری میں بھی اس کا اظہار ہوا۔

ادب میں ناموری مقد ر کیوں نہ بنتی کہ مطالعہ کا شوق بچپن سے ہی جڑوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ یوں استاد بننا اور پڑھانا بہت پسند تھا۔ ہاں البتہ مطالعہ کرنا میرا بہترین مشغلہ تھا۔ واحد خوشی ہر موضوع پر کتاب پڑھنا اور شاعرانہ خیالات اور سوچوں میں گم رہنا ہوتا تھا۔ میرے امیر دوست میرے اس شوق سے آگاہ تھے۔ انہیں ہمارے مالی حالات کا بھی علم تھا۔ وہ ہمیشہ کتابوں کا تحفہ دیتے۔ جنہیں میں خرید نہیں سکتا تھا۔

ایک اور خوبصورت یادِ حاضری میں محفوظ ہے۔ گھر کے ماحول میں بہت سے رنگ گھسے ہوئے تھے۔ والد کے دوست آتے تو زوردار سیاسی بحثیں ہوتیں۔ ادب پر گفتگو، تاریخ کے حوالے، طب، فلسفہ غرض کوئی موضوع تھا جس پر بات چیت نہ ہوتی۔ تو ان سب کا اثر یہی تھا کہ میرے اندر انقلاب، جمہوریت اور تاریخ کے حوالوں سے بہت کچھ باہر نکلنے کے

لیجے مضطرب رہنے لگا تھا۔

اس کا پہلا بھرپور اظہار ہماری کھیلوں میں ہوا جو میں اور میرے دوست کھیلتے تھے۔ ڈرامے شروع ہو گئے۔ سکرپٹ لکھا جاتا جو میں لکھتا۔ ملک کے موجودہ حالات کی نمائندگی طوفانی قسم کی میٹنگز سے ہوتی جن میں اختلاف رائے پر پتھر اور ڈانگ سونٹے چلتے۔ اور آخر میں ہم ایک بہترین سالانہ عمل روم کی حکومت کو دینے کے قابل ہو جاتے۔

تاریخی کرداروں خاص طور پر رومن سیزر اور ان میں بھی جو لیس سیزر اور وہ اس کا رگہ جھتیجا نیرو۔ کبھی کبھی ہماری یہ ڈرامہ بازی اپنے کرداروں کی زبانی اتنا شور و غوغا برپا کر دیتی کہ میرے والد باہر نکلتے۔ مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لاتے اور میز پر رکھی تین کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے۔

”انہیں پڑھو۔ اور اپنی رائے کا اظہار کرو۔“

یہ کیتھولک اخلاقیات پر مبنی کتابیں ہوتیں۔ میں نہیں جانتا تھا میرے باپ کا انہیں پڑھانے سے مجھے کیا سبق دینا مقصود تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ مجھے نفرت تھی ایسی سب کتابوں سے۔ میں سمجھتا تھا کہ انہوں نے انسانی آزادی کو سلب کیا۔ جنگ و جدل کے رجحانات کو ہوا دیتے ہوئے قتل و غارت اور لڑائیوں کو راستہ دکھایا۔ تازہ ہوا سے محرومی اور بھوک ننگ دیا۔

مجھے انہیں پڑھنے اور ان پر وقت ضائع کرنے کی بجائے کمرے میں کھڑے ہو کر کھلی کھڑکی سے فطرت کے نظاروں کو دیکھنا اور باپ کی طرف سے عائد کی ہوئی سب سزاؤں کو بھگتنا بہتر لگتا۔

آغاز میں ادب میں سب سے زیادہ متاثر یونانی اور رومن ادیبوں سے ہوا۔ ابھی کالج میں قدم رکھا ہی تھا کہ سنجیدہ کلاسیکل ادب کی طرف بھی رجحان ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا

جب میرے سر ہانے لاطینی شاعر ہورس Horace اور ورجل Virgil رہتے تھے۔ دن رات انہیں پڑھتا اور ان کے عشق میں ڈوبا رہتا۔ یہی وہ دن تھے جب میں نے ہومر کی ایلیڈ Iliad کی کتاب 9 کو اٹالوی میں ترجمہ کیا۔

1856 میں گریجویٹیشن سے فارغ ہونے کے ساتھ ہی میں نے درس و تدریس کا آغاز کر دیا۔ اٹلی سے بے پناہ محبت مجھے وراثت میں ملی تھی کہ میرا ڈاکٹر باپ پاگلوں کی طرح اٹلی سے پیار کرتا تھا۔ لاطینی میں نے اپنے باپ سے سیکھی تھی۔

یہی وہ سال تھا جو ہمارے چھوٹے سے خاندان پر کسی قہر کی طرح ٹوٹا۔ میرے چھوٹے بھائی دانٹے نے خودکشی کر لی تھی۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ ہمیں تو معلوم ہی نہ ہوا کیسا جان لیوا صدمہ تھا؟ میں دیکھتا تھا۔ میرا باپ اس غم سے کتنا شکستہ ہو رہا تھا؟ اس کی شکستگی نے اندر ہی اندر اُسے گھول دیا۔ چند ہی ماہ گزرے تھے کہ وہ بھی ختم ہو گیا۔

میں نے اپنی ماں کو دیکھا وہ کس قدر اجڑی بجزوی نظر آتی تھی۔ میں نے اُسے بانہوں میں سمیٹا۔ اس کے بالوں کو چوما اور بڑے بیٹے کی طرح اُن ذمہ داریوں کو اٹھالیا جو میرے اوپر عائد ہوتی تھیں۔ ہم اس وقت بہت غریب تھے۔ باپ نے جو ورثہ چھوڑا تھا وہ چند شیلنگ تھا۔

غموں کے اس جہوم میں میرے پہلے مجموعے Rim کی اشاعت نے مجھے ان کرہناک دنوں میں اُس مسرت سے ہم کنار کیا جو کسی شاعر یا ادیب کو اپنی پہلی تخلیق سے حاصل ہوتی ہے۔ اس مجموعے کی بہت سی نظمیں میرے ہیرو و شپ جذبات، جنگ و جدل کی کہانیوں اور قدیم تاریخ کے ظالم اور مہربان کرداروں، تلخ و شیریں واقعات، کھیلوں، خاص طور پر ضلعی ٹورنا منٹوں اور کام سے بے پناہ لگن اور محبت کے حوالوں سے خاصی طویل تھیں۔ اس مجموعے کی ایک خوبصورت نظم "Love and Death" بہت اثر انگیز

تھی۔ میرے لڑکپن کے کبھی کے سنے ہوئے پسندیدہ عجیب و غریب سے واقعات، فاتح
 نائٹ کا کوئین آف بیوٹی کو لے جانا، ہیروئن کے بھائی کا تعاقب کرنا، نائٹ کا قتل، اس کا
 پاگل پن اور پھر موت کے منہ میں چلے جانا جیسے تاریخی واقعہ کا بیان، حب الوطنی اور انقلابی
 خیالات نے بھی ان میں اپنے ہونے کا بہت کھل کرا ظہار کیا۔ یہ مجموعہ ایک ایسے معاشرے
 میں تہلکہ مچانے کیلئے کافی تھا جو بھی تک پوپ اور پادری کی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔

میں اس کی شادی، اس کی بیوی بچوں اور ازدواجی زندگی کے بارے جاننے کی
 بھی بڑی خواہش مند تھی۔ مزرینا سمجھنے نے اپنی کافی ختم کر لی تھی۔ وہ کوزیو کو تھوڑا سا
 ریلیکس کرنے کے موڈ میں تھیں۔ اُن کی میٹھی مدھم اور مہربان سی آواز کمرے کی فضاؤں میں
 خوشبو کی طرح بکھری۔ وہ اس کی ایک لظم گنگنا رہی تھیں۔

شال کی کھراؤدزمیوں کی دختر

یہ چھوٹا سا ظہار تحسین اُس کے لیے ہے

جو بربط کے تاروں کو کسی

ان دیکھے ہاتھ سے چھوٹا ہے

اور کوئی قدیم سی دھن نکالتا ہے

نئی موسیقی میں سمونے کے لیے

معاف کرنا اگر کوئی تند و تیز سر نکل آئے

تمہاری سحر آگیں موسیقی کی تانیں

جنہیں تمہاری اعلیٰ روح شاید ہی سمجھ سکے

لیکن تمہارا شہد جیسا میٹھا گلا

شاید اس کا کوئی سراغ پا جائے

قدیم اٹلی کے دیوتا اور سمندری دیویاں
 دیکھو پہاڑ جنگل، گھائیاں اور وادیاں
 تمہاری کابلی، سستی، تمہارا فخر و غرور
 تمہارا جوش و اضطراب، تمہارا رشک و حسد
 سب کھیل کو براہ کرتے ہیں
 محبت اور پیار کو ان سب پر غالب آنے دو

کمرے میں سناٹا تھا۔ بہت دیر ہم دونوں اس کے سحر میں ڈوبی رہیں۔ پھر مسز سمیٹھ نے بولنا شروع کیا۔ وہ اُس کی شادی کا احوال سن رہی تھیں۔

شادی اس نے 1859 میں ایلویرا Elvira Memicucci سے کی۔ ایلویرا اس کے ایک دوست کی بیٹی تھی۔ شادی اس کی پسند اور خواہش سے ہوئی۔ اپنی ماں اور بھائی کو ایلویرا کے ساتھ ہی وہ اپنی نئی جائے ملازمت پر لے آیا تھا۔ ازدواجی زندگی خوشگوار تھی۔ کامیاب بھی رہی۔ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا خاندان میں شامل ہو گئے تھے۔

بلوگنا Bologna میں پروفیسر ہونا بھی کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ یونیورسٹی میں دھوم مچ گئی تھی کہ زمانوں پرانی عمارت میں خوشگوار اور معطر ہوا کا جھونکا آیا ہے۔ زنگ آلود اور تھکی ہوئی روحوں کے درمیاں ایک نئے خیال اور نئے رجحان رکھنے والی شخصیت کا ورود ہوا ہے۔

دھیرے دھیرے ادب کے اونچے مقام پر فائز، شہرت کے اعتبار سے ملک میں ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی مشہور ہو چکا تھا۔ ایک اچھے استاد کے ماتھے اپنے طلبہ میں ہر دلعزیز اور اُن کے اندر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو کھوج کرنے والا تھا۔ یہاں اس کے طلبہ میں سے ایک Pascoli پاسکولی بہت نمایاں ہو کر سامنے آیا اور اس نے شاعری میں بھی بڑا نام

پیدا کیا۔ وہ اچھا استاد ہی نہ تھا بلکہ بہترین اور تند نفاذ بھی تھا۔ دب اور سوسائٹی دونوں کے
چھینٹنے میں اڑاتا۔ پکا دہریہ تھا۔ اس کے سیاسی نظریات کی کولہ باری عمومی طور پر عیسائیت
اور کیتھولک چرچ کی سیکولر طاقتوں پر خصوصی طور پر مستقل رہتی۔
ایک بار اس نے کہا۔

”میں نیکو خدا کی سچائی کو جانتا اور مانتا ہوں اور نہ ہی پادریوں اور وہابی کن والوں
کی جانب سے امن پر میرا اعتبار ہے۔ یہی اٹلی کے حقیقی اور نہ بدلے جانے والے دشمن
ہیں۔“

1850 سے 1860 تک کی شاعری "Juvenilia" کے ٹائٹل کے تحت
منظم ہوئی۔ تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ اس مجموعے میں شاعر اپنی بہترین کاوشوں سے حریت
انگریز نتائج حاصل کرنا نظر آتا ہے۔ ان میں کچھ نئی نظموں کا اضافہ تھا۔ ان میں بھی کچھ خاصی
طویل نظمیں تھیں۔ ڈکٹر ایونیل کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ سارڈینا sardina کا بادشاہ جو
اس وقت اٹلی کی آخری امید تھی۔ اس کے جوشیلے جذبات اور خیالات نے ان نظموں میں
کھل کر اپنے ہونے کا اظہار کیا تھا۔ یہ کلیات اس کے بے باکانہ شاعرانہ وجدان کا
خوبصورت اظہار تھی۔

Confessions and Battles میں بھی اگرچہ یہ ذرا مشکل ہے کہ
اسے ثابت کیا جائے کہ اس نے اپنے دفاع میں کیا کہا۔ تاہم بڑی بات یہ ہے کہ اس جیسے
حساس شاعر کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ کیتھولک چرچ نے لوٹ مار اور لوگوں کو اجتمع بنانے
کے جو طریقے اپنا رکھے تھے۔ ان سب کا حقیقی چہرہ لوگوں کے سامنے پیش نہ کرے اور اس
مکروہ چہرے کی پوری تصویر کشی نہ ہو۔

وقت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ صلاحیتیں نکھرتی گئیں۔ وسعت اور گہرائی میں

ارتی گئیں۔ Rime nuove یعنی The new lyrics اور Bar barian odes بھی میرے خیال میں وہ بہترین مجموعے ہیں۔ جو 1877 میں چھپے اور جنہوں نے بہت ہی مقبولیت حاصل کی۔ اس کا کہنا تھا کہ شاعری ہی وہ تھیاری ہے جو کسی بھی قوم کے شعور کی بیداری اور اُسے سیاسی بلوغت دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان مجموعوں کی کلاسیکل نظمیں، دانشورانہ آہنگ کے ساتھ ساتھ متوازن اور شاعری کے وضع کردہ بیانیوں پر پوری اترتی ہی نہ تھیں بلکہ فی الفور دل میں گھر کرتی تھیں۔

ایسے جوشیلے، ترقی پسند خیالات والا اپنی ہر دل عزیزی سے گھبراتا بھی بہت تھا۔ Cross if savoy ایک ایسی خوبصورت ڈرامائی پیش کش تھی کہ اسے جب پرکولا Pergola تھیٹر میں پیش کیا گیا اور ناظرین نے اس کے مصنف سے ملاقات کرنی چاہی تو وہ بھاگ گیا۔ دوست تعارف کروانے کے لئے اُسے جگہ جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔

1870ء کا سال بھی بڑا دکھ بھرا تھا۔ پہلے والدہ فوت ہوئیں۔ ایک محبت کرنے والے بوڑھے جو دسے گھر خالی ہو گیا تھا۔ ابھی اس صدمے سے باہر نہیں نکلنے پایا تھا کہ میرا اکلوتا بیٹا دانستے فوت ہو گیا۔ تین سال کا خوبصورت بیٹا جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔ شاعر نے ایک جگہ لکھا۔

”وہ میری امید تھا، میری محبت اور میرا مستقبل تھا۔ غم کی اس اندوہناک کیفیت سے نکلنے کے لئے میں نے خود کو کام میں ڈبونا چاہا۔ مگر نہیں۔ مجھے لگتا تھا جیسے میرا اندر چھلنی ہو گیا ہے۔ مجھے خود پر حیرت ہوتی کہ میں نے اُسے قبر میں کیسے اُتارا؟ کس قدر غم انگیز نظمیں تخلیق ہوئیں جنہیں اعلیٰ معیار کے نوے کہا جاسکتا ہے۔“

حسن فطرت سے بے پناہ عشق تھا اور اس کا اظہار بھی اس کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ ode to Queen کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔

کہہ لیجیے وہ بہر حال ایک سیاسی دانشور کے طور پر بہت نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ اپنے باپ کی زندگی اور اس کے بعد کچھ وقت تک جمہوریت کا زبانی کلامی یا تحریر کے حوالے سے حامی رہا۔ تقریباً 1859ء سے عملی طور پر اور شاعری کے ذریعے دونوں طرح اس کا حصہ دار بنا۔ ملک کے اتحاد اور اس کے روشن مستقبل سے وابستہ امیدوں کے خون ہوتے حالات نے اسے اپوزیشن کے کیمپ میں پھینک دیا۔

وکٹر ایسٹونیل کی موت نے رد عمل دکھایا۔ نوجوان بادشاہ اور ملکہ کے لئے ہمدردی کے جذبات اس کے سیاسی نظریات پر اثر انداز ہوئے۔ ایک نظم ode to Queen بھی کہی۔ جس پر یارلوکوں کی خاصی لے دے ہوئی۔ رنگا رنگ قسم کی باتیں، کہیں سیاسی اور مالی فوائد کے حصول کے لئے اور کہیں اونچا عہدہ حاصل کرنے کی خواہش جیسے تبصروں کی بازگشت خاصی واضح تھی۔

یہ سال 1878ء تھا جب نوجوان بادشاہ ایمبرٹو Umberto اور ملکہ مارگریٹا Margherita نے بلوگنا کے دورے کا پروگرام بنایا۔ شاہی جوڑے کے استقبال کے لئے شہر کے معززین کا انتخاب کرتے ہوئے ریکٹر اور دیگر لوگوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ استقبال میں اپنی شمولیت یقینی بنائے کیونکہ ملکہ اس سے ملنے کی خواہش مند ہے۔ وہ اس کی شاعری کی مداح ہے۔ یہاں میں شاعری کی تحریر کے کچھ ٹکڑے سناتی ہوں۔

تاہم میں سنجیدہ نہ تھا۔ میرے بچپن کی کہانیوں کی ملکہ جن کے بارے میں پڑھتا، سوچتا، بڑے ہو کر ان کے کرداروں کو ڈرامائی تشکیل دیتا اور رزمیہ نظموں میں انہیں مجسم کرتا چلا آیا تھا۔ میں تو مکاؤں سے بڑا مانوس تھا۔ مجھے زندہ ملکہ دیکھنے کا قطعی کوئی شوق نہ تھا۔ اس ملکہ کو بھی نہیں جسے شاعری اور آرٹ میں دلچسپی تھی۔

پھر وہ آئے۔

یہ اُن دنوں میں سے ایک ایسا دن تھا کہ جو بلوگنا میں شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ آسمان اور زمین سب گرد آلود سے تھے۔ کچھ یوں لگتا تھا جیسے گرد کا یہ طوفان سا گھروں کی چھتوں سے بہہ رہا ہے۔ جیسے یہ دیواروں سے چمٹ رہا ہے۔ جیسے اس کا یہ پھیلاؤ ہر آن گھروں پر بڑھ رہا ہو اور ہر چیز میں سرایت کرنا جا رہا ہو۔ روح تنگ پڑتی اور طبیعت کوفت اور بیزاری میں اُلجھتی ہے۔ جب بندے کا جی خواہنا ہی کسی راہ چلتے کوٹا نگ مارنے کو چاہے تو میں بھی کچھ ایسے ہی جذبات کی تسکین گھیریوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

یہ شام تھی۔ چارنومبر کی شام۔ میں دایا گلیریا Via Galliera کے محرابی راستے کے رش میں پھنس گیا تھا۔ اسی ہنگامے میں میں نے دیکھا ملکہ میرے پاس سے گزری۔ سفید خوبصورت ایک رومانوی سا وجود جو حقیقت نگاری کے بین بین موجود ہو۔ کچھ ہی دیر بعد پیازہ سینٹ پیٹروینا Petronio میں قدیم سرخ اینٹوں والے محل کی کھڑکی کھلی اور بادشاہ اور ملکہ بالکونی میں نمودار ہوئے۔ پس منظر میں روشنیوں کی آب و تاب کی ناقابل بیان جگمگاہٹ تھی۔ باہر کی تاریکی اور سبز سفید اور سرخ روشنیوں کے امتزاج میں ایک خوبصورت چہرے کو زیارت اور بہترین ملبوسات میں دیکھنا ایک تحیر کن تجربہ تھا۔

اور اگلی صبح جب میں اٹلی کے شاہی جوڑے سے ملنے جا رہا تھا۔ میری چھوٹی بیٹی نے کہا۔

”ملکہ کو میرا پیا رکھنا۔ اُس کا نام لیبرٹا Liberta ہے۔ جو اچھا شگون ہے۔“

میں نے چیمبر میں داخل ہوتے ہوئے شاہ کو دیکھا۔ وہ لوگوں سے ہاتھ ملا رہا تھا جو دائرے میں کھڑے تھے۔ اور ملکہ اٹلی کے متوسط طبقے کے مضحکہ خیز ملبوسات پہنے لوگوں کے درمیان کھڑی اپنے پہناوے، اطوار اور رویے کی شائستگی کے ساتھ بیٹھے اور مہربان لب و لہجے میں بات کرتی ایک مادرائی شے نظر آتی تھی۔ بچپن کی مہربان اور حسین پری جیسی۔

یہ ملکہ ہے۔ بس ایسے ہی میرے تاثرات تھے۔ میں نے بلوگنا Bologna شہر کی خواتین کی جانب سے سپاس نامہ لکھنے سے انکار کر دیا۔ وہ قصیدہ جو میں نے پہلے ہی اپنے خیالات اور پیازہ کے تاثرات سے متاثر لکھا تھا بس اسی کو مکمل کرنے کا ارادہ کیا۔ اور ایک دن جب میں اس کی آخری لائنیں لکھ کر فارغ ہوا ہی تھا میری بڑی بیٹی بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی اور اس نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

”شاہ کوپلز میں کوئی مار دی گئی ہے۔“

پچپن برس کی عمر میں وہ اپنا Anni Vivanti سے ملا جو مستقبل کی ایک خوبصورت لکھاری اور شاعرہ بنی اور جس سے اُسے محبت ہو گئی تھی۔ پاگلوں جیسی محبت۔ وہ ہمیشہ جب بھی سفر کرتا تھا اس کے پاس ایک سوٹ کیس ہوتا۔ جسمیں وہ اپنا کی ایک بڑی سی پینٹ رکھتا۔ دوران سفر وہ سوٹ کیس کھولتا۔ پینٹ نکالتا، اسے سوگھتا اور مدھوش سا ہو جاتا۔ دونوں کے درمیان جو محبت مامے لکھے گئے وہ بھی کیا شاہکار ہیں؟

اٹلی کی وہ پہلی شخصیت ہے جسے 1906 میں ادب کا نوبل انعام ملا۔ نوبل انعام ملنے تک وہ دنیا بھر سے شاعری کے میدان میں خود کو منوا چکا تھا۔ سینیٹر کے طور پر بھی وہ نامزد ہوا۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہی ہے تاہم نثر میں بھی اس کا کام اعلیٰ معیار کا ہے۔ ادبی تنقید میں اس نے نئی جہات کا تعارف کروایا۔ بائیوگرافی، تقاریر اور مضمون نویسی کا کام ہی تقریباً 20 سالوں پر مشتمل ہے۔

نوج رہے تھے۔ جب جب بھی میں مسز ریٹاسمٹھ سے ملنے آئی۔

میری اُن کے ساتھ نشست کا دورانیہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہ ہوتا۔ آج پہلی بار وہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ بھی تازہ دم تھیں اور میں بھی۔

”بہت شکریہ آپ کا سز سمنہ۔ شام بہت اچھی گزری۔“
”ہاں کوزیو آپ کی بھی ممنون ہوں۔“



محمود درویش

فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر

- وہ ساری زندگی، اپنے گھر، اپنی دھرتی کے لیے بھٹکتا رہا مگر پناہ گزینی کا کرب اس کے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔
- حیرہ سال کی عمر میں اس کی پہلی نظم ایک سوال تھا اسرائیل سے، ایک احتجاج تھا انسانیت کی علمبردار طاقتوں سے۔
- اسرائیل کے وزیر تعلیم یوسی سارونے اس کی پانچ نظمیں اسرائیلی اسکولوں میں اختیاری مطالعے کے طور پر شامل کرنی چاہیں مگر حکومتی ارکان نے سخت مخالفت کی۔

لوٹ آؤ
 تم اب جہاں بھی ہو جو کچھ بھی بن گئی ہو
 میرے بدن
 اور میرے چہرے کی تپش
 میرے گیتوں اور رزق کا نمک
 مجھے لوٹا دو
 زیتون کی کوئی شاخ مجھ سے لے لو
 میرے لیے کی کوئی سطر
 میرے خیال کا کوئی سلسلہ
 میرے بچپن کا کوئی کھلونا
 مصائب کی اس چہار دیواری سے کوئی اینٹ
 کہ ہمارے بچے اور ان کے بچے رستے کا پتہ رکھیں
 اور لوٹ آئیں

محمود درویش

عورت نے آسمان کو دیکھا
اور چٹائی
ادبا دل میرے محبوب کو ڈھانپ لے
کہ میرے کپڑے
اس کے خون سے شرابور ہو گئے ہیں

زندگی میں خوش قسمتی کبھی کبھی آپ کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ یہ آپ کا
مقرر ہے کہ اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے اندر چلی جائیں یا پھر اسے بند کر دیں۔ فلسطین اور
اسرائیل جانا اور بیت المقدس کو دیکھنے کا موقع ملنا خوش قسمتی ہی تھی نا۔
بات ہے بہت سالوں پہلے کی غالباً 1993ء کی۔ عمان میں اپنے قیام کے

دوران ہول والوں نے اسرائیل کے لئے چند گھنٹوں کا ٹرانزٹ ویزہ دینے کا پوچھا۔ پہلے تو بھونچکی سی ہو کر گرد و پیش کو دیکھا۔ ایک ہا ہا کا رسارے میں مچی تھی۔

آنکھوں میں بے یقینی کی ابھرتی لہروں نے مخاطب کو دیکھا۔ اندر نے جیسے مسرت بھری کلکاری بھری اور سرکوشی کی۔

”ہائے یروشلم جیسے خوابوں کا شہر۔ پہلی للک نے دھما ڈالی۔ کہیں اس کے کوچہ بازار میں پھر تا وہ بے مثل شاعر محمود درویش مل جائے۔ دوسری جذباتی للک نے گدگدی کی۔ سفر میں امکانات اور ممکنات دونوں کی بہتری گنجائش۔ ڈرامائی موڑوں کا ایک نام زندگی بھی۔“

جیسے یہاں کھڑے اس پیشکش کا ملنا۔ تو خوش بختی کی اس آواز کو سنی ان سنی کیوں کیا؟ پکار پر توجہ نہ دی اور خود کو اس نعمت سے محروم کیوں کر لیا جس سے میں نوازی جانے والی تھی؟

یہ کیا حادثہ تھا؟

آج خود سے پوچھتی ہوں، تب میرے انکار کی وجہ کیا تھی؟ پیسے زیادہ مانگے تھے انہوں نے۔ یا اسرائیل کا خوف تھا؟ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ سوچتی ہوں تو جذبات گڈمڈ سے ہونے محسوس ہوتے ہیں۔

تب دہشت گردی کا بھی آج جیسا دور دورہ نہ تھا۔ اسرائیل اور فلسطین میں معمول کی جھڑپیں ضرور ہوتی تھیں۔ خاص طور پر انتفاضہ کے بعد سے۔ مگر اس کے ساتھ ہی دوستانہ تعلقات رکھنے والی عرب ریاستوں سے سیاحتی معاہدے بھی تھے کہ سیاحت اسرائیل کے لئے ایک اہم صنعت کا درجہ لے چکی تھی۔

اب کیسے میں پیسوں کی تو کوئی کمی نہ تھی۔ رہا خوف و خوف کا مسئلہ۔ خوف والے

دن تو میں جمی ہی نہیں تو پھر کیا تھا؟ یہی سمجھنے سے قاصر ہوں۔

پھر کوئی پانچ سال بعد کی بات ہے۔ مصر اپنی سیر کے دوران ایک تو فلسطین کے موضوع پر عام لوگوں سے کھل کر باتیں ہوئیں۔ مختلف آراء سننے کو ملیں۔ تند و تیز اور تلخ تلخ کہ ان فلسطینیوں کو بھی ہارے پڑے ہوئے تھے۔ مہنگے داموں اپنی زمینیں بیچنے کے۔ بیروت میں جائیدادیں خریدنے کے ہوئے تھے۔ خیر سے اب بھگتیں۔ محمود درویش کی شاعری بارے بھی سنا۔ محمود درویش سے دلیں میں بھی چاہتوں، محبتوں اور عقیدتوں کا رشتہ پالے بیٹھی تھی۔ جہاں کہیں خون جگر میں ڈوبی شاعری کا کوئی ٹکڑا پڑھنے کو مل جاتا دنوں تڑپتی رہتی۔

اس سیر سپائے کے دوران صحرائے سینا (Sinai) کے ریگ زاروں سے گزرتے ہوئے خلیج عقبہ (Gulf of Aqaba) کے ساحلی شہریلات اور اسرائیلی شہر رفہ (Rafah) سے ظالم اسرائیل کو شروع ہوتے دیکھنا بڑا تلخ تجربہ تھا۔ یہ سرحدی علاقہ اتفاقی صورت میں چلتا چلتا بحیرہ روم کے مشرقی ساحلوں پر واقع غزہ سے جاملتا ہے جو ایک چھوٹی سی مستطیل پٹی ہے۔

یہیں وہ بد قسمت اور مظلوم قوم جس کا نام فلسطینی ہے محصور ہوئی پڑی ہے۔ مصر کے ساتھ جڑے اس چھوٹے سے حصے میں جیالوں نے سرنگیں بنا ڈالی ہیں۔ ایک ظالم اسرائیل، دوسری ظالم مصری فوجی حکومتیں غزہ کے مجاہدین اور مصر کے اخوان المسلمین سے خائف۔ اوپر سے دلیر اور جیالے فلسطینی مجاہد جنہوں نے سوچتوں اور حربوں سے یہ غیر قانونی راستے بار بار تباہ کئے جانے کے باوجود پھر بنانے ہیں۔ ان سے گزرنا ہے۔ چھاپے پڑنے پر پکڑے بھی جانا ہے۔ سزائیں بھی کاٹنی ہیں اور باز پھر بھی نہیں آنا۔

میں نے بھی جی جان سے اُس سرنگ کے راستے فلسطین جانے کا سوچا۔ خرچہ کچھ

زیادہ نہ تھا۔ لالچی طبیعت نے اب ساری توانائی اس میں جھونک کر اس مقصد کو حاصل کرنے کی اپنی ہی کوشش کرنی چاہی۔ کو یہ آدم خورشیر کے کچھار میں سردینے والی بات تھی۔ پر اس وقت خواہش کے منہ زور اور تند و تیز ریلے کے سامنے بڑی مجبوری محسوس کر رہی تھی۔ فلسطینیوں سے ملنے اور محمود درویش کو دیکھنے کی خواہش چین نہیں لے رہی تھی۔ جی اڈ کر اس زمین پر جانا چاہتا تھا۔

پر برا ہوا یا اچھا۔ میری ساتھی نے ایڑھی نہ لگنے دی۔ زمانے بھر کی ڈرپوک اور دیوی۔

اُسے کون سی کتاب لکھنی تھی جو وہ اس جھیلے میں پڑتی۔ یوں بھی چسکے مارے میرے ساتھ آگئی تھی۔ میرا کیا تھا؟ کھا کھٹ بیٹھی تھی۔ مانی دادی جو بالعموم کاٹھ کباڑ کا سامان بن کر کھڈے لائن لگی ہوتی ہے۔ اندر بھی ہو جاتی تو خیر صلا۔

انہیں دنوں ایک اور واقعہ بھی ہوا۔ میری خلیری بہن ڈاکٹر رضیہ حمید جو عرصہ چالیس سال سے امریکہ میں مقیم، وہاں کی شہری، امریکہ میں کام کرتی، انسانی حقوق کی مختلف تنظیموں سے وابستہ Peace Now کی طرف سے تین ماہ کے لئے اسرائیل گئی۔ تین ماہ بعد واپس آ کر اُس نے فلسطین کے شہروں غزہ، رملہ، ویسٹ بینک اور اسرائیل کے حیفہ، عکا، یروشلم اور بیت اللحم کے جو قصیدے پڑھے۔

غزہ کی بوڑھی عورت کے زیتون کے باغ میں زیتون کے درختوں پر چڑھنے، انہیں تو ڈر گھر لانے اور دتی مشین سے تیل نکالنے کے قصے سنائے۔ اسرائیل کی ظالمانہ کہانیاں، اس کے ظالمانہ ہتھکنڈے، حماس کی خدمت خلق، ان کے جذبات کی شدتیں، الفتح کی سیاست، اور سب سے بڑھ کر محمود درویش سے ملاقات۔ اس کی شاعری کے ٹکڑے اس کی اپنی زبان میں سنوائے تو میری حالت قابل دیدنی تھی۔ حسرتوں کا دھواں تھا جو مجھے سلگا

سُلاگا کر مارے جا رہا تھا۔ مگر ہو کیا سکتا تھا۔ قہر درویش بر جان درویش والا معاملہ تھا۔
 مصر پر جو کتاب لکھی تھی۔ ”مصر میرا خواب۔“ جب چھپی تو سوچا کہ اس کی کچھ
 تقریب کا ہی اہتمام کروں۔ سچی بات ہے کتاب لکھ کر اُس کی رونمائی کروانا بھی اب بیٹی کو
 بیاسہنے کی طرح ایک مجبوری بن گئی ہے۔ سوچا کہ بھی مصر پر لکھا ہوا مصر والوں کو بھی خبر کرو۔
 یہ کیا کہ سوتے ہوئے بچے کا منہ چوم رہی ہوں، نہ ماں کو خبر نہ بیو کو پتہ۔ تھوڑی سی بل جل
 کرو۔ کتاب سفیر صاحب کو بھیجی اور ساتھ ہی انہیں لاہور آنے کا سدا بھیج دیا۔ جواب
 آیا۔

بڑے مشکور ہیں ہم کہ آپ نے ہمارے دیس پر لکھا۔ اب حق تو ہمارا بنتا ہے۔
 پچاس لوگوں کی بارات لے کر جولائی کے پہلے ہفتے ہمارے گھر اسلام آباد و تشریف لے
 آئیں۔ اب اس الیلی داستان کی روئیداد کی تفصیل کا کیا ذکر کہ من آنم و من دانم۔ بہر حال
 سفارت خانے کی اس نوازش کا بہت شکریہ کہ بہتری عزت دے ڈالی جس کا ہمیں گمان تک
 نہ تھا۔

تقریب کا اہتمام سفارت خانے نے اپنے قومی دن کے موقع پر کیا۔ میری
 خوش قسمتی کہ مشرق وسطیٰ کے سبھی ممالک کے سفیر اور ان کی بیگمات تشریف لائیں۔ یہیں
 تقریب کے اختتام پر ایک اونچے لمبے نوجوان نے اپنا تعارف ابوشعیب الہیثم سفیر فلسطین کی
 حیثیت سے کرواتے ہوئے کہا۔

”ہمارے ملک فلسطین پر لکھیے نا۔“

لومیاں۔ ہمارے تو ننھے پھولے۔ جی باغ باغ ہوا۔ سالوں پرانی خواہش کی
 تکمیل کے آثار نمودار ہوئے۔ فلسطین پر بھلا کس کا فر کا جی لکھنے کو نہ چاہے گا اور فلسطین کی
 سر زمین پر اُترنے کی تمنا کون نہ کرنے گا؟ اور محمود درویش سے کون ملاقات کرنی نہ چاہے گا؟

اب پاسپورٹ اور درخواست فوری بھیجنے کو کہا گیا۔ چلو بھیج کر انتظار میں بیٹھ گئی۔ شوق و اضطراب بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ چند بار رابطہ کیا۔ لہجے کی بیتابی اور شتابی پر صبر اور حوصلے کی تلقین کی گئی۔ کارگزاری کی رپورٹ بلاشبہ بڑی مسرور کن تھی۔ اس بے چاری نمائی سی عورت کا ذکر صدر فلسطین جناب محمود عباس سے ہوا تھا۔ انہوں نے کہا۔ اعلیٰ و سہلاً، جم جم آئیں سو بسم اللہ، سر متھے سر آنکھوں پر۔ پاکستان اور پاکستانی ہمیں بہت پیارے۔ وہاں کی وزارت اطلاعات کی چیف سیکریٹری ہماری آمد کی تہہ دل سے منتظر اور اسرائیل خانہ خراب کے ہاں بھی تذکرہ ہو گیا تھا۔

روز خواب بنتی۔ ہائے محمود درویش سے ملوں گی۔ تو فیق زیادہ سے کہوں گی کہ تمہاری شاعری دل بڑ پاتی ہے۔

دو تین بار فون کر کے صورت حال جاننا چاہی۔

”کوشش ہو رہی ہے۔ گھبرائیے نہیں۔“ جواب ملا۔

ایک دن جب میں جنگ اخبار کی ریفرنس لائبریری میں بیٹھی ”سری لنکا“ کی فائل دیکھ رہی تھی۔ ماحول کی خاموشی اور سنائے کو فلسطینی سفارت خانے سے آنے والی آواز نے توڑا۔ بوشنبی بول رہے تھے۔

”اسرائیل نے آپ کو اوکے کر دیا ہے۔ پر ساتھ ہی چند شرائط بھی عائد کر دی ہیں۔ سن لیجیے۔“

میں دھڑکتے دل کے ساتھ سنتی تھی۔ کڑی شرائط میں سب سے اہم فلسطین کے مسئلے پر نہ لکھنے کا وعدہ تھا۔ یروشلم میں داخلے کی کوئی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔ چند اور بھی ایسی ہی بے تکلی باتیں تھیں۔ فون بند ہو گیا تھا۔ اب خود سے پوچھنا ضروری تھا تو میں نے وہاں کرنے کیا جانا ہے؟ اگر لکھنا نہیں؟ پھر چند لمحوں کی چپ کے بعد میرا اندر جیسے پھڑک اٹھا

تھا۔

”ہے بالعتقی۔ یہ اسرائیل بھی۔“

اب یہ بھی کہیں ممکن تھا کہ فلسطین پر جس انداز سے بھی لکھا جائے اسرائیل کا ذکر نہ آئے۔ اس کے وجود کا کیفر اور اس کے بغیر ہی۔ یعنی افسانہ آئیں بائیں شائیں سے بھر جائے اور اصل قصے سے رہ جائے یا شاعر کے خوبصورت لفظوں میں کہ وہ بات جس کا سارے فسانے میں ذکر نہ تھا والی بات ہو۔

گھر واپس آ کر میں نے خود پر لعن طعن اور پھٹکا رکا پٹارہ کھولا جس میں اس سے پہلے بھی بیسویں بار میں اُسے غوطے دیتی رہتی ہوں۔

خیر سے میری امیدوں پر جلد ہی پانی پھر گیا۔ ابو حنیب نے ایک دن بتایا کہ ظالم اسرائیل جو مشکل سے پٹری پر چڑھا تھا ایک گڑگڑا ہٹ سے نیچے اتر گیا ہے۔ اب ٹھنڈی ٹھار ہو کر بیٹھ جانے والی بات تھی۔

پھر یونہی ادھر ادھر کہیں کسی پرچے، کہیں نیٹ پر اس کی شاعری پڑھتے پڑھتے ایک دن میں نے بھی ہزاروں پاکستانیوں کی طرح اس خبر کو بوجھل دل سے سنا اور ٹی وی پر دیکھا کہ وہ بے خانماں شاعر جسے بے شمار ملکوں اور عظیموں کی طرف سے بے شمار ایوارڈز اور انعام دیئے گئے مگر جس کا سب سے بڑا انعام وہ بے پایاں محبت اور پیار تھا جو اُسے فلسطینیوں نے اپنا قومی شاعر قرار دینے کی صورت دیا۔

لاکھوں عربوں نے اُسے دل کی مسند پر بٹھایا اور اُسے فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر کہا۔ وہ جو اول آخر فلسطینی تھا۔ حیات میں بھی اور موت میں بھی۔ وہ جو عربوں کی نمائندہ ثقافتی شخصیت کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ خوبصورت سوز و گداز سے لبالب بھری شاعری کا خالق ہوسٹن کے ہرمن اسپتال میں فوت ہو گیا تھا۔ فلسطین میں دفن ہونے کی اس کی آخری

خواہش پر اُسے فلسطین لایا گیا۔ فلسطینی صدر محمود عباس نے تمام مذہبی رسومات میں حصہ لیا اور راملہ میں اُسے قومی شاعر کے طور پر پورے اعزاز سے دہنایا گیا۔ قومی سطح پر تین روز اس کا سوگ منایا گیا۔

تو اس کی حیاتی بارے کوئی ورقہ کھولنے سے پہلے میں اس کی ایک نظم پڑھتی ہوں۔

دو سے آٹھ شہیدوں

اور دس زخمیوں

بیس گھروں

اور پچاس زیتون کے پیڑوں کا

قتل عام ہمارا روزانہ کا نقصان ہے

یہ اوائل بہار کا خوشگوار چمکتا روشن دن 13 مارچ تھا۔ سن 1942ء جب وہ مغربی گلیلی کے بالائی علاقے کی سرسبز پہاڑی پر واقعی گاؤں البرودہ Al-Birwa کے رہائشی سلیم اور حور یہ دوریش کے ہاں ان کا دوسرا بچہ محمود پیدا ہوا۔ زمیندار گھرانہ تھا۔ ماں کو ان پڑھ تھی۔ مگر والد صاحب علم تھا۔ بہو کو لکھنا پڑھنا اُسی نے سکھایا تھا۔

چھ سال کا تھا جب اُسے اپنے سرسبز و شاداب گاؤں سے بھاگنا پڑا۔ جون 1948ء کی وہ رات اس کی یادوں میں اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ ساری زندگی جھانکتی رہی تھی۔

اُس کی آنکھوں میں خواب تھے اور ماں جھنجھوڑے چلی جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ اونچے چلاتی تھی۔

”اٹھو اٹھو میرے بچے، کمبخت صہیونیوں نے حملہ کر دیا ہے۔“

کچے خواب دیکھتی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلتے، معصومی یا دوں کی گھڑی اٹھائے وہ ماں کا ہاتھ تھامے سینکڑوں لوگوں کے ساتھ کھائیوں، بیوں جنگلوں میں ننگے پاؤں بھاگتا تھا۔ تعاقب میں کولیاں تھیں۔

پتہ نہیں ماں قافلے سے بچھڑ کیسے گئی اور دن طلوع ہو گیا تھا۔ وہ اُسکا ہاتھ تھام کر قریبی کھیت میں چھپ گئی۔ سورج کی گرمی، بھاپ چھوڑتے ڈھنڈھل اور بھوکا پیاسا وہ۔ رونے لگتا تو ماں ہونٹوں پر انگلی رکھ دیتی کہ آواز نہ نکلے۔

پھر ایک موٹا تازہ فوجی ایک ہاتھ میں بندوق تھامے اور دوسرے ہاتھ سے ڈھنڈھلوں کو ہٹاتا ان کے سر پر آکھڑا ہوا۔ اونچی آواز میں پوچھا تھا اُس نے۔
”مردواہ سے ہو؟“

ماں کی خوبصورت آنکھوں کی پتلیوں میں خوف جیسے ٹھہرے ہوئے پانیوں کی طرح ساکت تھا۔ اُس سے بولا تو گیا ہی نہیں۔ بس سر ذرا اثبات میں ہلا۔
”بھول جاؤ اُسے۔ پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھنا ورنہ کولیاں چھلنی کر دیں گی۔“

ماں اُسکی انگلی پکڑے بھاگتی گئی۔ اور یہ بھاگتا اُس کی زندگی کا وہ تلخ ترین حادثہ تھا جس نے اُسے ساری زندگی مضطرب رکھا اور وہ ساری زندگی یہاں وہاں گھر کیلئے، اپنی زمین کے لئے بھاگتا اور بھٹکتا رہا۔

پہلی پناہ گزینی لبنان میں ہوئی۔ کس درجہ المناک اور دکھ بھرے احساسات میں وہ محصور رہتا تھا۔ In memory of forgetfulness میں وہ لکھتا ہے۔

مجھے اپنا ہر ابھرا گاؤں یاد آتا۔ اپنا بڑا سا گھر۔ اُس کا وسیع و عریض آنگن، اس کی کیا ریوں میں چنبیلی اور گلاب کے بوئے، زیتون کے پیڑ، چھوٹے بہن بھائی اُن کی

شرارتیں اور لڑائیاں۔ مردان خانے کا بڑا کمرہ اور اس کا آنگن جہاں میرے دادا کے پاس ارد گرد کے علاقوں کے معززین اور گاؤں کے لوگ آتے۔ قہوہ اور کافی کی سروس چلتی۔ کوئی کتاب پڑھتا اور باقی سب سنتے۔ کبھی قدیم اور کبھی جدید شاعری سنی جاتی۔ اس پر حاشیہ آرائی ہوتی۔ یہ عرب روایات تھیں جن سے ہم محروم ہو گئے تھے۔ نئے ماحول کا دن اگر تکلیف دہ تھا تو راتیں اُس سے سواتھیں کہ آنسو گالوں پر بہتے جاتے اور میں کبھی خود سے اور کبھی اپنے ہم عصر مقامی بچوں سے ایک ہی سوال بار بار پوچھ چلا جاتا کہ ”آخر ہمارا گھر ہم سے کیوں چھن گیا؟“

یہاں کوئی چیز اگر مانوسیت رکھتی تھی تو بس یہی زبان تھی۔ اس جبراً وطنی کے یہی شب و روز تھے جنہوں نے اُسے ایک چھوٹے معصوم بچے سے بڑے میں بدل دیا۔ اس کے سب خواب اور بچنے کی چہلیں جیسے کہیں اڑ پڑ گئی تھیں۔ کھانے کے لئے لمبی قطار میں لگنا پڑتا تھا۔ جو سرکاری امدادی محکمہ تقسیم کرتا تھا۔ کتنے ہی ایسے نئے لفظ اس نے پہلی بار سنے۔ وطن، مہاجرین، جنگ، سرحدیں۔ جنہوں نے آنے والے دنوں میں بہت کچھ سمجھایا اور سکھایا اور اُس سے اس کا رہا سہا بچپن بھی چھین لیا۔

جیزن Jezzin اور دیمور Damour میں ایک سال رہنے کے بعد واپسی کا فیصلہ ہوا۔ وہ رات انہوں نے چوری چھپے وطن واپسی کی تو گاؤں ملیا میٹ ہو کر اسرائیل کے نئے منصوبے کی آماجگاہ بن رہا تھا۔

بد قسمتی کہ وہ اسرائیلی علاقوں میں رہ جانے والے فلسطینی عربوں کی مردم شماری میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ خاندان عکہ میں دیرالاسد میں قیام پذیر ہوا۔ مگر اپنی جنم بھومی میں آکر وہ ہجرت اور پناہ گزینی کے ایک اور کرب سے گزرنا جو اُس کے حساس ذہن پر ہمہ وقت کچو کے لگاتا تھا۔

مدرسے میں ہوتا تو اچانک کسی اسرائیلی فوجی افسر کے آنے پر اُسے چھپا دیا جاتا۔ جب پولیس گاؤں آتی تب بھی یہی عمل دہرایا جاتا۔ کسی الماری میں، کسی بیڈ کے نیچے، کسی غسل خانے میں، کسی مجرم کی طرح چھپا وہ سوچوں کے دہکتے جہنم سے گزرتا۔ گھر کے بڑوں کی تائید تھی کہ گفتگو میں لبنان کا کبھی ذکر نہ آئے کہ وہ حملے کے وقت وہاں چلے گئے تھے۔

میں ذہین اور ہونہار طالب علم تھا۔ شاعری کے ساتھ مصوری بھی میرا شوق تھا۔ میں کلوں سے دیواروں پر ایسی تصویریں بنانا کہ یقین سے ماورا ہوتیں۔ میرے والد، میرے عزیز اور ملنے جلنے والے حیرت کا اظہار کرتے۔ میری یہ مشق بس دیواروں اور روڈی کاغذوں تک ہی محدود رہی کہ والد کے پاس رنگوں اور برش کے لئے پیسے ہی نہیں ہوتے تھے۔ اپنی غربت کا مجھے شدید احساس تھا۔ مصوری کے شوق کے پورا نہ ہو سکنے نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا کہ یہ سہولت اور مفت میں ہو جانے والا ہنر تھا۔ میرے ساتھ نہ میری نثر کی بھی بڑی حوصلہ افزائی کی۔

پہلی نظم جو اُسے تیرہ سال کی عمر میں پڑھی وہ ایک صدائے احتجاج تھی۔ وہ ابھی مدرسے کا طالب علم تھا اور اسرائیل اپنی آٹھویں سالگرہ منا رہا تھا۔ عرب رہائشی علاقوں میں جلسے، جلوس، ریلیاں اور سکولوں میں تقریری مقابلے ترتیب دیئے گئے۔ اُس نے بھی اپنے سکول میں ہونے والی تقریب میں حصہ لیا۔ مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے دلی جذبات کا اظہار ایک نظم کی صورت میں کیا۔ یہ نظم ایک احتجاج تھی اُس کے اندر کے جلتے کرب کا اظہار تھی۔

ایک عرب لڑکے کے اسرائیلی لڑکے سے سوال تھے۔

تمہارے پاس گھر ہے

میرے پاس گھر کیوں نہیں؟

تم جیسے چاہو جس طرح چاہو

سورج کے نیچے کھیل سکتے ہو

میں کیوں نہیں؟

خوشیاں تمہارے لئے ہیں

میرے لئے کیوں نہیں؟

میں ایک پناہ گزین کیوں ہوں؟

تم اور میں اکٹھے مل کر کھیل کیوں نہیں سکتے؟

اگلے ہی دن اُس لڑکے کو جہاد الکردم کے فوجی دفتر میں بلا کر اس قدر ڈرایا دھمکایا

گیا۔ فوجی انچارج کا لہجہ اس وجہ دہشت اور توہین آمیز تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا

اور خود سے سوال کرتا رہا کہ آخر اُس کا جرم کیا تھا؟ اپنے اس سوال کا جواب پوری فصاحت

کے ساتھ اُسے بہت بعد میں ملا۔

تاہم کفر یا سیف کے ہائی سکول کے دوران میں اُس کی زندگی میں ایک یہودی

شخصیت نے بڑا مثبت کردار ادا کیا۔ وہ اس کی اُستاد سوشل تھی۔ اس کے اندر ممتا تھی۔ وہ نیک

سیرتی کی علامت تھی۔ اُس نے نفرت کی آگ سے اُسے نکالا۔ ہائم یا ایک جیسے شاعر کی

شاعری پڑھنے پر اُسے اُکسایا۔ یہ وہ روشن کردار تھا جو ہمیشہ اس کی یادوں میں جھللاتا رہا۔

In memory of forgetfulness اس وقت میرے سامنے کھلی پڑی

ہے۔ اُن محرومیوں پر میں اٹک بارہوں جو اُس ذہین بچے کی جھولی میں وقت نے

ڈالیں۔ جنہوں نے اُسے پل پل تڑپایا اور سوالوں کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔ وہ اپنے ایسے

ہی دنوں کی تلخ یادوں میں سے گزرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میری یادوں میں وہ بوڑھا ہمیشہ کسی لو کی طرح دمکتا ہے۔ اسرائیلی ریاست کے

قیام کے بعد کی پہلی مردم شماری کے وقت ہم لبنان میں تھے۔ جب دو سال بعد واپس آئے تو کوہا ہم infiltrators (بھگوڑے) تھے۔ یعنی صدیوں سے اپنی ہی دھرتی پر رہنے والے نگیینوں کی نوکوں پر نکالے جانے والے دو سال بعد infiltrators بن گئے تھے۔ یہ ہمارے پرکھوں کا وطن اُن کا ملک بن گیا تھا۔ ذیرالاسد Dayr-Al-Asad میں کوئی سوچ سکتا ہے یہ کیسا نفسیاتی کمپلیکس تھا۔

اور وہ بوڑھا بھی تو ایسے ہی مسئلے کا شکار تھا جو ہر رات کو قریبی گاؤں سے آتا۔ اُسی کی آواز میں کیا درد اور سوز تھا۔ رباب پر وہ اپنی کہانی گاتا۔ کیسے اس نے گھر چھوڑا اور کیسے باڈر پار کیا؟ اور کیسے وہ واپس آیا؟ رات ہوتی۔ آسمان پر چاند ہوتا یا گھپ اندھیرا اور ہر دل کو مٹھی میں بچھنے والی یہ شاعری اور موسیقی ہوتی۔ یہیں مجھے احساس ہوا کہ درد کیسے لفظوں کو احساس دے کر انہیں باہر نکالتا ہے اور آرٹ کیسے عام چیزوں کی کوکھ سے ہی نکل آتا ہے۔ اب کیسے نہ ہمارے منظر میری یادداشتوں میں ابھرتے جو میں اپنے گاؤں البرودہ میں دیکھتا تھا جو میری یادوں کا حصہ تھے۔

یادوں کے اسی جہوم میں گھرا وہ کچھ اور منظروں کے چہروں سے پردہ اٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں شاعر بن کر اپنے اندر کے اُس بچے کو کھوجتا رہا جو اس کے اندر تو تھا۔ پر جسے وہ کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ شاعر تو بڑا ہوتا گیا مگر وہ بچہ جسے اُس نے بڑا ہونے نہیں دیا۔

سچ تو یہ ہے کہ میری اور میرے مادر وطن کی کہانی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ کم عمری میں ہی گھر چھوڑ دیا۔ شاید مجھے احساس تھا کہ میں اپنے خاندان کا ایک نظر انداز کیا ہوا ناکارہ اور غیر ذمہ دار لڑکا ہوں۔ کم از کم اپنی ماں سے مجھے ہمیشہ یہی تاثر ملا۔ بہت ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن کرتی تھیں اور شاید سمجھتی تھیں کہ گھر کے ایتر حالات میں کچھ میرا بھی ہاتھ ہے۔

1956ء میں غزہ پر قبضے اور مصر پر حملے کے خلاف ہڑتالوں اور احتجاج کی

صورت جیل میں تھا۔ جب میری ماں جیل آئی اور انہوں نے میری پیشانی چومی۔ میرے لئے وہ پھل اور کافی لائیں۔ یہ وہ پہلا دن تھا جب میں نے جانا کہ میں غلطی پر تھا۔ وہ مجھے پیار کرتی ہے۔ کیسی ناقابل بیان مسرت تھی۔ جیسے میرے اندر قندیلیاں سی جل اٹھی ہوں۔ جیل نے مجھے ماں کی محبت کا احساس دلایا تھا۔ جیل میں ہی میں نے اپنے احساسات پر وہ نظم لکھی۔

"I long for my mother's bread"

اپنی ماں کے ہاتھوں کی کافی

ماں کے ہاتھوں کی پھینٹی ہوئی

بچپن میرے اندر عود کر آیا ہے

دنوں نے اپنی تہیں کھول دی ہیں

اور یہ مجھے کتنے عزیز ہیں

کیونکہ اگر میں مر جاؤں

میری ماں کے آنسو مجھے شرمندہ کریں گے

اگر میں کسی دن واپس آؤں

تمہاری پلکوں پر کسی شال کی طرح

اپنا ہاتھ

میری ہڈیوں پر پھیرنے دو

اپنے بالوں کے کندھوں سے ہمیں باندھ لو

اپنے لباس کی ڈوریوں سے ہمیں اپنی پشت پر کس لو

اگر میں تمہارے دل کی گہرائیوں کو

چھوڑ لوں

تو میں خدائی دیوتا کا روپ دھار لوں

اپنی ماں کے ہاتھوں کی روٹی

میری دلی تمنا

مجھے سنبھال لینا اگر میں کبھی واپس آؤں

اپنے او دن میں ایندھن کے طور پر

جو تمہارے پکانے میں مدد کرے گا

اپنی چھت پر پھیلائے کپڑے کی طرح

جیسے تم ڈالتی اور سمجھتی ہو

میں تمہاری روزانہ کی دعاؤں میں

شامل ہونا اور وہاں رہنا چاہتا ہوں

میں بڑا ہو گیا ہوں

مجھے میرا وہ بچپن لوٹا دو

ہجرت کرنے والے پرندوں کے ساتھ واپس آؤں

تمہارے گھر میں جہاں میری واپسی کا انتظار ہو

یہ کیسی اثر انگیز نظم تھی۔ آنسو میرے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ جانے کتنی دیر میں

پسرانہ اور مادرانہ جذبات کے اس نوسطیجیا میں کھوئی رہی۔

شاعر نے پھر کہیں متوجہ کیا تھا۔

1960ء میں اُس نے ہائی سکول مکمل کیا اور حیفہ چلا گیا۔ یہاں اسرائیلی کمیونسٹ

پارٹی را کھا Rakah اور پارٹی کے ترجمان اخبار الاتحاد اور ہفتہ وار الجدید کے عربی سیکشن کا

انچارج بنا۔ 1970ء میں وہ ماسکو تعلیم کے لئے چلا گیا۔ ایک سال بعد اُس نے قاہرہ میں ”الاہرام“ میں ملازمت کر لی۔ کچھ عرصے بعد پی ایل او میں شامل ہوا۔

شاعری اُس کے خیر میں رہتی تھی۔ اس کی شاعری کا پہلا دور ہجرت کے اُن دکھ بھرے تجربات پر ہے جو اُس نے دیکھے، جن سے وہ گزرا اور جو اُس نے سہے۔ دوسرا نیز ایک بڑے کیونوں کی صورت میں سامنے آیا جس میں لبنان جیسے خوبصورت ملک پر اسرائیل کی وحشیانہ بمباری، بیروت پر جیٹ فائٹرز کی چیختی ڈھارتی آوازوں نے گلوکاروں کی میٹھی آوازوں اور موسیقی کے سروں کو نگل لیا۔ شیلنگ نے شہر کا حُسن گہنا دیا۔ آگ اور خون نے انسانیت کو قتل کر دیا۔ صابرہ اور راشیہ کے کمپوں کی حالت زار اور اسرائیل کی جا جا پر بدیت اور رد عمل کے طور پر انتقاد۔

درویش کی شاعری ہمیشہ اس کے انفرادی اور اجتماعی رویوں، سیاسی مآلصافیوں اور وطنی دکھوں کے گرد گھومی رہا۔ ہم جب وہ اسرائیلی چال بازیوں ان کے خود ساختہ وضع کردہ دہرے معیاروں کی کھینچا تانی میں لڑھکتا اپنا خون جگر پیتا تھا۔ تب ذاتی احساسات پر مبنی بہت کچھ لکھا گیا۔

زیتون کی شاخ

اس کی چھاتیوں پر شام پھول کی طرح کھلتی ہے

وہ پرندے کا خواب دیکھتا ہے

اور لیمن کے پھولوں بارے بات کرتا ہے

اس کے لئے مادر وطن وہ کہتا ہے

جیسے ماں کی بنائی ہوئی کافی پی جائے

جیسے رات پڑنے پر گھر واپس آیا جائے

اور میں نے دھرتی بارے پوچھا

اس نے کہا تھا

میں کچھ نہیں جانتا

اُسے اسرائیل میں رہنے والے بیشتر یہودی دانشوروں کا رویہ ناقابل فہم لگتا تھا۔
اُس کا کہنا تھا کہ میں سمجھ نہیں سکتا وہ کیسے ادیب ہیں جو دنیا میں کہیں بھی یہودیوں پر گزرنے
والے کسی حادثے یا تکلیف پر مضطرب ہوا محنتی ہیں؟ وہ اسرائیل میں رہنے والے عرب
فلسطینیوں کے لئے بے چارے کیوں محسوس نہیں کرتے؟

وطن کی جیل زیادہ خوبصورت ہے

جلا وطن ملکوں کے باغوں سے

انہوں نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا

مسکراتے ہوئے، ہنستے ہوئے

اور رویاؤں کے کنارے لگا ہوں پر

اندھا دھند کولہ باری کر دی تھی

وہ تو ہر بات اور ہر معاہدہ بھول جاتے ہیں

گزرتے دنوں کے ساتھ ان کی انگلیاں موٹی ہوتی جائیں گی

زنگ آلود آئینوں پر انہیں

اپنے چہرے نظر نہ آئیں گے

یوں یہ اچھا ہے باغ پھیلتا جائے گا

خزاں سے پہلے جب وہ واپس آئیں گے

ہم ابھی تک کون ہیں

ہمیں صحرا میں کون واپس بھیجے گا

اُس کے یہی جذبات تھے کہ اُس نے اپنے ہر ادارے میں اس مسئلے کو چھیڑا اور
اپنے اسرائیلی ہم وطنوں سے سوال کیا قوموں کے درمیان بنیادی تضادات کیوں پیدا ہوں
اگر ان کے باہمی تعلقات مساوات اور انصاف کی بنیادوں پر قائم ہوں۔
”گیا رہو یں سیارے“ میں وہ کہتا ہے۔

میں دو جنتوں کا وہ آدم ہوں
کہ جن سے دوبار نکالا گیا ہوں
مجھے بہت آہستگی سے نکالو
مجھے آرام سے مارو
گار شیا لورا کے ساتھ
میرے زیتون کے پیڑ کے نیچے دفن کر دو
اب اس کی ایک اور نظم لہو پر ہے۔

یہاں پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر
شام کے دھند لکھوں میں
وقت کی توپ
ان ڈوبتے سایوں کے جھوم کو نگل رہی ہے
ہم وہی کرتے ہیں
جو قیدی کرتے ہیں
اور جو بے کار لوگ کرتے ہیں
ہم امیدیں کاشت کرتے ہیں

محمود درویش کا کہنا ہے کہ میں باوجود ان دکھوں اور تکلیفوں کے جو ظلم سے پیدا
ہوتی ہیں۔ اور جو ہمیں متاثر کرتی ہیں خود کو منفی نہیں ہونے دیتا۔ انسانیت کا اہم عنصر اپنے
اند رزندہ رکھنا چاہتا ہوں اور رکھتا بھی ہوں۔

میری محبت اگر تم بارش نہ بن سکو

تو درخت بن جاؤ

زرخیزی سے لبالب بھرا ہوا

درخت بنو

میرے پیارا اگر تم درخت نہ بن سکو

تو پتھر بن جاؤ

نچی سے پور پور بھیگا ہوا

پتھر بنو

میرے محبوب اگر تم پتھر نہ بن سکو

تو چاند بن جاؤ

ایک چاہنے والی عورت کے خواب میں فروزاں چاند

میں جن حالات میں رہتا ہوں اس پر جھنجھلا تا نہیں ہوں۔ ہر شام اپنے کمرے

میں بیٹھا یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں کہ میرا رشتہ صرف آفتاب سے ہے کیونکہ رات کو میں

اسریلی قانون کے تحت باہر نہیں نکل سکتا۔ خود سے کہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے کیسی عزت بخشی

ہے کہ میرا ماطہ روشنی سے جوڑ دیا ہے۔

ہر روز چار بجے مجھے تھانے جا کر اپنے وجود کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ میں دل میں

کہتا ہوں ہم نے دن رات کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اُن کیلئے رات میرے لیے

دن۔ ہم جانتے ہیں کہ رات سے دن زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ زیادہ پر اُمید ہوتا ہے۔ تو میں فائدے میں ہوں اور اسرا نیلی پولیس نقصان میں۔

میں ہمیشہ چاہتا ہوں کہ قومی تعصب سے بالاتر رہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب میں نے A Soldier dreams white lilies لکھی اور مجھ پر دو تین شامی ادیبوں نے تنقید کی کہ یہ میری محض خیالی کردار نگاری ہے۔ میں نے ان کی بات کو رد کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انسانوں کو ایک ہی پلڑے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اس خطے میں رہنے والے یہودیوں کے ساتھ بطور انسان تو کوئی لڑائی نہیں لڑائی تو صرف عرب قومیت اور صیونیت کے ساتھ ہے۔ یہاں وہ اپنے یہودی دوستوں سے کہتا ہے۔

میرے وجود میں ایک دل کی ضرورت ہے
ایک بندوق کے میگزین کے وزن کی ضرورت نہیں
میں مرنے سے انکاری ہوں
اپنی بندوق کو محبت میں بدلتا ہوں

وہ سوال اٹھاتا ہے کہ آخر ہم کیوں یہ چاہتے ہیں کہ جذباتی اور جانب دارانہ احساسات کی شاعری ہی توڑے۔ نہیں یہ عقل سلیم کو قائل نہیں کرتی۔ ضرورت ہے کہ اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کیلئے اعلیٰ فنی معیار اپنایا جائے۔ جیسی میری نظموں نے دنیا میں میرے موقف کی بھرپور تائید کی ہے۔ ”شناختی کارڈ“ کو ہی دیکھیں۔

رجسٹر میں لکھو میں ہوں عرب
کارڈ کا نمبر ہے اکاون ہزار
میرے بچے آٹھ ہیں
اور نواں آنے کو ہے گرما کے بعد

تم نے ہی چھینے ہیں مجھ سے
 باغ تھے جتنے میرے اجداد کے
 اور چھیننا ہے زمین کا وہ قطعہ
 ہاں تو پہلے صغے پر لکھو

مجھ کو انسانوں سے کوئی بغض یا نفرت نہیں
 لیکن اتنا ہے کہ میرا رزق اگر چھن جائے گا
 غاصبوں کا گوشت بھی کچا چبا جاؤں گا میں
 بس ڈرو تم بھوک سے میری ڈرو
 اور میرے غیض و غضب سے ڈرو

یہی وہ نظم تھی۔ بیٹا وقت ہوایا (شناختی کارڈ) جو نظارت کے سینما گھر میں پڑھی
 گئی اور جس پر خوفناک رد عمل سامنے آیا۔ دنوں میں یہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ایک احتجاجی
 گیت کے طور پر پوری عرب دنیا اور ترجمہ ہو کر یورپ میں پھیل گئی۔

سلام + شلون بھی ایک ایسی ہی نظم ہے
 تم جو دروازے میں کھڑے ہو
 اندر آؤ

ہمارے ساتھ عرب قبو دیو
 تمہیں احساس ہوگا
 کہ تم ہماری طرح کے ہی انسان ہو
 تم جو گھروں کے دروازوں میں کھڑے ہو
 ہماری صبح کے اوقات میں

باہر تو نکلو

ہمیں بھی یقین آئے

کہ ہم بھی تمہاری طرح کے ہی انسان ہیں

محمود درویش نے دو شادیاں کیں اور دونوں ناکام ہوئیں۔ پہلی بیوی رعنا قبانی رائٹر تھی۔ دوسری شادی ایک مصری مترجم سے ہوئی۔ حیات جینی۔ بچہ کوئی نہیں تھا۔ درویش کی نظموں کی دنیا ریٹا کون تھی؟ ریٹا کو ایک مفروضہ بھی کہا جاسکتا ہے جو ایک خاص عورت کی اشارے کنایے میں عکاسی کرتا ہے۔ یہ نام ایک شدید خواہش، طاقت، ذہانت، کمزوری، دوری الغرض بہت سی علامتوں کے مظہر کے طور پر بھی اس کی شاعری میں ظاہر ہوا ہے۔ ایک جگہ اس کا اظہار دیکھیے کیسے ہوا۔

میں تو تم سے محبت کرنے پر

مجبور ہوا ہوں

اس لئے تھوڑی

کہ تم بہت ہی حسین ہو

بلکہ اس لئے

کہ تم بہت گہری ہو

خوبصورتی سے محبت کرنے والا

بالعموم یوقوف ہوتا ہے

لیکن وہ دراصل ایک خوبصورت یہودی عورت تھی۔ جس سے وہ محبت میں اس وقت مبتلا ہوا جب وہ جیمہ میں رہتا تھا۔ یہی تعلق فلم "شناختی کارڈ" کا موضوع بنا جسے فلم ساز اہتنام مارانہ نے بنائی جو خود مسلمان تھی اور جسے ایک یہودی سے شادی کی تھی۔

شاید اس میں کہیں جھگڑے کا کوئی تاثر اُبھرنا ہو۔ جب قومی اختلاف جسم کو محبت کرنے اور محبت بھری کہانی بننے سے روکتا ہو۔ میری نظموں میں ریٹا وہی یہودی خاتون ہے۔ کیا یہ ایک راز ہے؟ یہ راز جسے میں کھولتا ہوں۔

ریٹا اور میری آنکھوں کے

درمیان رائفل ہے

وہ جو کوئی ریٹا کو جانتا ہے

وہ کھٹے جھکنا اور دعائیں لگتا ہے

اُن شہد جیسی رنگت والی آنکھوں میں

الوہیت کے سائے ہیں

ہمارے درمیان بلین

چڑیاں اور خواب ہیں

اور بہت ساری ملاقات کی جگہیں

رائفل نے نشانہ لیا

لیکن اُس سے پہلے رائفل میری آنکھوں کو

تمہاری آنکھوں سے ہٹاتی

ایک یا دو لمحوں کی چھکی

یا شہد رنگے بادل

اُن شہد رنگی آنکھوں کی

طرف بڑھ جاتے ہیں

اُس کی شاعری کے کوئی تیس 30 والیوم چھپ چکے ہیں۔ نثر کی تقریباً آٹھ

کتابیں۔ پہلا مجموعہ "زیتون کی پتیاں" اور آخری "گیارہ سیارے" ہیں۔ نو مجموعوں پر مشتمل کلیات بھی بہت بار چھپی اور لوگوں سے خراج حاصل کر چکی ہے۔ اُس کے انٹرویوز اُس کے اہم مضامین بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

ایک جگہ درویش اپنے خیالات کا اظہار اس پیرائے میں کرتا ہے۔ میں گلوکار میکیش تھیوڈورا کس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ وہ مجھ جیسا ہی ہے۔ ایک دن میں نے پڑھا کہ اُسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں نے اُس کی گرفتاری سے متاثر ہو کر Love me Rita لکھی۔ نظم کے تعارف میں میں نے لکھا تھا کہ میکیش کی گرفتاری دراصل انتہا پسندی کی طرف اسرائیل کا بڑھتا ہوا رجحان ہے جو صحت مند نہیں۔

اگلے چند دنوں میں میں بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ اُس کی روزمرہ کی ڈائری میں جو اُس کے درج کردہ واقعات ہیں۔ وہ بھی کسی چھوٹے موٹے افسانے سے کم نہیں۔ یہ اُس کے وہ دکھ ہیں جو ہیجان برپا کرتے ہیں۔

اُس کی شاعری میں، اُس کی نثری تحریروں میں فلسطین ایک استعارہ ہے۔ اس کی محبوبہ، اس کی جنت کا جو چھن گئی۔ جلاوطنی اور گھری کی کاغذ اور اندر کے دکھ کا اظہار۔ وہ جب جلاوطنی بارے لکھتا ہے تو کوپا پوری دنیا کا نمائندہ بن جاتا ہے۔

اُس کی شہرہ آفاق طویل نظم "عاشق من الفلسطین" ہے۔ "نظم کی جو محبوبہ ہے وہ دراصل سرزمین فلسطین ہے۔ شاعر نے کیسے اپنا دل چیر کر اپنا درد اس میں سمو دیا ہے۔

ہمارا ملک وہ ملک ہے جس کے ہم ملک بنتے ہیں

اس کے پرندے، اس کے پھل پھول

اس کی سب جان دار اور بے جان چیزیں

ہمارا ملک ہماری جائے پیدائش

ہمارے آباؤ اجداد کی
 ہماری آنے والی نسلوں کی
 ہمارا ملک تو وہ ہے
 جہاں ہمارے لوگ
 آگ اور رکھ سے
 اس کے گرد نفشی باڑھنا تے ہیں
 اس انداز سے
 کہ ایک جنت
 اور ایک جہنم
 اُسے فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر کہا گیا۔
 ایک اور جگہ دیکھیے۔

میں نے تمہارا چہرہ پانیوں میں دیکھا
 چاند کی طرح خاموش اور ساکن
 کھیتوں میں تمہیں پایا
 لہلہاؤں میں ڈوبے ہوئے

اسرائیلیوں کیلئے محمود کا نام فلسطینی قوم پرستی کا دوسرا نام ہے۔ حالانکہ اس کی
 شاعری تعصب سے بہت بلند ہے۔ مگر اس کے لفظ ہی اس کا ہتھیار بن گئے تھے۔ وہ کہتا
 ہے۔

”ہمیں لفظ لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر سوچ اور نظریے سے اوپر اٹھنا ہے۔ سیاسی
 پارٹیاں ہوں یا اسلامی جہادی تنظیمیں۔ اتحاد کے لئے لفظ لکھنے ہیں۔ دنیا کو بتانے کے لئے،

ان کا سویا ہوا ضمیر جگانے کے لئے، ذہنوں کو متاثر کرنے کے لئے۔ مدلل تحریر ذہن میں کھلبلی مچا دیتی ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو قلم کی تلوار اٹھانی ہے۔ سادہ مگر گرفتار کرنے والے لفظ جو یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی ثقافتی بنیادوں کے ڈھانچوں پر کھڑے ہوں۔“

دنیا نے عرب میں گزشتہ نصف صدی کی نسل میں محمود درویش ایک عظیم شاعر کے طور پر جانا اور مانا گیا ہے۔ عربی کے چوٹی کے سات آٹھ شعرا میں سے وہ ایک ہے جس نے اپنی زندگی میں بہت سارے ایواڈز کے ساتھ افریشیائی اہل قلم کا ادبی ایوارڈ "لوٹس" بھی حاصل کیا۔ اُس کی نظموں کے ترجمے دنیا کی ہر اہم زبان انگریزی، فرنچ، روسی، اطالوی، جرمن، بلغاریہ کم از کم بیس زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ جنہیں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

وہ المیتابی اور خلیل جبران سے بہت متاثر تھا۔ جدید شاعروں میں نظار قبانی، گارشیا لورکا، پابلو نرودا، Yeats اور ڈیرک والکوٹ کا عاشق تھا۔

اسرائیل کے وزیر تعلیم نے محمود درویش کی پانچ نظمیں اسرائیلی سکولوں میں اختیاری مطالعے کے طور پر چاہا کہ شامل کی جائیں۔ یوی سارد کا کہنا تھا کہ ایک دوسرے سے لاتعلقی اچھے پڑوسیوں کے زمرے میں نہیں آتی۔ مگر حکومتی ارکان نے سخت مخالفت کی۔

اس خوبصورت شاعر کا کلام اس کے اندر کے کرب کا غماز ہے۔ اس نے اپنے کام سے عشق کیا۔ اسے عبادت جانا۔ اُس کی شاعری اُسکی تاریخی، اجتماعی اور ذاتی ماضی کے اٹاٹے پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُس کے مادر وطن کے عکس نظر آتے ہیں۔ ”قید اور محاصرے میں“

ذرا دیکھیں۔

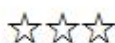
زمین ہمارے اوپر تنگ ہو رہی ہے

ہم کہاں جائیں گے
اس آخری سرحد کے بعد
پہنچے کہاں اڑیں گے
اس آخری آسمان کے بعد

1988ء میں اس کی ایک نظم Passing between the

passing words نے بڑا طوفان اٹھایا۔ یہ اسرائیلی کنیسٹ Kneset میں بھی زیر
بحث آئی۔

ہماری زمین کو چھوڑ دو
ہمارا ساحل، ہمارا سمندر
ہماری گندم اور ہمارا نمک
اور
ہمارے زخم



سلمیٰ اعوان

0301-4038180

www.salmaawan.com